مولانا محمد ثاقب قریشیؒ

شخصیت و فن

مرتبہ

حسین انجم

(مدیر طلوعِ افکار)

مولانا محمد باقر شمس .... شخصیت و فن

مرتب

حسین انجم

(مدیر طلوع افکار)

کتاب کا نام : مولانا محمد باقر شمس ... شخصیت و فن

تالیف : حسین انجم

کمپوزنگ : جاوداں لیزر کمپوزرس

۲۸ - ایچ ، رضویہ سوسائٹی ، کراچی

فون : ۴۳۳۲۵۶۰۴۳۵۴۴

ناشر : طلوعِ افکار ، رضویہ سوسائٹی ، کراچی - ۷۴۶۰۰

طابع : احمد برادرز پرنٹرز ، ناظم آباد ، کراچی

قیمت : دو سو روپے

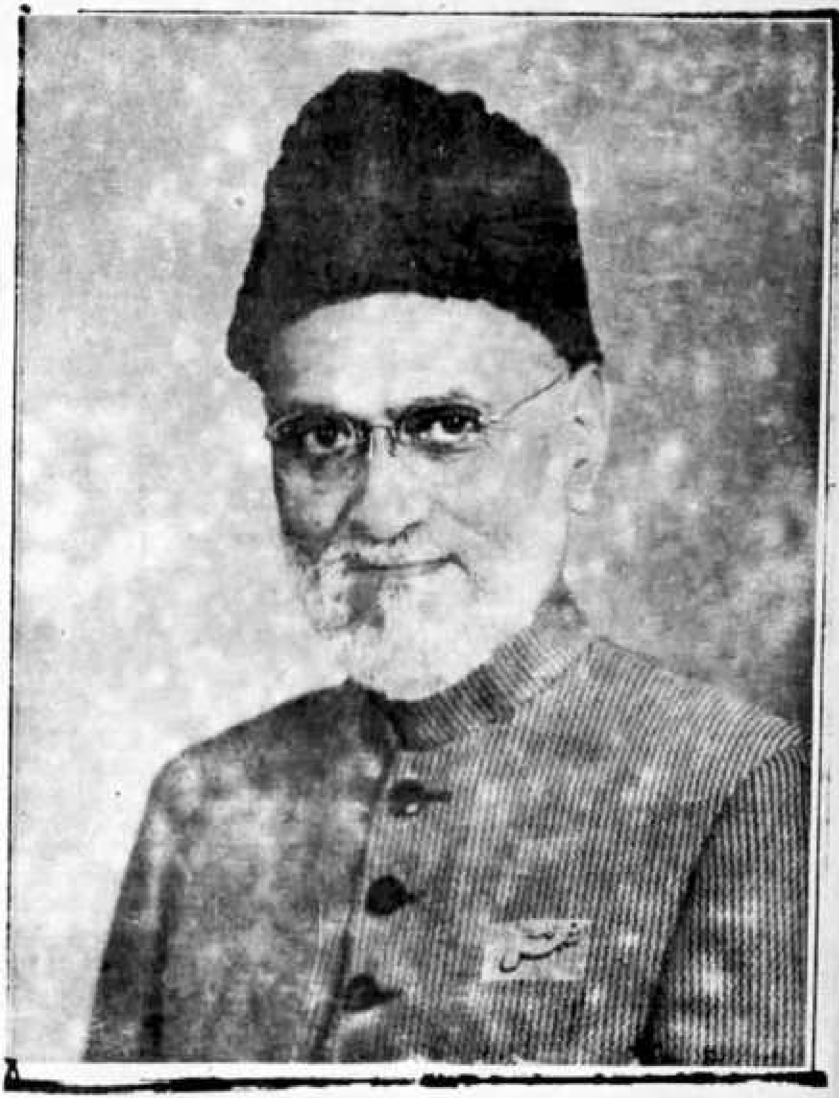
ملنے کے پتے

اوارۂ طلوعِ افکار ، کراچی

۲۸ - ایچ ، رضویہ سوسائٹی ، کراچی - ۷۴۶۰۰

دارالتصنیف

۳۰ - ایچ ، رضویہ سوسائٹی ، کراچی - ۷۴۶۰۰



تصویر کہہ رہی ہے زبانِ خموش سے　　وہ رخ ہے زرد تھا جو کبھی آب و تاب پر
نزدیک ہمکناری حوران خلد ہے　　اب آ گئی ہے شمس کی پیری شباب پر
(شمس)

فہرستِ مضامین

نگارشاتِ شمس

افکارِ شمس

حدیثِ دیگراں

سرِ دلبراں

سخن ہائے سخن سنجاں





دیباچہ

مولانا محمد باقر شمس کی خدمت میں علمی اور ادبی معاملات پر گفتگو اور استفادہ کی غرض سے باریابی کا شرف اکثر حاصل ہوتا رہا، جس کو قربِ مکانی نے اور آسان بنا دیا۔

ان کی نظر کی گہرائی، فکر کی بلندی، ذہن کی رسائی، سخن فہمی اور نکتہ سنجی کی اعلا صلاحیت، ذوقِ سلیم کی فراوانی اور قوتِ استدلال، یعنی حافظہ سے فوراً مثالیں پیش کر کے اپنے دلائل کے خلاف کچھ کہے جانے کا سدباب کر دینا، نیز ایسے بلند اوصاف و کمال کے ساتھ ساتھ ان کی سیرت و کردار کی بلندی اور ان سے شرفِ تلمذ کی نسبت، ان سب نے مل جل کر مجھ کو مجبور کر دیا کہ میں دنیا کو ان کے فن اور شخصیت سے متعارف کرواؤں۔ میں نے اس کام کو اپنا فرض سمجھا اور اب اس کتاب کے ذریعہ اس فرض کی ادائگی میرے لیے ایسی بے پایاں مسرت کا باعث ہے، جیسے میں نے زندگی کا کوئی مقصد حاصل کر لیا ہو:

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

مجھ کو یقین ہے کہ اہل علم، اہل قلم اور اہل نظر حضرات کے علاوہ شعر و ادب اور تہذیب و تمدن کے مطالعہ کا ذوق رکھنے والے طالبانِ علم کے لیے بھی حضرتِ شمس مدظلہ کے فن اور شخصیت کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔

حسین انجم

مقدمہ

حضرتِ شمس کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کے لیے خود ان کی تحریروں اور ان کے متعلق دوسروں کی تحریروں کا مطالعہ ناگزیر ہے، مگر یہ سب اس طرح پھیلی ہوئی ہیں کہ ان کا یکجا کرنا ہر شخص کے لیے آسان نہیں، اس لیے میں نے ان کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کے لیے پہلے ان کے حالاتِ زندگی لکھے اور پھر ان کے فن پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اس کے بعد خود ان کے نو مضامین منتخب کر کے اس کتاب میں شامل کیے ہیں۔ ان مضامین کا مختصر سا جائزہ حسبِ ذیل ہے:۔

(۱) پہلا مضمون وجودِ باری اور فطرتِ انسانی کے موضوع پر ہے۔ اس موضوع پر حکمائے عالم جو کچھ کہہ چکے ہیں، اس پر اضافہ ممکن نہیں لیکن مولانا نے جدید سائنسی اصولوں سے جس طرح وجودِ باری کو ثابت کر کے ناقابلِ انکار بنادیا ہے، وہ ان کی ندرتِ فکر، علم کلام پر ان کی نظر کی گہرائی اور وسعت اور زورِ بیان کی ایک واضح اور خوبصورت مثال ہے۔

(۲) دوسرا مضمون "ظہورِ قدسی" ہے۔ یہ مضمون تاریخی واقعات، حضورِ سرورِ کائنات کی سیرت و کردار اور شمس صاحب کے خوبصورت طرزِ تحریر اور انشائیے کا حسین امتزاج ہے، جس نے حقیقت میں افسانہ کی سی دلچسپی پیدا کردی ہے۔

(۳) تیسرا مضمون "فلسفۂ لسان" ہے۔ آدمی نے بولنا کس طرح سیکھا اور زبان کس طرح وجود میں آئی، یہ اس مضمون کا موضوع بحث ہے۔ یہ ذہنی پیداوار کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر احسن فاروقی ایسے شخص نے لکھا ہے:

> "یہ مضمون اول سے آخر تک نئی باتوں کا حامل ہے اور لسانیات میں ایک نئے علم کا اضافہ کرتا ہے۔ میں حیران ہوں کہ کن الفاظ میں اس کی تعریف کروں۔"

(۴) چوتھا مضمون فلسفۂ غنا اور اس کی شرعی حیثیت کے متعلق ہے۔ اس

موضوع پر علما نے رسالے لکھے ہیں۔ کسی نے اس کے جواز کو اور کسی نے عدم جواز کو ثابت کیا ہے۔ لیکن مولانا شمس نے اس میں بھی نیا پہلو نکالا ہے اور لکھا ہے۔

"یہ فلسفیوں کی ایجاد ہے۔ اس سے ان کی غرض اخلاق فاصلہ کا پیدا کرنا ہے اور واقعات نے ثابت کیا ہے کہ غنا سے لوگوں پر معرفت کے دروازے کھل گئے اور معرفت کی معراج حاصل ہو گئی ہے۔ اس وجہ سے غنا عبادت ہے۔"

(۵) پانچواں مضمون وہ ہے، جس میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے "مقدمہ باغ و بہار" پر تنقید کی گئی ہے۔ اس میں مولانا نے ثابت کیا ہے کہ بابائے اردو نے الفاظ، روز مرہ محاورے اور ضرب الامثال غلط معانی میں لکھے ہیں۔ مضمون کو پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ ناگزیر ہے کہ بابائے اردو لکھنا تو جانتے تھے، مگر زبان سے واقف نہ تھے۔

(۶) چھٹا مضمون ماہرالقادری کے مجموعۂ نعت "ذکر جمیل" سے متعلق ہے۔ اس میں حضرت شمس نے پہلے نعت کا معیار معین کیا ہے اور پھر اس پر ان کی نعت گوئی کو پرکھ کر ثابت کیا ہے کہ وہ اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔ اس کے بعد ان کے کلام کی عروضی اور لسانی غلطیاں بتا کے جو اصلاح کی ہے، وہ فن پر ان کی مضبوط گرفت کی دلیل ہے۔

(۷) ساتواں مضمون "لکھنؤ کا تمدن" ہے۔ اس میں انھوں نے تمدن کی تعریف اور پھر ایرانی تمدن کا تفوق اور اس سے لکھنؤ کے تمدن کا پیدا ہونا ثابت کیا ہے۔

(۸) آٹھواں مضمون "لکھنؤ کی صبح و شام" ہے۔ یہ مضمون واقعات، منظر کشی اور انشائیے کا شاہکار ہے۔

(۹) نویں مضمون کا موضوع "لکھنؤ کی مادری زبان اور بیگماتی زبان" ہے۔ یہ موضوع اردو میں پہلے پہل داخل ہوا اور اب اس کے بعد بھی کوئی لکھنؤ کی بیگماتی زبان کے موضوع پر قلم نہیں اٹھا سکے گا۔

مولانا کے ان مضامین کے بعد اس کتاب میں ان کے اشعار ہیں اور ان کے بعد نظم و نثر میں علما، فضلا اور ادبا کے آرا ہیں، جو ان کے متعلق ان لوگوں نے ظاہر کیے ہیں۔ آخر میں ان کی بعض کتابوں پر مشاہیر کے تبصرے ہیں۔ ان سب کے مطالعہ سے مولانا کی شخصیت اور فن کو سمجھنا میں نے ہر شخص کے لیے آسان بنا دیا ہے۔

حسین انجم

تعارف

شخصیت

خاندان: لکھنؤ کا ایک علمی گھرانہ خاندان اجتہاد کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے مورثِ اعلا حضرتِ غفرانمآب تھے۔ جناب عزیز لکھنوی نے ان کا اور ان کے خاندان کا تعارف دو شعروں میں اس طرح کیا ہے

غفرانمآب ، حجتِ حق ، آیۂ الٰہ
مہرِ شرف ، مجددِ اسلام ، دیں پناہ
تاباں ہیں ان کی نسل میں ایسے نجوم بھی
کرتے ہیں اکتسابِ ضیا جن سے مہر و ماہ

اسی خاندان کے فرزندِ رشید مولانا محمد باقر شمس ہیں، جن کے تعارف میں جناب شاداں دہلوی نے یہ دو شعر کہے ہیں کافی ہیں:

یہ ہیں فخرِ خاندانِ حضرتِ غفرانمآب
علم دیں ہے مستقل توقیرِ باقر شمس کی
ناز کر سکتا ہے جس پر خاندانِ اجتہاد
وہ ہے ، شاداں ! جرأتِ تحریرِ باقر شمس کی

نسب: اسی خاندان کی عظیم المرتبت شخصیت اعلم العلما مولانا سبط حسین صاحب مجتہد تھے، جنھوں نے لکھنؤ میں تحصیلِ علم کر کے عراق کا سفر کیا۔ وہاں درسِ خارج کے دو دورے تمام کر کے خود درسِ خارج دینا شروع کیا۔ اس کی شہرت ہندوستان تک پہنچی، کیونکہ یہ ایسی منزلت تھی، جو ہندوستان کے کسی عالم کو نصیب نہیں ہوئی۔ جو عالم یہاں سے گیا، وہ طلبا کی صف میں بیٹھ کے چلا آیا۔

ان کی شادی مولانا ابوالحسن عرف بچھن صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔

مولانا ابوالحسن صاحب کو واجد علی شاہ نے ملاذ العلما اور ملکہ وکٹوریہ نے شمس العلما کا خطاب دیا، عدالت دیوانی کی حاضری سے مستثنیٰ کیا اور دربار میں بائیسویں نمبر کی کرسی دی۔ وہ اپنے وقت کے منطق میں ارسطو سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے ہندوستان میں معقولات کا درس خارج دینا شروع کیا، جو پہلی اور آخری خصوصیت تھی۔ منطق میں ان کی کتاب "تنقید النقود فی حل مغالطۂ عامۃ الورود" معرکہ آرا کتاب ہے۔ ان کے بعد ہندوستان کی خاک سے منطق میں کوئی صاحب تصنیف پیدا نہیں ہوا۔ ان کا تقدس اور سخاوت بھی مشہور تھی۔ ان کے بعد کے دور کے تمام علما و اطبا ان کے شاگرد تھے۔ سارا ہندوستان ان کا مقلد تھا۔ اپنے دور میں مرجع تقلید تھے۔ ۱۳۰۹ھ میں چالیس برس کے سن میں ان کا انتقال ہو گیا۔ سارے ہندوستان نے ان کا سوگ منایا۔ مولانا شمس اسی قران السعدین کی یادگار ہیں۔

ولادت: مولانا کی ولادت ۱۰ اگست ۱۹۰۹ء، مطابق ۲۳ رجب ۱۳۲۷ھ منگل کے دن اول نماز صبح کے وقت جونپور میں ہوئی، جب اذان کی آواز سے فضا گونج رہی تھی میر مصطفیٰ حسین صاحب جونپوری نے قطعۂ تاریخ کہا:

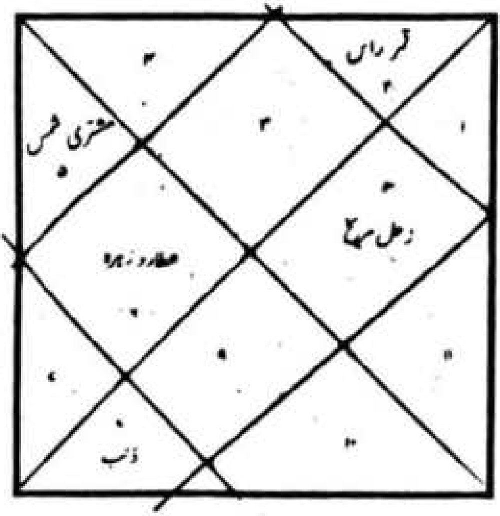
مولود نو مبارک آقائے دیں پناہ!
اجداد کی طرح سے ہو، یارب! یہ انتخاب
تاریخ مصطفیٰ نے کہی از سر ادب
نکلا فلک پہ علم کے اک تازہ آفتاب

بہ تعمیۂ الف = ۱۳۲۷ھ

مولانا کے ایک دوست نے ان کا حسب ذیل زائچہ بنایا ہے:

مولانا سید محمد باقر شمس

اپنے زائچہ کی روشنی میں



جوگ

موصوف کے زائچہ میں شمس اور عطارد اوج کے ہیں اور قمر برج شرف میں ہے۔ اس جوگ کے حامل صاحب زائچہ کو مشہور زمانہ ہونا چاہیے، لیکن اتفاق سے قمر کا برج شرف زائچہ کے بارھویں خانہ میں پڑا ہے، جو نحس ہے۔ اس بنا پر مولانا کو وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی، جو ہونا چاہیے تھی۔ زائچہ کا پانچواں خانہ جو علم سے متعلق ہے، اس کا مالک زہرہ ہے اور زہرہ وبال میں ہے۔ اس کمزوری کے سبب موصوف اپنے والد کی طرح مجتہد نہیں بن سکے اور تعلیمی سلسلہ ایک حد تک جا کر رک گیا اور مزید آگے نہیں بڑھ سکا۔ زہرہ کا تعلق حسن و عشق سے ہے، لہذا مولانا کو شعر و ادب سے بہت لگاؤ ہے۔ طالع کا مالک عطارد اوج میں ہے، کیندر میں پڑا ہے۔ اس بنا پر موصوف کی عمر بانوے سال ہوتی ہے۔

تعلیم: ابتدائی کتابیں مولوی علی سعید صاحب سے پڑھیں۔ ان کے بعد اپنے والد سے تحصیل علم کی۔ طب بھی انھی سے پڑھی۔ منبع الطب کالج لکھنؤ سے طب کا اور لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیر کامل کا امتحان پاس کیا۔ شیخ ممتاز حسین (مدیر اودھ پنچ) سے عبرانی پڑھنا شروع کی تھی کہ راجا ہرپال سنگھ ہائی اسکول سنگرامئو ضلع جونپور میں اردو، فارسی کے معلم کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ وہاں انگریزی اور ہندی پڑھی۔ وہ عربی، فارسی اور ہندی پر کامل عبور رکھتے ہیں۔ اردو ان کی مادری زبان ہے۔ انگریزی بہت کم جانتے ہیں اور عبرانی نہ جاننے کے برابر ہے۔

سیرت و کردار

حقیقت میں انسان کی سیرت و کردار اس کی فطری جبلی عادتوں کا نام ہے۔ مولانا بھی فطرت کے اس قانون سے مستثنیٰ نہیں۔ ان کے مزاج میں سختی بہت ہے۔ یوں تو وہ ہر آنے والے سے بڑی سادگی اور بے تکلفی سے گھل مل کر باتیں کرتے ہیں مگر بلند آواز اور پر زور الفاظ میں۔ یہ گرمجوشی ان کی سختیِ مزاج کا نتیجہ ہے اور تحریر میں بھی ان کا یہی انداز ہے، جس کو لوگ لہجہ کی تلخی سے تعبیر کرتے ہیں۔

راستبازی: وہ کبھی خلافِ حقیقت بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس کا ایک واقعہ بھی ہے۔ ان کا ایک مضمون میر انیس کے متعلق "طلوعِ افکار" میں شائع ہوا عبدالرؤف عروج نے وہ مضمون "حریت" میں شائع کر دیا۔ میں نے نوٹ لکھا کہ "طلوعِ افکار" کا مضمون بغیر اس کے حوالہ کے "حریت" میں شائع ہوا ہے، جو ادارتی دیانت کے خلاف ہے۔ ایڈیٹر نے عروج صاحب سے باز پرس کی۔ وہ مولانا کے پاس آئے اور ان سے کہا،

"یہ لکھ دیجیے کہ میں نے یہ مضمون عروج کو لکھ کر دیا تھا۔" مولانا نے کہا،
"یہ بات واقعہ کے خلاف ہے۔ میں یہ نہیں لکھ سکتا۔" اس پر وہ ناراض ہو گئے اور صاحب سلامت اور آمد و رفت ختم کر دی۔

حق پسندی: مولانا میں اس شدت سے حق پسندی پائی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے سامنے غلط بات کہتا ہے تو وہ فوراً اس کی رد کر دیتے ہیں۔ اس میں وہ چھوٹے اور بڑے کا بھی امتیاز نہیں کرتے۔ ان کے بزرگوں نے انھیں تنبیہ بھی کی کہ برابر والوں سے ایسا برتاؤ تو ایک حد تک درست ہو سکتا ہے، لیکن بزرگوں کی بات کو اس طرح رد کر دینا، بدتہذیبی و گستاخی ہے۔ ان کی غلط بات کو سن کر صاحبان خرد خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کو عقلانے "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" کہا ہے، مگر مولانا اپنی فطرت سے مجبور ہیں اور وہ بزرگوں کی نصیحت پر عمل نہیں کر سکے

جذبۂ انتقام: ان میں جذبۂ انتقام بھی بہت ہے۔ عفو و در گذر ان کے مزاج میں نہیں ہے۔

تعقل: وہ ہر بات عقل کی ترازو میں تولتے ہیں اور خلافِ عقل بات کسی طرح کی بھی ہو، ہرگز قبول نہیں کرتے۔

انسانی ہمدردی: ان کے دل میں انسانی ہمدردی بھی کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی غرض ان سے بیان کرتا ہے تو وہ اسے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انھیں معلوم ہوا کہ فلاں شخص کو یہ تکلیف ہے اور وہ اسے دور کر سکتے ہیں تو وہ بغیر اس کی خواہش کے، اس کی مدد کرتے ہیں۔

حسن پرستی: وہ حسن پرست بھی بلا کے واقع ہوئے ہیں۔ ہر حسین چیز ان کے دل پر بے انتہا اثر کرتی ہے، اسی وجہ سے وہ ادب و شعر کے دلدادہ ہیں اور خاص طور پر وہ اشعار جن میں تغزل ہوتا ہے، ان کے دل پر بہت اثر کرتے ہیں، مگر عورت کے معاملہ میں وہ عیاش نہیں ہیں۔ تعددِ ازدواج تک کو ناپسند کرتے ہیں۔

اپنی ذات سے بے اعتنائی: انھوں نے کبھی اپنے کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی۔

زمانہ کی ناقدری کی شکایت: انھوں نے کبھی زمانہ کی ناقدری کی شکایت نہیں کی۔ ان کا کہنا ہے کہ زمانہ بڑا قدرداں ہے۔ جو لوگ زمانہ کی ناقدری کی شکایت کرتے ہیں، وہ خود غلط ہیں۔ ہر شخص کی قدر اس کے حالات سے متعلق ہوتی ہے۔

وعدہ کی پابندی: مولانا وعدہ کے بھی سختی سے پابند ہیں۔ جب وعدہ کسی سے کر لیتے ہیں تو چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے، اسے ایفا کر کے رہتے ہیں۔

داد و دہش: وہ اپنی آمدنی کا زیادہ حصہ داد و دہش میں صرف کر دیتے ہیں۔

حقیقت پسندی: یہ بھی ان میں بہت سختی سے پائی جاتی ہے۔ ابتدائی عمر میں

انھوں نے شعر کہنا شروع کیا اور زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے اشعار میں نہ تخیل کی بلندی ہے، نہ طرزِ ادا میں کوئی جدت و ندرت۔ پامال مضامین سیدھے سادے طریقہ سے نظم کرتے ہیں،

"یہ ہیجان شاعری ہے۔ خدا نے مجھے شاعر نہیں پیدا کیا ہے۔ شعر کہنا وقت ضائع کرنا ہے۔" اور انھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا۔ اس بارے میں بعض اساتذہ سے دلچسپ گفتگو بھی ہوئی:۔

مرزا جعفر علی خاں اثر نے ان سے ایک دن کہا،

"آپ اپنے دل میں کہتے ہوں گے کہ جب بھی میں آتا ہوں تو یہ اپنے اشعار سناتے ہیں۔ آج میں آپ کے اشعار سنوں گا۔" کہا،

"میں نے شعر کہنا چھوڑ دیا ہے۔" پوچھا،

"کیوں؟" ان سے وہی وجہ بیان کی۔ انھوں نے کہا،

"شاعری کی ساری چہل پہل چھٹ بھیئوں کے دم سے ہے۔ اساتذہ کہے ہیں اور مشاعروں میں کہاں جاتے ہیں۔ کوئی بڑا مشاعرہ ہوا اور صدارت کے لیے کسی سے کہا گیا تو وہ چلا گیا۔ چھٹ بھیئوں ہی سے مشاعروں میں رونق ہے۔ اگر سب یہی سمجھ لیں تو دنیائے شاعری میں سناٹا چھا جائے۔" کہا،

"جب میں میر و سودا کے برابر کرسی بچھا کر نہیں بیٹھ سکتا تو چھٹ بھیئوں کے ساتھ چٹائی پر بیٹھنا مجھے منظور نہیں ہے۔"

محشر صاحب سے بھی اسی طرح کی گفتگو ہوئی۔ انھوں نے فرمایا،

"دل کے بہلانے کو یہ شغل بہت اچھا ہے۔" کہا،

"زمیں اور بھی آسماں اور بھی ہیں۔"

عزیز صاحب نے پوچھا،

"آپ کس سے اصلاح لیتے ہیں؟" کہا،

"میں نے تو شعر کہنا ہی چھوڑ دیا ہے۔" پوچھا،

"کیوں؟" ان سے بھی وہی وجہ بیان کی۔ انھوں نے کہا،

"شاعر کسی درجہ کا بھی ہو، اپنے معمولی شعر کو بھی اچھا سمجھتا ہے۔ اس سے طبیعت میں انبساط اور دل میں گداز پیدا ہوتا ہے۔ اس سے اس کے اخلاق پر اثر پڑتا ہے۔ شعر اپنے لیے کہنا چاہیے۔ اسی کو میں نے ایک شعر میں یوں نظم کیا ہے:

نہ ان کے لیے، نہ ان کے لیے
کہ میں شعر کہتا ہوں اپنے لیے"

کہا،

"میں دوسروں کے بہترین شعر پڑھ کر اپنے میں وہی کیفیتیں پیدا کر لیتا ہوں۔"

فرمایا،

"نہیں! موزونیت طبع ایک خداداد نعمت ہے۔ اس سے طبیعت میں روانی اور نرمی پیدا ہوتی ہے۔ اسے کام میں نہ لانا، کفران نعمت ہے۔" مگر مولانا اپنے فیصلہ پر قائم رہے اور اب وہ گھر میں کسی تقریب کے موقع پر کوئی نظم یا قطعۂ تاریخ کہہ دیتے ہیں، حالانکہ ان کی ابتدائی عمر کے کلام میں بہت بلند پایہ اشعار بھی ہیں۔ مثلاً:

نظر لگنے کا ان کے واسطے گنڈا بنانے کو
بچا رکھے ہیں میں نے تار کچھ اپنے گریباں میں

اچھوتی تخیل ہے اور موثر الفاظ میں ادا ہوئی ہے۔

آئے عدم سے گلشن ہستی کی سیر کو
دامن الجھ گیا ہے یہاں خارزار میں

اس طرح کے بہت اشعار میں نے ان کے انتخاب کلام میں لکھ دیے ہیں۔ اگر مولانا مشق سخن جاری رکھتے تو ایسے بہت سے اشعار ان کے دیوان میں ہوتے۔ حال میں انھوں نے منقبت کہی ہے۔ وہ کسی بڑے سے بڑے شاعر سے کم درجہ کی نہیں ہے اس لیے مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ مولانا کا شعر گوئی کو ترک کرنے کا فیصلہ صحیح

نہیں ہے۔

فن

جناب محترم مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ باعتبارِ عمر اگلے وقتوں کے ہیں، مگر باعتبارِ فکر و نظر دورِ جدید کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر ہیں اور اس کی ہر اچھی بات کو سراہتے ہیں، اگرچہ خامیوں کی سختی سے گرفت کرتے ہیں۔ یہی ایک باشعور اہلِ علم اور نقاد کا فرض ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت ہے۔ وہ ایک عالمِ دین بھی ہیں اور ایک ایسے وسیع النظر اور روشن خیال مفکر بھی، جو مثلاً نہ صرف موسیقی جیسی بادی النظر میں غیر شرعی چیز کے مختلف پہلوؤں سے باخبر ہیں بلکہ اس کو بشرط و شروط غذائے روح بھی سمجھتے ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی، اہلِ زبان بھی ہیں اور ماہرِ لسانیات بھی، مورخ بھی ہیں اور محقق بھی، معلم بھی ہیں اور نقاد بھی۔ ان کی شخصیت کا ہر پہلو ان کی تصانیف سے نمایاں ہے۔ ہر چند کہ انھوں نے شاعری کو مستقل مشغلہ کے طور پر نہیں اپنایا، مگر انھوں نے جو کچھ کہا ہے، وہ فن کے اعتبار سے بہت مضبوط کلام ہے۔ ان کے بعض اشعار ان کی کتاب "نگارشاتِ رنگ رنگ" کے مقدمہ میں شامل ہیں۔ بطور ادیب ان کی تحریریں انشا پردازی کا اعلا نمونہ پیش کرتی ہیں، جن میں سلاست بھی ہے اور سادگی بھی، لطفِ زبان بھی ہے اور حسنِ بیان بھی۔ ان کی تحریر حشو و زوائد سے پاک ہوتی ہے۔ ہر جملہ موضوع سے متعلق اور ہر بات اپنی جگہ اٹل۔ ایک بہت اہم بات یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں، اس میں کوئی نئی بات ضرور ہوتی ہے۔ کسی موضوع پر دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کو دہرا کر اپنی تصانیف میں اضافہ کرنا، ان کے مشرب میں حرام ہے۔ وہ تاریخ لکھتے ہیں تو تحقیق و جستجو سے نئے گوشے ابھارتے ہیں اور نئے پہلو سامنے لاتے ہیں۔ مذہب کے حوالہ سے ان کی کتاب "اسلام پر کیا گزری" اور ادبی اعتبار سے "تاریخ لکھنؤ" ان کی تاریخ نویسی کے اس پہلو کی بڑی روشن مثالیں ہیں۔

اسی طرح جب انھوں نے لسانیات پر قلم اٹھایا تو تمام مروجہ نظریات کے برخلاف ایک جدید اور قابلِ فہم نظریہ پیش کرتے ہوئے ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی، جن سے لسانیات کے علم میں اضافہ اور ترقی ہوئی ۔ یہ رائے اپنے وقت کے ایک بہت اہم صاحبِ علم اور نقاد ڈاکٹر احسن فاروقی نے لسانیات پر ان کا مضمون دیکھنے کے بعد قائم کی تھی ۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے، اس وقت اس پر ان سے بڑی سند اور کوئی نہیں، خصوصیت کے ساتھ "لکھنؤ کی زبان" کے حوالہ سے وہ عہدِ موجود کی مستند ترین ہستی ہیں ۔ "لکھنؤ کی زبان" کے نام سے انھوں نے ایک نہایت وقیع کتاب لکھی، جو نہ صرف زباندانی دانی پر سند ہے بلکہ اس موضوع پر علامہ آرزو لکھنوی کی کتاب "نظامِ اردو" کے دوش بدوش وہ سب سے اہم تصنیف ہے ۔ تحقیق کے میدان میں بھی انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ۔ تاریخ کی تحقیق کے میدان میں بھی انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ۔ تاریخ کی تحقیق کے سلسلہ میں "تاریخِ لکھنؤ" اور "اسلام پر کیا گزری" کا ذکر آچکا ہے ۔ اسی ذیل میں اسلامی تاریخ کے حوالہ سے امام ابو حنیفہؒ کے مسلک پر ان کی تحقیق، لکھنؤ کی شاعری، لکھنؤ کی تہذیب وغیرہ کے موضوعات پر ان کی تصانیف ان کی تحقیق و تدقیق اور تلاش و جستجو کی آئینہ دار ہیں ۔

حضرتِ شمس کی شخصیت کا ایک بہت اہم پہلو تنقید ہے ۔ وہ شعر و ادب کے ایسے نقاد ہیں، جو فکری اور فنی، دونوں، پہلوؤں سے شعری اور ادبی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہیں اور نہ صرف ان کے محاسن و معائب پر بحث کرتے ہیں، بلکہ ان کی اصلاح کر کے معائب کو محاسن سے بدل دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ۔ وہ زبان و بیان، عروض و قوافی، تشبیہ و استعارہ، مصطلحات و مفروضاتِ شعرا، صنائع و بدائع، قیاسات و سماعیات، محاورہ، ضرب المثل اور روز مرہ، نیز فصاحت و بلاغت کے معیار، معانی و بیان وغیرہ پر اتنی وسیع اور گہری نظر رکھتے ہیں، جو کم از کم اس دور میں بڑے سے بڑے استاد کو نصیب نہیں ۔ شعر فہمی کا ملکہ اور اس کے لفظی و معنوی حسن

وقوع کی طرف ذہن کا فوراً ملتفت ہونا بھی ایک خاص صلاحیت ہے ، جو خلاق فہم و ذکا نے ان کو فیاضی سے ودیعت فرمائی ہے ۔ اپنی انھیں صلاحیتوں کے تقاضوں کی بنا پر انھوں نے مشہور شعرا کے کلام کو تنقید کی نظر میں تولا ، فکر و فن کی کسوٹی پر پرکھا اور جہاں جہاں فکری و فنی خامیاں نظر آئیں ، وہاں اصلاح دے کر شعر کو درست ، بلکہ بلند ، کر دیا ۔ اس باب میں وہ کسی شاعر کی عظمت اور مرتبہ سے مرعوب نہیں ہوتے ، اس لیے کہ خواہ کتنا ہی بڑا شاعر کیوں نہ ہو ، اس کا کلام کلام الہٰی نہیں ، جو ہر عیب سے پاک ہو ۔ پھر یہ کہ جو جتنا بڑا شاعر ہو ، اس پر گرفت بھی اتنی سخت ہونا چاہیے ۔ کسی جتدی یا نوسیکھیے پر کیا تنقید کرنا ۔ چنانچہ انھوں نے سودا اور انیس و دبیر جیسے عظیم شعرا پر بھی تنقید کی اور ان کے کلام پر اصلاح دی ہے ۔ ان کی کتاب "شعور و شاعری" کا یہی موضوع ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اہل علم اور اہل قلم نے اس بات کو پسند نہیں کیا ، مگر اس کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی ۔ بس یہ کہا کہ باتیں تو سب ہی ٹھیک لکھی ہیں ، مگر یہ لکھنا نہیں چاہیے تھیں ۔ غالباً وہ حضرات اس تنقید کو اتنے عظیم شاعروں کے مرتبہ کے خلاف سمجھتے ہوں گے ۔ بادی النظر میں یہ بات ٹھیک بھی معلوم ہوتی ہے ، مگر حقیقتاً درست نہیں ہے ۔ اول تو یہ کہ شمس صاحب وہ نقاد ہیں ، جنھوں نے خود اپنے کلام پر بھی تنقید کی اور اس کو ہر طرح سے جانچنے اور پرکھنے کے بعد خود اپنے خلاف یہ فیصلہ دیا کہ فرسودہ مضامین کو سیدھے سادے طریقہ سے نظم کرتے ہیں ، جن میں کوئی تازگی نہیں ، کوئی انفرادیت نہیں اور یہ شاعری ادب میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتی ، لہٰذا اپنے کو شاعر سمجھنا خود کو دھوکا دینا ہے اور شعر کہنا وقت ضائع کرنا ہے ۔ ان کی خود اپنے کلام پر یہ تنقید خود احتسابی کی ایک منفرد مثال ہے ۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ جو نقاد خود اپنے کلام پر اتنی سختی اور اتنی سچائی سے تنقید کر سکتا ہے ، اس کو دوسروں کے کلام پر تنقید کا کرنے کا حق بھی حاصل ہے ۔ دوم یہ کہ نقاد کا کام ہی یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کے کلام کا جائزہ لے اور دیانتداری کے ساتھ ، جی ہاں دیانتداری کے ساتھ (جو اولین

شرط ہے)، اس کے کلام پر تنقید کرے ۔ چنانچہ کون ایسا بڑا شاعر گزرا ہے، جس کے کلام پر تنقید نہ کی گئی ہو ۔ خدائے سخن میر انیس کے کلام پر عبد الغفور نساخ کے اعتراضات اور دبیر جیسے عظیم شاعر کے کلام پر "موازنۂ انیس و دبیر" میں شبلی کی تنقید ۔۔۔ یہ سب تاریخِ ادب کا حصہ ہیں ۔ اساتذہ کے کلام کو تنقید کی کسوٹی پر کسنا اور اس پر اصلاح دینا، یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے ۔ عبد القادر بدایونی نے ہندوستان کی جو سیاسی تاریخ لکھی ہے، اس میں امیر خسرو کے ایک بیٹے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اساتذہ کے کلام پر اصلاح دیتا تھا اور بہت عمدہ اصلاح دیتا تھا ۔ اس کی اس خاص صلاحیت اور اس فن میں اس کی مہارت کی بہت تعریف کی جاتی تھی ۔ بعد کے زمانہ میں اس موضوع پر سب سے پہلے نیاز فتحپوری کی کتاب "مالہ و ما علیہ" کے نام سے آئی، جس میں انھوں نے بعض شعرا کے کلام پر تنقید اور اصلاح کی ہے ۔ دوسری کتاب حضرتِ شمس کی "شعور و شاعری" ہے ۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ دنیا کی ہر زبان کے تنقید نگاروں نے اپنے ادبا و شعرا کے کلام پر تنقید تو کی ہے، مگر یا تو اصلاح نہیں دی یا تنقید کو اصلاح کے ساتھ کتابی شکل میں شائع نہیں کیا ۔ یہ اردو ہی کا طرۂ امتیاز ہے اور اس کا سہرا حضرتِ نیاز فتحپوری اور حضرتِ شمس لکھنوی کے سر ہے ۔

عہدِ موجود میں لفظی اور فنی تنقید ختم ہو چکی ہے اور نقاد حضرات صرف فکری پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ فن ختم ہو گیا اور شاعری میں اس قدر بے راہروی آگئی ہے کہ بڑے بڑے شعرا کا کلام فنی اغلاط سے پر ہوتا ہے ۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بیشتر شعرا حضرات اب فن کی ابجد سے بھی واقف نہیں ۔ صنائع لفظی و معنوی، علمِ بیان، عیوبِ قافیہ وغیرہ کے علم میں بالکل کورے ہیں ۔ بس طبیعت میں ذرا سی موزونیت پائی اور شعر کہنا شروع کر دیے ۔ اس طرح شاعری بازیچۂ اطفال بن گئی ۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ بعض جرائد میں قطعہ کو

رباعی اور رباعی کو قطعہ کہہ کے شائع کیا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ شاعری ایک باقاعدہ فن ہے۔ ہر فن کا یہ اصول ہے کہ پہلے اسے سیکھا جائے، پھر اس کے میدان میں قدم رکھا جائے۔ تیرنا سیکھے بغیر دریا میں چھلانگ لگا دینے کا نتیجہ ظاہر ہے۔ پہلے زمانہ میں ایک طرف تو شعر گوئی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی جاتی تھی، دوسری طرف اہل نظر اور اہل کمال فن تنقید سے غلطیوں کی گرفت کرتے تھے اور ان کی اصلاح کرتے تھے۔ اس طرح شاعری میں بے راہروی کو بھی روکا جاتا تھا اور فن کا تحفظ بھی کیا جاتا تھا۔ یہ فن کی بڑی اہم خدمت تھی۔ حضرت شمس نے اپنی تنقید کے ذریعہ یہی خدمت انجام دی ہے اور وہ اس کے لیے ان تمام اہل علم و اہل نظر کے شکریہ کے مستحق ہیں، جن کو فن کی قدریں عزیز ہیں۔ "شعور و شاعری" کے مضامین کا بغور مطالعہ کیجیے تو پتا چلے گا کہ شمس صاحب کی نظر کتنی دقیق، شعر فہمی کا ملکہ کتنا عمیق، معانی و بیان پر کس قدر دسترس، معائب و محاسن شعریہ پر کتنی گہری نظر اور فن پر ان کی گرفت کس قدر مضبوط ہے۔ مثلاً کلام فانی کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے اس شعر سے ابتدا کی ہے:

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ، میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

شعر کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

"فانی کا یہ شعر سن کر یہ رائے قائم کی تھی کہ آدمی طبیعت دار ہیں مگر ذوق سلیم اور شعور صحیح کی کمی ہے۔"

فانی جیسے شاعر کے لیے اس قسم کی رائے کا اظہار کرنا، جو بڑے بڑوں کو چونکا دے، ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ انھوں نے محض اس رائے کا اظہار ہی نہیں کیا ہے، بلکہ اس کو اس شعر اور دوسرے اشعار کا تجزیہ کر کے صحیح بھی ثابت کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"یہ رائے میں نے اس وجہ سے قائم کی تھی کہ شکوے

کرنے اور سننے کے لیے دونوں کا یکجا ہونا ضروری ہے اور دن رات
یکجا رہنے والا معشوق نہیں، ہمزاد ہے۔"

اس کے بعد شعر پر اصلاح دیتے ہوئے صرف ایک لفظ بدل کر اس کا عیب یوں دور کر دیا:

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے نالے
کفن سرکاؤ، میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

"شکوے" کی جگہ "نالے" نے دن رات کی یکجائی کی ضرورت ختم کر دی، اس لیے کہ نالے دور سے بھی سنے جا سکتے ہیں۔

ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

ستم رسیدۂ آوازۂ بیاباں ہوں
قفس میں کھینچ کے لائی مری زباں، صیاد!

گرفتار قفس بلبل صیاد سے کہہ رہی ہے کہ اس نے اس کی خوش الحانی کی وجہ سے اس کو گرفتار کیا۔ یہ بات اپنے دل یا ہم قفس سے کہنے کی ہے، صیاد تو جانتا ہی ہے۔ یہ عیب ردیف سے پیدا ہوا۔ شعر یوں ہونا چاہیے تھا:

ستم رسیدۂ آوازۂ بیاباں ہوں
قفس میں کھینچ کے لائی مری زباں مجھ کو

مگر اس سے بھی شعر درست نہیں ہوا۔ پہلے مصرع میں خوش الحانی کو "آوازہ" اور دوسرے مصرع میں "زباں" کہا ہے۔

"آوازہ" اور "زبان" تمام جانوروں میں مشترک ہے۔ گدھا اور کوا بھی یہی کہہ سکتا ہے۔ یہ کلام کا بڑا نقص ہے کہ کسی مخصوص صفت کمال کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس میں تعمیم پیدا ہو کے اس کی اہمیت ختم ہو جائے۔ یہ صحیح ہے کہ

بلبل کے ساتھ "آواز" کا ذکر خوش الحانی کا اور گدھے کے ساتھ کراہتِ صوت کا قرینہ ہے۔ مگر اس شعر میں یہ قرینہ بھی نہیں۔ صرف "آوازۂ بیاباں" سے اگر آپ بلبل سمجھیں تو یہ آپ کا حسن ظن ہو گا کہ شاعر یہی کہنا چاہتا ہے۔ الفاظ سے یہ معنی پیدا نہیں ہوتے۔ بلبل بیاباں میں نہیں، باغ میں شاخِ گل پر خوشبو سے مست ہو کے چہکتا ہے۔ بیاباں میں الو بولتا ہے۔ قرینہ اس مطلب پر دلالت کرتا ہے کہ صیاد سے الو کہہ رہا ہے کہ اس نے اس کے بولنے سے اس کو پہچان لیا اور گرفتار کر لیا اور اس کے لیے "آوازہ" ہی کہنا مناسب تھا۔ الفاظ اور قرینہ، سب اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ "الو" سمجھا جائے۔ مگر یہ شاعر کے کہنے کی بات نہیں۔ اس نے یقیناً "بلبل" کہنا چاہا ہے۔ یہ زبان و بیان کا بڑا نقص ہے کہ کہنا چاہا "بلبل" اور کہہ گیا "الو"۔ اگر "آوازۂ بیاباں" کی جگہ "آوازۂ گلستاں" ہوتا تو یہ نقص پیدا نہ ہوتا۔ مگر شاعر جو کہنا چاہتا ہے، وہ اس سے بھی ادا نہیں ہوتا۔ بلبل کا اپنی نوا سنجی کو "آوازہ" کہنا منشائے بلاغت کے خلاف ہے۔ اس کو یوں کہنا چاہیے:

ستم رسیدۂ اعجازِ نغمہ سنجی ہوں
قفس میں کھینچ کے لائی مری زباں، صیاد!

مگر اس میں بھی "صیاد" اور "زباں" کی لفظ باقی رہتی ہے۔ اگر ردیف و قافیہ کا لحاظ نہ کیا جائے تو اس مفہوم کو یوں ادا ہونا چاہیے:

ستم رسیدۂ اعجازِ نغمہ سنجی ہوں
قفس میں کھینچ کے لایا مرا کمال مجھے

ماہر القادری صاحب کی نعت گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے شمس صاحب نے اس صنفِ سخن کی نزاکتوں پر روشنی ڈالی ہے اور نعت گوئی کا ایک معیار معین کیا ہے۔ نعت گوئی کے ایک بنیادی نکتہ کی وضاحت فرماتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"دوسرے اصنافِ سخن میں صرف حسنِ طبیعت کی ضرورت ہوتی ہے، مگر نعت و منقبت میں حسنِ عقیدت بھی شامل ہوتا ہے اور ایک ساتھ ان دونوں کا نباہنا بہت مشکل ہے۔ زبانِ عشق اور زبانِ عقیدت میں بڑا نازک فرق ہے اور ان دونوں کا امتزاج بہت دشوار ہے۔"

یقیناً شمس صاحب کا بیان کردہ یہ نکتہ بتاتا ہے کہ نعت و منقبت کہنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ اس عہد میں بیشتر نعت گو شعرا اس حقیقت سے بے خبر ہیں اور اسی وجہ سے بعض نعتوں میں ایسے ایسے اشعار سننے میں آتے ہیں، جو حفظِ مراتب کے خلاف اور معرفتِ رسولؐ سے بے خبری کی دلیل ہوتے ہیں۔ ان سے سرکارِ رسالتؐ کی مدح کے بجائے، منقصت کے پہلو نکلتے ہیں۔

ماہر القادری صاحب کے مجموعۂ نعت "ذکرِ جمیل" کی پہلی ہی نعت پر جو انھوں نے تنقید کی ہے، اس میں معنوی خامیوں کے ساتھ ساتھ زبان و عروض کی غلطیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ شاعری کے اعتبار سے بھی ان کے اس کلام کو غیر مستحسن ثابت کیا ہے۔

سودا کا ایک شعر، جس پر تنقید "شعور و شاعری" میں شامل نہیں ہے، ملاحظہ کیجیے:

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے، سودا!
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

سودا کا یہ شعر بہت مشہور ہے اورر دوسرا مصرع تو زباں زد ہے۔ اس پر غور کرنے سے وہ دو عیب بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں، جن کی نشاندہی شمس صاحب نے کی ہے اور جن کی وجہ سے شعر نے اپنی معنویت اور اپنا حسن کھو دیا ہے۔ ایک تو "کیفیتِ چشم" کی لفظ، جس سے کسی طرح بھی محبوب کی آنکھوں کا حسن،

ان کی کشش ، گلابی شرابی رنگت اور خمار آلود مستی ظاہر نہیں ہوتی ۔ اس کے برخلاف میر کا شعر ہے :

میر ! ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

جس نے محبوب کی آنکھوں کے حسن کی تصویر کھینچ دی ہے اور اس طرح کہ شعر پڑھ یا سن کے تصور ان آنکھوں کے حسن میں کھو جاتا ہے اور دل بے اختیار ان کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے ۔ شمس صاحب نے "کیفیتِ چشم" کی بے کیف اور بے لطف ترکیب کو بدل کر اور اس کے بجائے "وہ مست نگاہیں" کہہ کر اس میں وہ کیفیت ، لطف اور اثر پیدا کر دیا ہے ، جس سے قاری محبوب کی حسین آنکھوں کے تصور میں کھو جائے اور اس کے جذب و کشش سے اپنے دل کو اس کی طرف کھنچتا ہوا محسوس کرے ۔ دوسرا عیب مصرع میں "مجھے یاد ہے سودا" کے ٹکڑے سے پیدا ہوا ہے ۔ یہاں "یاد ہے" کی لفظ ماضی سے حال تک محیط ہے ، اس لیے کسی فوری ردِ عمل کا سبب نہیں ہو سکتی ۔ اگر اس کے بجائے یہ کہا جاتا کہ "ساغرِ شراب دیکھ کر وہ آنکھیں اور ان کی مستی مجھے یاد آگئی" تو اس کا فوری اور فطری ردِ عمل یہ ہوتا :

وہ مست نگاہیں مجھے یاد آ گئیں ، سودا !

اس اصلاح نے شعر کو معنوی اعتبار سے بھی بلند کر دیا اور اس میں لطف بھی پیدا کر دیا ۔

اسی طرح انیس و دبیر جیسے شاعران اعظم کے کلام پر بھی انھوں نے جو تنقید کی ہے اور جو اصلاحیں دی ہیں ، وہ "طلوعِ افکار" کے مارچ ۱۹۹۵ء کے شمارہ میں "انیس و دبیر کے غلط اشعار" کے عنوان سے شائع ہوئی ہیں ۔

میر انیس اور مرزا دبیر ایسے عظیم شاعر ہیں ، جن کا کوئی مثل نہیں ۔ ان کے شاعرانہ کمال سے انکار ، اپنی نافہمی کا اقرار ہے ۔

ہر شاعر کے کلام میں اچھے برے ہر طرح کے شعر ہوتے ہیں ۔ مگر اس کی شاعری کا درجہ اس کے اچھے اشعار سے متعین کیا جاتا ہے ۔ میر " خدائے سخن " کہے جاتے ہیں ۔ ان کے پست اشعار سے ان کا درجہ متعین نہیں کیا جاتا ۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مضمون آفرینی میں زورِ طبیعت سے الفاظ کی طرف خاص توجہ نہیں ہوتی اور صحیح طور پر مفہوم ادا نہیں ہوتا ، مگر شاعر کے ذہن میں موجود ہوتا ہے ، اس وجہ سے وہ سمجھتا ہے کہ مطلب ادا ہو گیا ، اسی کو " المعنی فی بطن الشاعر " کہتے ہیں ۔ روانیِ طبیعت میں بھی تلاش و بندش الفاظ میں کوتاہی ہو جاتی ہے یہ ہر شاعر سے ہوتا ہے ۔

انیس و دبیر کے یہاں بھی غلطیاں ہیں ۔ ان کا بیان اصلاحِ ذوق کے لیے مفید ہے ، اس لیے میر صاحب اور مرزا صاحب کے کلام سے اس کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں :۔

مرزا صاحب نے ایک مرثیہ میں گرمی کی شدت نظم کی ۔ اس کی بڑی شہرت ہوئی ۔ میر صاحب نے بھی اسی بحر اور انداز میں مرثیہ کہا ۔ یہ دونوں مرثیے ان کے تمام مرثیوں سے بہت بہتر سمجھے جاتے ہیں ۔

مرزا صاحب کے مرثیہ کا مطلع یہ ہے :

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی
پنہاں درازیِ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی
اور قطع زلفِ لیلیٰ زہرہ لقب ہوئی
فکرِ رفو تھی چرخِ ہنر مند کے لیے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لیے

پہلے مصرع میں "مقراض" ہے دوسرے میں "قطع" ہونا چاہیے، ورنہ "مقراض" کہنے کا کوئی فائدہ نہیں ۔ دوسرے مصرع میں "طاؤس شب" اضافت تشبیہی ہے اور وجہِ شبہ کوئی نہیں، اس وجہ سے تشبیہ باطل ہو گئی ۔ چوتھے مصرع میں "لیلیٰ زہرہ لقب" بے معنی ہے، یعنی جو لیلیٰ زہرہ لقب تھی، اس کی زلف قطع ہو گئی ۔ لیلیٰ کو زہرہ لقب کہنا صحیح نہیں ۔ برعکس نہند نام زنگی کافور ۔ اگر یہ ہوتا کہ "لیلیٰ زہرہ لقب" ہو گئی تو صحیح ہوتا، لیکن لیلیٰ جو زہرہ لقب تھی، اس کی زلف قطع ہو گئی ۔ اس کا مطلب ہے کہ روشنی جاتی رہی تاریکی آ گئی، جو مرادِ شاعر کے خلاف ہے ۔ "لیلیٰ زہرہ لقب ہو گئی" کہنا چاہیے تھا، مگر اضافت کی وجہ سے یہ مفہوم پیدا نہیں ہو سکتا اور اضافت کے بغیر مصرع موزوں نہیں ہو گا ۔ پانچویں مصرع میں "فکر رفو" یعنی "قبائے سحر چاک" ہونے سے جو نور پھیلا تھا، قبائے سحر میں رفو کر کے تاریکی واپس لانے کی فکر ہوئی ۔ یہ منشائے شاعر کے خلاف ہے ۔ "چرخ ہنر مند" بھی غلط ہے ۔ ہنر مند صرف عقل و شعور رکھنے والا ذہین کار پرداز انسان ہو سکتا ہے ۔ زمین آسمان، جنگل بیابان تمام حیوان ہنر مند ہو سکتے ۔ اگر ایسی صفت کسی میں ظاہر کرنا ہوتی ہے، جو اس میں نہیں پائی جاتی، تو شاعر اس کے لیے دلیلِ شاعرانہ پیش کرتا ہے، جیسے آگ سے شعلہ اور دھواں نکلتا ہے ۔ شاعر کہتا ہے کہ آگ سے پانی نکلا اور اس کو یوں ثابت کرتا ہے :

دل سے لو کا جو اٹھا، آنکھ سے ٹپکا پانی
آگ سے آج نکلتے ہوئے دیکھا پانی

کسی شاعر نے کہا ہے کہ پانی کی تہ میں آگ جل رہی ہے اور ساحل سے دھواں اٹھ رہا ہے ۔ اس کو یوں ثابت کیا ہے :

لبوں پر آہ، بحرِ عشق میں ڈوبا ہوا دل ہے
تہِ آب آگ جلتی ہے دھواں بالائے ساحل ہے

چھٹے مصرع میں پیوند کا سامان ہو گیا۔ جہاں رفو کی ضرورت ہے، وہاں پیوند نہیں لگتا
پورا بند ۔

پر ہے اغلاط سے یوں، راگ سے جیسے باجا

اصلاح سے یوں درست ہو سکتا ہے :

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی
تب قطع زلفِ لیلیٰ مسکین شب ہوئی

مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی
لیلیٰ لقب جو شب تھی، وہ زہرہ لقب ہوئی

زنگی شب کی تیرگی کافور ہو گئی
گیتی تمام نور سے معمور ہو گئی

میر صاحب نے مرزا کے صاحب کے جواب میں جو مرثیہ کہا، اس کی ایک
بیت سنیے :

بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

اب تو نظام فیثا غورث نے یہ ثابت کر دیا کہ آسمان کا وجود ہی نہیں ہے
لیکن جب میر صاحب نے کہا تھا، اس وقت نظام بطلموسی صحیح سمجھا جاتا تھا، جس میں
کرۂ زمین پر کرۂ ہوا، اس پر کرۂ زمہریر، اس پر کرۂ نار، اس پر آسمان ہے۔
میر صاحب فرماتے ہیں کہ زمین پر اتنی گرمی تھی کہ کرۂ نار میں آگ بھڑکنے
لگی۔ اس میں آگ بھڑکتی ہی ہے۔ زمین کی گرمی سے اس کا کیا تعلق؟ اگر کہا جائے کہ
زمین کی گرمی نے اس کے شعلوں کو تیز کر دیا، جو مصرع سے ظاہر نہیں ہوتا، لیکن یہ
فرض کرنے کے بعد بھی مضمون غلط ہے۔ یعنی زمین کی گرمی کرۂ ہوا سے گذرتی ہوئی

کرۂ زمہریر کو پار کرتی کرۂ نار میں پہنچ گئی اور وہاں شعلے بھڑکا دیے۔ نہ کرۂ زمہریر نے اس کو متاثر کیا، نہ اس نے کرۂ زمہریر کو۔ یہ سب بے ربط باتیں ہیں۔ اس کو یوں درست کیا جا سکتا ہے:

گرمی ہوا میں ایسی تھی، جیسی اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

ایک اور بیت ہے:

پانی تھا آگ، گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی، جو سیخِ موج تک آئی، کباب تھی

جب پانی آگ تھا تو مچھلی کو وہیں کباب ہو جانا چاہیے تھا، سیخِ موج تک زندہ پہنچنا کیسے ممکن ہے؟ مرزا صاحب نے صحیح کہا ہے:

ہوتی تھیں سیخِ موج پہ مرغابیاں کباب

بیت یوں صحیح ہو سکتی ہے:

پانی تھا آگ، گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جہاں تھی، بحر کے اندر کباب تھی

ایک بیت یہ بھی ہے:

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

"تین رات کی پیاسی" روزمرہ اور اصولِ تکلم کے خلاف ہے۔ "رات" سے وہی باتیں منسوب کی جاتی ہیں، جو اس سے مخصوص ہیں۔ جیسے: چاندنی رات، تاروں بھری رات، برسات کی رات، بیاہ کی رات یا کوئی مخصوص واقعہ کسی رات میں ہوا ہو، اس کو کہا جاتا ہے۔ باقی ہر بات دن سے منسوب کی جاتی ہے، جس میں رات شامل ہوتی ہے۔ "دن"، "رات" کے مقابلہ میں کامل ہے۔ اس کو چھوڑ کے ناقص

کا ذکر اصولِ تکلم کے خلاف ہے۔ جو بات "رات" سے مخصوص نہیں ہے، بطورِ واقعہ بیان کیا جا رہا ہے تو اس میں دن شامل نہیں ہوتا۔ جیسے: تین رات، محفلِ رقص و سرود گرم رہی۔ اس میں دن شامل نہیں ہے۔ وہ تین دن میرے مہمان رہے تو اس میں رات شامل ہے۔ "تین رات کی پیاسی" محاوروں اور اصولِ تکلم، دونوں، کے خلاف اور بھونڈی بات ہے۔ بیت یوں درست ہو سکتی ہے:

پیاسی جو تھی سپاہ شہِ کائنات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

"شہِ کائنات" کہنے سے موجوں کے سر پٹکنے میں بلاغت پیدا ہو گئی ہے:

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!

اشعار کے حسن و قبح پر حضرت شمس صاحب کی یہ بحثیں، غلطیوں کی نشاندہی اور ان پر اصلاحیں اگر بغور دیکھی جائیں تو شعر فہمی، ژرف نگاہی، تنقید کے فن میں ان کی مہارت، معانی و بیان پر ان کی نظر کی گہرائی و گیرائی اور اصلاح دینے کے فن میں ان کے کمال کا اندازہ ہوگا۔ "شعور و شاعری" ان کے انھیں فنی کمالات کی آئینہ دار ہے۔

زندگی

طب کا امتحان پاس کرنے کے بعد علاج معالجہ کا سلسلہ اس وقت سے اب تک قائم ہے، مگر مطب عام نہیں۔ اپنی گوناگوں معروفیات کی وجہ سے انھوں نے اس کو اپنا پیشہ نہیں بنایا، مگر مخصوص لوگوں کا علاج اب بھی کرتے ہیں اور طبی مشورے بھی دیتے ہیں۔

شکار: مولانا کو ۱۹۳۰ء میں شکار کا شوق ہوا۔ اس میں بھی انھوں نے حیرت انگیز

کمال حاصل کیا۔ وہ بارہ بور کی بندوق اور آٹھ نمبر کے چھرے سے اڑتے ہوئے پرندہ کو گرا دیتے تھے۔

اسنیک شوٹنگ: ہندوستان میں ایک پرندہ، قد میں چڑیا کا دونا، دم بہت لمبی، بنجر زمین پر بیٹھا دم ہلاتا رہتا ہے۔ اس کا نام چرندھول ہے اور چنڈول کے نام سے مشہور ہے۔ آدمی کی آہٹ پاتے ہی اڑتا ہے۔ اس کی پرواز سیدھی نہیں ہوتی بلکہ اوپر نیچے ہوتا ہوا اڑتا ہے۔ اس کا شکار بہت مشکل ہے، مگر مولانا اس کو گرا لیتے تھے۔

ایک دفعہ کنور صاحب سنگرامئو کے ساتھ شکار پر گئے۔ سامنے ہرن نظر آیا۔ مولانا نے کہا،

"میں کچھ پڑھ کر اس پر گولی چلاؤں گا۔ گولی اس پر سے گذر جائے گی اور یہ گر جائے گا۔" انھوں نے رائفل دے دی۔ مولانا نے نشانہ باندھ کر گولی چلائی۔۔ ہرن گر گیا۔ ان کے آدمیوں سے کہا،

"اسے ہاتھ پیر باندھ کر لے آؤ۔ تھوڑی دیر میں یہ اٹھنے کی کوشش کرے گا۔"

ہرن لایا گیا۔ دیکھا کہ گولی کا کہیں نشان نہ تھا۔ کنور صاحب نے کہا،

"آپ نے جو پڑھ کر گولی چلائی، مجھے بھی بتائیے۔" کہا،

"میں نے بسم اللہ کہہ کے اس کے سینگ کی نوک پر گولی ماری۔ اس سے اس کا بھیجا ہل گیا اور یہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔" اس نشانہ سے لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی، مگر اس فن میں بھی وہ ہندوستان گیر شہرت حاصل نہ کر سکے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس شغل کی عمر صرف نو سال ہے اور وہ بھی ایسے مضافات میں، جو تین شہروں کی سرحد پر واقع ہے، یعنی جونپور، سلطانپور اور پرتاب گڑھ۔ ہر شہر وہاں سے تیس، چالیس میل دور ہے۔

ادبی زندگی کا آغاز

مولانا کی ادبی زندگی کا آغاز سترہ برس کے سن سے ہوا، جب وہ ریاضی جنتری

میں مضامین لکھا کرتے تھے ۔ اس کے بعد رسالہ " حقائق " میں مضمون لکھنا شروع کیا ، مگر اس کی اشاعت محدود تھی ، لیکن جن لوگوں تک وہ رسالہ پہنچتا تھا ، وہ صاحبانِ علم تھے اور انھوں نے ان کے مضامین کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور ہمت افزائی بھی کی ۔ ۳۳ء میں انھوں نے علی عباس حسینی کے افسانہ " باسی پھول " پر سخن ہائے ناگفتنی کے عنوان سے تنقید کی ، جو اخبار " سرفراز " میں مسلسل چھپتی رہی ۔ اس سے ان کو عام شہرت ہوئی ۔ اس کے بعد ۳۶ء میں علی ضامن ترمذی نے لکھنؤ کی شاعری اور وہاں کے شعرا پر " حقیقتِ حال " کے عنوان سے جارحانہ حملے کیے ۔ اس کا جواب مولانا نے " حقیقتِ حال کا جائزہ " کے عنوان سے اخبار " سرفراز " میں لکھا ، جس کا سلسلہ مہینوں جاری رہا ۔ اس مضمون کو بہت پسند کیا گیا اور ہر طرف سے اس کی تعریف میں لوگوں نے قلم فرسائیاں کیں ۔ نیاز فتحپوری نے اس کا خلاصہ " نگار " میں اس نوٹ کے ساتھ شائع کیا ۔

" اس کا جواب محال ہے ، لیکن کوئی صاحب لکھنا چاہیں تو " نگار " کے صفحات حاضر ہیں ۔ " پروفیسر مسعود حسن ادیب نے مولانا کو لکھا ،

" آپ کا جو مضمون " نگار " میں شائع ہوا ہے ، وہ میں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں ۔ کن نمبروں میں شائع ہوا ہے ؟ " (ان کا یہ خط میں نے " نگارشاتِ رنگ رنگ " میں چھاپ دیا ہے ۔) جعفر علی خاں اثر نے مولانا کو لکھا ،

" آپ کے مضامین میں بڑی دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں ۔ آپ نے معترضین کو دنداں شکن جواب دیے ہیں ۔ میرا عقیدہ ہے کہ آپ کی یہ کتاب اسقام و اغلاط سے پاک ہے ۔ " یہ اور اس کے علاوہ بہت سے خطوط میں نے " نگارشاتِ رنگ رنگ " میں شائع کر دیے ہیں ۔ ۴۰ء تک مولانا کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور بقول ڈاکٹر نعیم تقوی ، " بڑے بڑوں نے ان کا لوہا مان لیا ۔ "

پاکستان آمد

۱۹۴۷ء میں انگریزوں نے ہندوستان کو آزاد کیا ۔ اسمبلیوں کا انتخاب ہوا ۔ سمپورنانند بنارس کے ایک ہائی اسکول ٹیچر صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں کامیاب ہو کر وزیر تعلیم ہو گئے ۔ انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اسکولوں سے اردو اور فارسی خارج کر دی ۔ مولانا معطل ہو گئے اور جون ۱۹۴۹ء میں پاکستان آگئے ۔

پاکستان آنے کے بعد: ۱۹۵۲ء میں یہاں اردو، فارسی پڑھانے پر گورنمنٹ اسکول میں ملازم ہو گئے ۔ ۴۰ء سے ۵۲ء تک ادبی مشاغل ترک رہے ۔ ۵۳ء میں ان کی کتاب "لکھنؤ کی زبان" شائع ہوئی ۔ وہ اخباروں کو بھیجی گئی ۔ ہندوستان و پاکستان کے اخباروں نے اس پر گرانقدر تبصرے کیے اور ایک دفعہ پھر ان کا نام منظر عام پر آیا ۔ اس کے بعد پھر خاموشی اختیار کر لی ۔ مگر کتب بینی اور لکھنے پڑھنے میں مشغول رہے ۔ کئی کتابوں کے خاکے بنائے اور کئی کتابیں لکھیں ۔ مگر شائع کوئی نہیں ہوئی ۔ جب نیاز صاحب پاکستان آئے تو مولانا سے ملے اور کہا ۔

"ایک وقت وہ تھا کہ میں آٹھ آٹھ گھنٹے کام کرتا تھا ۔ اگر مضامین "نگار" کے معیار کے نہ ہوتے تو پورا پرچہ لکھ ڈالتا ۔ اب میں آدھ گھنٹے بھی کام نہیں کر سکتا ، لہٰذا آپ "نگار" کے لیے مضامین لکھا کیجیے ۔" چنانچہ مولانا کی مضمون نگاری کا سلسلہ شروع ہو گیا ، جو نیاز صاحب کے بعد بھی جاری رہا ۔ اس طرح ایک دفعہ پھر مولانا کا نام ہند و پاکستان کے ادبی حلقوں میں گونجنے لگا ۔ اسی زمانہ میں عبداللہ کالج کے پرنسپل نے مولانا سے خواہش کی کہ "عکس لطیف" کے لیے ایک مضمون لکھنؤ پر لکھ دیں ، چنانچہ انھوں نے "مدینۂ تہذیب لکھنؤ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اس کو بہت پسند کیا گیا اور لوگوں نے اس سلسلہ کو جاری رکھنے کی خواہش ظاہر کی ۔ مدیر "عکس لطیف" مکرم لکھنوی صاحب نے بھی مولانا سے اصرار کیا ، چنانچہ یہ سلسلہ

جاری رہا، یہاں تک ایک کتاب مرتب ہو گئی اور مدیر "عکس لطیف" نے ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب سے مقدمہ لکھوا کر اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ اس کے بعد "عکس لطیف" بند ہو گیا۔ اسی زمانہ میں، میں نے "طلوعِ افکار" جاری کیا اور میری خواہش پر مولانا نے اس میں تنقیدی مضامین لکھنا شروع کیے۔ اس میں مشہور شعرا کے کلام کی فنی غلطیاں دکھا کر ان کی اصلاح کی گئی۔ یہ تمام مضامین جمع کر کے مولانا نے اس پر ایک مقدمہ لکھا اور "شعور و شاعری" کے نام سے شائع کر دیا۔

مولانا کی تصانیف

مولانا کی بعض تصانیف حسبِ ذیل ہیں:

(۱) درِ منظوم: یہ کتاب لکھنؤ کے معروف شاعر اور عالم، وجاہت حسین ناظم کے قصائد، ان کے حالات اور ان کے کلام پر مفصل تبصرہ پر مشتمل ہے۔ ۱۹۳۷ء میں یہ کتاب لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

(۲) شکستِ آئینہ: پروفیسر مسعود حسن ادیب کی کتاب "ہماری شاعری" پر یگانہ موہانی کے اعتراضات، جو "آئینۂ تحقیق" کے نام سے شائع ہوئے تھے، کا جواب مولانا نے اس کتاب کے ذریعہ دیا۔ اس میں لفظ و معنی کے تعلق پر ایک دقیق بحث ہے۔ یہ کتاب ۲۸ء میں نظامی پریس لکھنؤ سے چھپی۔

(۳) فلسفۂ خیام: اس میں خیام کی فکر اور اس کے فلسفہ پر اس کی رباعیات کے حوالہ سے گفتگو ہے۔ یہ کتاب بارہ، تیرہ برس تک لکھنؤ یونیورسٹی کے بی۔اے۔ اور دبیرِ کامل کے نصاب میں شامل رہی۔ یہ ۳۷ء میں سرفراز پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔

(۴) لکھنؤ کی زبان: ۳۷ء میں یہ کتاب لکھی گئی اور ۵۵ء میں کراچی سے شائع ہوئی اس میں دلی اور لکھنؤ کی زبان کا فرق، لکھنؤ کی زبان کے امتیازی خصوصیات اور

زبان کے لیے لکھنؤ کے شعرا و ادبا کی خدمات کا جائزہ شامل ہے۔

(۵) لکھنؤ کی تہذیب: یہ لکھنؤ کی تمدنی، علمی اور ادبی تہذیب کا تفصیلی جائزہ ہے۔

(۶) لکھنؤ کی شاعری: لکھنؤ کی شاعری کے امتیازی خصوصیات، دہلی کی شاعری سے اس کا تقابل اور شعرائے لکھنؤ کے منتخب کلام پر مشتمل یہ کتاب ڈاکٹر احسن فاروقی کے تبصرہ کے ساتھ شائع ہوئی۔

(۷) تاریخ لکھنؤ: بلا خوفِ تردید مولانا عبدالحلیم شرر کی "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" کے بعد اس موضوع پر دنیائے ادب میں دوسری بڑی تصنیف ہے۔ یہ کتاب پہلے ماہنامہ "عکس لطیف" میں بالاقساط چھپی اور ۷۲ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔

(۸) انتخابِ دیوانِ جاوید: بندۂ کاظم صاحب جاوید کے کلام کا انتخاب، شاعر کے حالات اور مقدمۂ کتاب مولانا کے قلم سے ہے۔

(۹) شعور و شاعری: نیاز فتحپوری کی "مالہ وماعلیہ" اور "انتقادیات" کے مرتبہ کی یہ تصنیف ہے۔ اندازِ تحریر نہایت عالمانہ اور دلچسپ اور مولانا کی قوتِ نقد کا آئینہ دار ہے۔ مقدمہ ڈاکٹر احسن فاروقی کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں مشاہیر، شعرا کے کلام پر فنی غلطیوں کی نشاندہی کے ساتھ اصلاح کی گئی ہے۔

(۱۰) نگارشاتِ رنگ رنگ: اس کتاب میں دس تحقیقی اور تنقیدی مقالات شامل ہیں۔ یہ مضامین "نگار"، "عکس لطیف" اور "طلوعِ افکار" میں چھپ چکے ہیں۔

ان کے علاوہ مولانا کی مذہبی تصانیف میں حسبِ ذیل کتابیں شامل ہیں:

(۱) ۔ ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ۔

(۲) ۔ امام ابو حنیفہؒ کا مذہب۔

(۳) ۔ اسلام پر کیا گزری۔ (اس کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر احسن فاروقی نے True Face of Islam کے نام سے کیا ہے۔)

ان کے علاوہ مولانا کی غیر مطبوعہ کتابیں حسبِ ذیل ہیں:

(۱) ۔ تنقیدی مباحث

(۲) ۔ حیات تاج العلماؒ

(۳) ۔ تاریخ اسلام

(۴) ۔ امام زین العابدینؑ

مولانا نے لسانیات میں ایک نئے علم کی بنیاد رکھی اور مذہبی علوم میں اضافہ کیا ۔ انھوں نے شعر و ادب میں نئے قاعدے بھی وضع کیے ہیں ۔ یہ وہ کارنامے ہیں، جو ان کی مثال پیش کرنے سے اذہان کو عاجز کر دیتے ہیں ۔ ایسے علما اور ادبا گزرے ہیں جنھوں نے تاریخ اور مذہب پر کتابیں لکھی ہیں، لیکن میری نظر میں کوئی ایسا مصنف نہیں ہے، جس نے بقول ڈاکٹر احسن فاروقی، "تاریخ میں نئے انکشافات کیے ہوں ۔"

اولاد

مولانا کے چار بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں ۔

بڑے صاحبزادے محمد مرتضیٰ کا انتقال ہو گیا ۔ دوسرے بیٹے محمد موسیٰ ایم ۔ اے ۔ اسسٹنٹ کمشنر انکم ٹیکس ہیں ۔ تیسرے محمد تقی ایم ۔ اے ۔ ایل ایل ۔ بی ۔ جوڈیشل مجسٹریٹ ہیں ۔ چوتھے بیٹے محمد فاخر منیجر دارالتصنیف اور منصرم امور ہیں ۔ ان سب سے مولانا کی ستانوے اولادیں ہیں، جن میں بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں، کنواسے کنواسیاں، داماد اور بہوئیں شامل ہیں ۔ خداوند عالم نے علم و اولاد اور شہرت و عظمت سے ان کا دامن بھر دیا ہے ۔ عمر بھی طویل عطا کی ہے ۔ اس وقت تک دل و دماغ اور حافظہ جوان ہے ۔

میں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اپنے ذاتی علم اور تجربہ سے لکھا ہے ۔ بعض حالات ان سے معلوم کیے ہیں ۔ شخصیت و فن پر جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی میرے ذاتی علم و تجربہ کا نتیجہ ہے ۔

حسین انجم

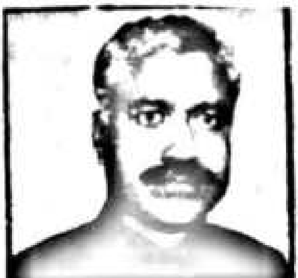
اولادِ ذکورِ حضرتِ مولانا خمسؒ



محمد مرتضیٰ مرحوم



محمد موسیٰ ایم۔اے
(ڈپٹی ڈائریکٹر انکم ٹیکس)



محمد تقی
(ایم۔اے، ایل ایل۔بی،
جوڈیشل مجسٹریٹ)



محمد کاظم
(مہتمم دارالتصنیف و منصرم دیگر امور)

نگارشاتِ شمس

مولانا محمد باقر شمس

وجودِ باری اور فطرتِ انسانی

انسان فطرتاً ہر مسلسل، مرتب اور نتیجہ خیز چیز کو کسی کی حکمت آفرینی اور کارسازی کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ اس نے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ کوئی گھڑی خود بخود بن گئی یا کوئی ہوائی جہاز اتفاق سے بن کر اڑنے لگا۔ اسی طرح کارگاہِ عالم کے ایک ایک ذرہ کی حکیمانہ ساخت، نظمِ کائنات میں اس کی جگہ اور کام پر اگر غور کیا جائے تو اس میں اسی طرح ربط و تسلسل، حکمت و کارسازی نظر آجائے گی، جیسے کسی مشین کے ایک پرزہ میں اور انسان کو ایک جیتے جاگتے دیکھنے اور سننے والے قادر و توانا حکیم و کارساز کو تسلیم کرنے پر مجبور کرے گی۔

سورۃ اعراف میں ہے کہ یہ لوگ ملکوت آسمان و زمین اور اس کائنات میں جو کچھ موجود ہے، اسے کیوں نہیں دیکھتے۔

ہنی توریا یونیورسٹی (کینیڈا) کے سائنس کے پروفیسر فرینک ایلسن لکھتے ہیں کہ زندگی کو قائم و برقرار رکھنے کے لیے اس کرۂ ارضی پر اتنے بیشمار انتظامات نظر آتے ہیں کہ یہ کسی طرح باور نہیں کیا جا سکتا کہ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہیں۔

اولاً کرۂ ارض ایک گولے کی شکل میں خلا میں معلق اپنے قطبی محور پر اس طرح گردش کر رہا ہے کہ اس سے دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن آتا ہے اور پھر یہ کرۂ ارض کے گرد گھوم بھی رہا ہے اور سال کی معین مدت کے اندر اپنا ایک چکر پورا کرتا ہے۔ یہ حرکات خلا میں اس کو صحیح سمت پر قائم رکھتی ہیں۔ قطبی طور پر اپنے مدار کی جانب اس کا جھکاؤ ۲۳ درجے ہے۔ جھکاؤ موسموں میں باقاعدگی پیدا کرتا ہے، جس کے نتیجہ میں زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ آبادکاری کے قابل ہو جاتا ہے اور انواع و اقسام کی رنگا رنگ روئیدگی زمین کی رونق و شادابی کو دوبالا کر دیتی ہے۔ اگر یہ کرۂ

زمین گردش کرنے کے بجائے، ساکن و جامد ہوتا تو نباتات اور پیداوار میں اتنا تنوع نہ ہوتا۔

دوم ایسی گیسیں، جو بقائے حیات کے لیے ضروری ہیں، فضا میں تقریباً پانچ سو میل کی بلندی تک محیط ہیں اور ان کا نہایت دبیز پردہ کرۂ زمین کو ان شہابوں کی تباہ کن بارش سے محفوظ رکھتا ہے، جو روزانہ تقریباً دو کروڑ کی تعداد میں تیس میل فی سیکنڈ کی رفتار سے کرۂ ارضی کی فضا میں داخل ہوتے ہیں۔ دوسرے اثرات کے علاوہ اس ہوا کا پردہ درجۂ حرارت کو ان حدودِ اعتدال کے اندر رکھتا ہے، جو زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہیں۔

ہوائیں بادلوں کی صورت میں سمندر کی تازہ پانی کی بھاپ کو اڑا کر خشکی کی طرف لے جاتی ہیں اور دور دور تک خشک اور پیاسی زمین کو سیراب کرتی ہیں، ورنہ یہ زمین بے آب و گیاہ صحرا میں تبدیل ہو جائے۔ گویا دوسرے لفظوں میں فطرت نے سمندروں اور ہواؤں کی ہم آہنگی کو اس کرۂ ارضی میں بقائے زیست کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ پانی میں چار اہم خصوصیتیں رکھ دی ہیں:

(۱) وہ کم سے کم درجۂ حرارت میں آکسیجن کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو جذب کرتا ہے۔

(۲) نقطۂ انجماد سے چار درجے سینٹی گریڈ اوپر اس کی کثافت (density) انتہائی حد کو پہنچ جاتی ہے، جس کی وجہ سے دریا اور جھیلیں عموماً منجمد نہیں ہوتیں۔

(۳) برف کی کثافت پانی سے کم ہوتی ہے، جس کی وجہ سے برف پانی کے اوپر تیرتی رہتی ہے۔

(۴) جب پانی جمنے لگتا ہے تو کثیر مقدار میں حرارت خارج کر دیتا ہے۔

یہی وہ خصوصیات ہیں، جن کی وجہ سے جاڑوں کے طویل موسم میں جھیلوں دریاؤں اور سمندروں کے اندر بیشمار حیوانات زندہ رہتے ہیں، ورنہ اس کا سارا پانی

جم جاتا تو ان میں کوئی زندگی ممکن نہ ہوتی ۔ خشک زمین ارضی حیات کے لیے ایک مستحکم بنیاد کا کام دیتی ہے ۔ مٹی ایسے نمکیات مہیا کرتی ہے، جنھیں جذب کر کے مختلف قسم کے نباتات اور پودے زمین کا سینہ چیر کر باہر نکل آتے ہیں اور جاندار مخلوق کا رزق بنتے ہیں ۔

زمین کے قریب مختلف قسم کی دھاتوں کا وجود تہذیب کی نشوونما اور ارتقا میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے ۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس عالمِ وجود کے پیچھے کوئی اسکیم اور کوئی کارفرما قوت موجود نہیں تو لامحالہ یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ یہ عالمِ رنگ و بو محض ایک اتفاق کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہو گیا ۔

اب دیکھیے! اتفاق محض ایک فرضی چیز نہیں، بلکہ یہ ایک بہت ترقی یافتہ حسابی نظریہ ہے، جس کا اطلاق ان امور پر کیا جاتا ہے، جن میں یقینی اور قطعی معلومات ممکن نہیں ۔ اس نظریہ کے ذریعہ ایسے بےلاگ اصول ہمارے ہاتھ آجاتے ہیں، جن کی مدد سے ہم حق و ناحق میں باآسانی امتیاز کر سکتے ہیں اور کسی خاص نوعیت کے واقعہ کے امکاناتِ صدور کا حساب لگا کر صحیح صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اتفاقاً اس کا پیش آجانا کس حد تک ممکن ہے ۔

پروٹین، جو تمام ذیحیات خلیوں کے اجزائے لازم کی حیثیت رکھتے ہیں، پانچ عناصر پر مشتمل ہیں: (۱) کاربن (۲) ہائڈروجن (۳) نائٹروجن (۴) آکسیجن (۵) گندھک ہر پروٹینی سالمہ عناصر کے چالیس ہزار دقیق ذرات یا جواہر پر مشتمل ہوتا ہے۔ پھر کائنات میں بیانوے کیمیاوی عناصر بالکل منتشر اور غیر مرتب حالت میں بکھرے ہوئے ہیں ۔ ان بیانوے عناصر کے بے ترتیب ڈھیر میں سے نکل کر یہ پانچوں عناصر اس طرح باہم ملیں کہ ایک پروٹینی سالمہ آپ سے آپ وجود میں آسکے ۔ اس کا امکان کہاں تک ہے؟

مادہ کی وہ مقدار جسے مسلسل ہلانے سے اتفاقاً یہ نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے اور وہ

مدت جس کے اندر اس کام کی تکمیل ہو، حساب لگا کر معلوم کی جا سکتی ہے۔ ایک سوئس حساب داں چارلس ایوجین گائی نے اس کا حساب لگایا ہے۔ اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کے کسی اتفاقی واقعہ کا امکان ۱۶۰۔ ۱۰ کے مقابلہ میں صرف ایک درجہ ہو سکتا ہے۔ واضح رہے کہ ۱۶۰۔ ۱۰ کا مطلب یہ ہے کہ دس کو ۱۶۰ مرتبہ پے درپے ضرب دیا جائے۔ یہ ایسا بعید از امکان قیاس ہے کہ اعداد کی زبان میں اس کا اظہار بھی مشکل ہے۔ صرف ایک پروٹینی سالمہ کے اتفاقاً وجود میں آنے کے لیے تو اس پوری کائنات کے لیے مادہ کی کتنی مقدار مطلوب ہو گی؟

پروٹین ایمینو ایسڈ کے لمبے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں اور اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس طریقہ کی ہے، جس سے یہ سلسلے باہم ملیں۔ اگر یہ غلط شکل میں یکجا ہو جائیں تو زندگی کی بقا کا ذریعہ بننے کے بجائے، مہلک زہر بن جاتے ہیں۔

پروفیسر جے۔ بی۔ لینڈ (انگلستان) نے حساب لگایا ہے کہ ایک سادہ سے پروٹین کے سلسلوں کو لاکھوں طریقہ پر استعمال کرنے سے یکجا کیا جا سکتا ہے۔

یہ کسی طرح عقل میں آنے والی بات نہیں کہ ایک پروٹینی سالمہ کو وجود میں لانے کے لیے اتنے، سب بعید از امکان، اتفاقات بیک وقت صادر ہو جائیں۔ پھر یہ کہ پروٹین ایک کیمیاوی شے ہے، جس میں زندگی موجود نہیں ہوتی۔ ان میں زندگی کی حرارت تو جب ہی پیدا ہو گی، جب ان میں روح پھونکی جائے۔ صرف ایک عقل کل، ایک مہا ذہین، یعنی خدا، ہی یہ سوچ سکتا ہے کہ زندگی کی آماجگاہ بننے کے لیے اس طرح کا ایک سالمہ ہونا چاہیے۔ وہی اس سالمہ کو وجود میں لا سکتا اور زندگی بخش سکتا ہے۔

ہندوستان کے مشہور عالم اور سیاسی قائد ابو الکلام آزاد اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:

"نظام ربوبیت کا یہ پورا کارخانہ خود بخود وجود میں آجائے اور کوئی زندگی، کوئی ارادہ، کوئی حکمت اس کے اندر کارفرما نہ ہو؟ کیا

یہ ممکن ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کی ہر چیز میں ایک بولتی ہوئی پروردگاری، ایک ابھری ہوئی کار سازی موجود ہو اور کوئی کارساز موجود نہ ہو؟ کیا یہ محض اندھی بہری فطرت، بیجان مادہ اور بے حس الیکٹران کے خواص ہیں، جن سے پروردگاری و کارسازی کا یہ پورا کارخانہ ظہور میں آگیا ہے اور عقل و ارادہ رکھنے والی ہستی موجود نہیں؟ پروردگاری موجود ہے مگر کوئی پروردگار موجود نہیں، کارسازی موجود ہے مگر کوئی کارساز نہیں موجود، سب کچھ موجود ہے مگر کوئی موجود نہیں؟

عمل بغیر کسی عامل کے، نظم بغیر کسی ناظم کے، قیام بغیر کسی قیوم کے، عمارت بغیر کسی معمار کے، نقش بغیر کسی نقاش کے، سب کچھ بغیر کسی موجود کے نہیں، انسان کی فطرت کبھی باور نہیں کر سکتی۔ اس کا وجدان پکارتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔

جب وہ اپنے چاروں طرف زندگی اور پروردگاری کا ایک عالمگیر کارخانہ پھیلا ہوا دیکھتا ہے تو اس کی فطرت کی کیا صدا ہوتی ہے، اس کے دل کے ایک ریشہ میں کون سا اعتقاد سمایا ہوا ہوتا ہے؟ کیا یہ نہیں ہوتا کہ ایک پروردگار ہستی موجود ہے اور اس کی سب کرشمہ سازیاں ہیں؟" (ترجمان القرآن)

حقیقت یہ ہے کہ انسان فطرتاً یہ ماننے کو تیار نہیں کہ خالق کائنات بے حس، بے ارادہ، بے بس، بے شعور اور مجبور ہے، جبکہ اس کی کوئی تخلیق بے بسی، بے شعوری کا نتیجہ نہیں ــــ اسی لیے فطری طور پہ انسان نے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ دنیا خود بخود پیدا ہو گئی ہے۔

ذات و صفات کا دھندلا تصور رکھنے والا بے بصیرت اور مردہ ضمیر بھی ناکامیوں اور مایوسیوں میں دل کی گہرائیوں سے بے اختیار اللہ کو پکارتا اٹھتا ہے۔ کیا

دل کی یہ فطرت خالق و مخلوق کے فطری ربط کا پتا نہیں دیتی؟

یہ وہ فطری ہدایت ہے، جو انسانی سرشت میں داخل ہے۔ اسی کو قرآن نے کہا ہے "خلقہ ثم ہدیٰ"۔ خلقت کے ساتھ یہ ہدایت اس کی فطرت کا جز بنا دی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ انسان کا فطری تصور توحید ہے۔

ڈبلیو سمنٹ (پروفیسر واننا یونیورسٹی) لکھتے ہیں:

"اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انسان کے ابتدائی عمران و تمدن کے تصور کی اعلا ترین ہستی فی الحقیقت توحیدی اعتقاد کا خدائے واحد تھا اور انسان کا دینی عقیدہ اس سے ظہور پذیر ہوا۔ وہ پوری طرح ایک توحیدی دین تھا۔ یہ حقیقت اب اس درجہ نمایاں ہو چکی ہے کہ ایک سرسری نظرِ تحقیق بھی اس کے لیے کفایت کرے گی۔ نسلِ انسان کے قدیم پستہ قد قبائل میں اکثروں کی نسبت یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ابتدائی عہد کے جنگلی قبیلوں کی نسبت جس قدر تاریخی مواد مہیا ہوا ہے، ان سب کی تحقیقات ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتی ہے۔"

ارکٹک تہذیب کے قبیلوں کے روایتی آثار اور شمالی امریکا کے ذہنی تصورات کی چھان بین نے بھی بالآخر اسی نتیجہ کو نمایاں کیا ہے۔

انبیا کا طریقۂ تعلیم : انبیا کی تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ وہ انسان کی اسی فطرت کو جو اس کے شعور و وجدان کا جز ہے، پکارتے اور فطرت کو تفکر کے صحیح راستہ پر لگا کے حقیقت شناسی کی منزل اور ثواب و عتاب کی راہیں دکھاتے، دلوں میں خدا کی معرفت اور اس کا شوق پیدا کرتے۔

ان الذین یبلغون رسالات اللہ ویخشونہ ولایخشون احد الا اللہ وکفیٰ باللہ حسیبا

ترجمہ : اللہ سے ڈرتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے، جو انسان کو برائیوں

سے دور اور نیکیوں سے قریب کرتی ہے، کیونکہ خوفِ الہیٰ انسان کی تنہائیوں میں بھی اس کا محاسب و نگراں رہتا اور اس کو بری طرف جانے نہیں دیتا۔یہی وہ سرچشمہ ہے، جس سے نیکیوں کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ حضرتِ علیؑ کا ارشاد ہے کہ جو خدا سے ڈرتا ہے، وہ کبھی گناہ نہیں کرتا، اسی وجہ سے قران نے عزت کا معیار تقویٰ قرار دیا ہے۔

انبیا میں یہ صفت سب سے زیادہ پائی جاتی تھی اور یہ خدا پر کامل یقین کے بغیر نہیں ہو سکتی اور خدا پر کامل یقین اسی وقت پیدا ہوتا ہے، جب اسے ایک مانا جائے۔ کئی خدا یکساں طور پر نہ مرکزِ عقیدت بن سکتے ہیں، نہ عقلِ سلیم اسے قبول کرتی ہے، کیونکہ اگر ایک سے زیادہ ہیں اور ساتھ ساتھ ہیں تو ہر ایک اپنے وجود اور فعل و ارادہ میں برابر ہے، لہذا ایک دوسرے کے افعال ارادی کو روک نہیں سکتا۔ اس صورت میں نظام کائنات فاسد ہو جائے گا۔اگر فعل و ارادہ میں متحد ہیں تو ایک سے زیادہ کا وجود عبث اور ثبوت کا محتاج ہے۔اگر ایک کی موجودگی میں دوسرا پیدا ہو گیا تو یہ سلسلہ ختم نہیں ہو سکتا اور مخلوق سے زیادہ خالق ہو جائیں گے اور جب ایک دوسرے کے وجود کو روک نہ سکا تو ہر ایک قوت و طاقت میں برابر ہے، لہذا ایک دوسرے کے افعال کو بھی رد نہیں کر سکتا۔اس صورت میں نظامِ کائنات درہم و برہم ہو جائے گا، لہذا ماننا پڑے گا کہ وہ ایک ہے۔

خدا قدیم ہے : اس توحید سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا قدیم ہے، کیونکہ اس سے پہلے بھی کچھ ہے اور مخلوق ہے تو اس کا کوئی خالق بھی ہوگا اور خالق ہے تو دو خدا ہو گئے اور دو کا ہونا ناممکن ثابت ہو چکا۔

یہ قدامت کب سے ہے، اس کے لیے زمانہ کا تعین نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ آفتاب کے طلوع و غروب کا محتاج ہے، اس لیے دنیا کا وجود اس سے پہلے اور پھر اس کا کوئی خالق ماننا پڑے گا، لہذا زمانہ معین نہ ہو سکا اور ادائے مفہوم کے لیے الفاظ کا

ذخیرہ ناکافی ہو گیا تو انسان نے بے بس ہو کے کہہ دیا کہ ہمیشہ سے ہے۔

خدا متغیر نہیں : یہ جب ہی ہو سکتا ہے، جب کوئی چیز اسے متغیر نہ کر سکے۔ تغیر سے بری ہے تو جس طرح ہمیشہ سے ہے، اسی طرح ہمیشہ رہے گا اور جب اس سے پہلے کچھ نہ تھا تو ہر چیز کا خالق ہے۔

خدا قادر : قدرت والا ایسا کہ کچھ نہ ہو، وہ چاہے تو سب کچھ ہو جائے۔ اب اس کے صفات معین ہوئے کہ واحد ہے، قدیم ہے، قادر ہے اب سوال یہ ہے کہ جس کے صفات یہ ہیں، وہ خود کیا ہے۔

خدا مجسم نہیں : اگر خدا مجسم ہے تو بغیر جگہ کے ٹک نہیں سکتا، لہذا جگہ اس سے پہلے ہونا چاہیے تو اس کا کوئی پیدا کرنے والا بھی ہونا ضروری ہے، یہی صورت عرض و جوہر میں ہے۔ اگر کوئی جسم نوری یا ناری ہے، جس کے لیے جگہ ضروری نہ ہو، تو ایسے جسم کو اپنے وجود میں آنے کے لیے محدود ہونا پڑے گا اور محدود ہونے کے بعد ہر وقت، ہر چیز اور ہر جگہ کا علم بغیر ذریعہ کے نہیں ہو سکتا۔ اگر ذرائع کا محتاج ہوا تو قادر نہیں اور قادر نہیں تو خالق نہیں اور خالق نہیں تو اللہ نہیں، لہذا ماننا پڑے گا کہ وہ جسم نہیں، عرض نہیں، جوہر نور میں نہیں، نار نہیں، کیف نہیں، کم نہیں، کوئی چیز نہیں، کسی چیز کی طرح نہیں۔

خدا مرکب نہیں : اگر خدا مرکب ہو تو اس کے اجزائے ترکیبی اور ایک ترکیب دینے والے کا پہلے سے موجود ہونا لازم آئے گا۔ اس صورت میں ایک خالق اور چند مخلوق کا وجود اس سے قبل ہونا چاہیے اور جسم و جسمانیات سے منزہ ہے۔ ایسی صورت میں دکھائی نہیں دے سکتا۔ اب صفاتِ سلبیہ معین ہوئے کہ جسم نہیں، مرئی نہیں، مرکب نہیں، متغیر نہیں، حادث نہیں، یعنی وہ ایسی ذات نہیں، جس میں صفات پائے جاتے ہوں، بلکہ مجمع جمیع صفات کمال وجود کا نام اللہ ہے۔

خدا علم و قدرت : ان تمام صفتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ ان سب پر

اس کی دو صفتیں محیط ہیں : ایک علم ، دوسرے قدرت ، یعنی ان تمام صفات میں ہر صفت یا اس کے علم کا نتیجہ ہے یا قدرت کا ۔ یہ تصور ایک ازلی و ابدی علم و قدرت کا ہے ۔ یہی عالم مخلوق کا خالق ، دائرۂ وجود کا مرکز ، نظمِ کائنات کا ناظم ، احاطۂ ہستی کا محیط ، ہر زبان و مکان ، ہر حرکت ، ہر سکون میں موجود ، عرش پر ساکن ، زمین پر متمکن شش جہد پر محیط ، رگِ گردن سے قریب ، ہر چیز کو دیکھتا ہے اور اس کی خبر رکھتا ہے یہی وہ خدا ہے ، جو تنہائیوں میں بھی انسان کا نگراں ہے اور اس کی گرفت سے کوئی باہر نہیں ۔



مولانا محمد باقر شمس

ظہورِ قدسی

حضرت آدمؑ کے انکار سے ابلیس مقامِ قدسی سے نکلا، بزمِ ملائکہ سے خارج ہوا نگاہِ قدرت سے گرا اور ہمیشہ کے لیے ملعون قرار پایا۔ اس نے بھی ٹھان لیا کہ آدمؑ اور ان کی اولاد کو چین سے نہ بیٹھنے دے گا۔ آخر آدمؑ کو جنت سے نکلوا کے دم لیا۔ دنیا میں بھی چین سے نہ رہنے دیا، فراقِ حوا میں سرگرداں و گریاں رکھا، ہابیل کو قابیل سے قتل کرا دیا، نوحؑ پر پتھر برسوائے، دنیا پر عذاب نازل کرایا، ابراہیمؑ کو آگ میں ڈلوایا، عاد و ثمود کو برباد کیا، لوطؑ کی امت کو ہلاکت میں مبتلا کیا، زکریا پر آرا چلوایا، موسیٰؑ کے پیچھے فرعون کو لگایا، عیسیٰؑ کو سولی تک کھینچ کے لایا۔ نیکیوں کا آفتاب ڈوبا، جہالت کی تاریکی پھیلی، قتل و غارت کا دور آیا، فسق و فجور کی جوانی نکھری، ظلم و ستم کی حکومت قائم ہوئی، انسانیت مردہ اور شرافت فرسودہ ہوئی، ہمدردی، خلق، ایثار معدوم ہو گیا ــــ علم بزدلی، صبر کمزوری، صنمِ خدا، کعبہ بتخانہ بن گیا ــــ مصر، ایران، ہندوستان، یونان قدیم تہذیب و تمدن کے مراکز وحشت و بربریت کے طوفان میں بہ گئے اور پہنائے عالم میں شیطان رقص کناں تھا کہ عدلِ خداوندی متقاضی ہوا۔ دریائے رحمت نے جوش مارا اور اس ماہ میں آفتابِ نبوی بطنِ آمنہ سے طالع ہوا۔ رحمتِ الہیٰ نے آغوش میں لے لیا، عظمت و جلال کبریائی نے چتر لگایا۔ آدمؑ کا علم، نوحؑ کی ہیبت، ابراہیمؑ کی خلت، داؤدؑ کی قوت، سلیمانؑ کی شوکت، موسیٰؑ کی مناجات عیسیٰؑ کا زہد، ایوبؑ کا صبر، یوسفؑ کا حسن، گرد پھرنے لگا۔ شیطان چیخ اٹھا، قیصر و کسریٰ کے کنگرے زمین پر اتر آئے، بحیرۂ ساوا ہوا ہو کے بلند ہوا۔ فارس کا آتشکدہ حرارت چھوڑ کے الگ ہو گیا ــــ گویا اربعہ عناصر نے کروٹیں بدل کے تعمیر کا اشارہ کیا۔

ایامِ رضاعت سے معجزات کا ظہور شروع ہوا۔ بچپنے ہی سے بلند کرداری کا سکہ چلنے لگا۔ جوانی میں سنگِ اسود کی تنصیب نے اصابتِ رائے اور حلف الفضول نے انسانی ہمدردی کا نقش دلوں پر بٹھا دیا۔ پختہ عمری میں غارِ حرا میں وحی آسمانی نے علم لدنی کا تاج سر پر رکھ کر، جس کے کنگروں سے نورِ عرفانی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں ـــ حلم و وقار، سخاوت و ایثار، زہد و قناعت، علم و شجاعت کی زرہ زیبِ جسم کی، خلقِ عظیم کی تلوار ہاتھ میں دی، جس سے خون کی بوندوں کے بجائے، آبِ حیات کے قطرے ٹپک رہے تھے ـــ نصرتِ خداوندی ہمرکاب ہوئی وانذر عشیر تک الاقربین کے نقارہ پر چوٹ پڑی، نقیبِ فاتو بسورۃ مثلہ نے صدائے ہل من مبارز بلند کی، گردِ راہ چشمِ بصیرت کا سرمہ بنی، انسانیت کے جسمِ مردہ نے کروٹیں بدلیں اور مقبروں سے دل دھڑکنے کی صدا آنے لگی۔

وہ قوم جو قبیلوں میں منقسم اور باہم متحارب تھی، برادری اور برابری کے رشتۂ اتحاد میں منسلک ہو کے ایک مرکز پر آگئی اور انسانیت کی علمبردار بن کر ساری دنیا کو اخوت و مساوات کا سبق دینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پہاڑوں کو پھاندتی، میدانوں کو لپیٹتی، سمندروں کو روندتی دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک پہنچ گئی۔ کبھی اس کی تکبیر کی آواز افریقا کے تپتے ہوئے صحراؤں سے سنی گئی، کبھی اس کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بحرِ ظلمات سے اور کبھی سومنات سے آئی ـــ اور وہ قوم جو بت گر تھی، بت شکن جو غلام تھی، شہنشاہ بن گئی اور جہالت کی تاریکی سے نکل کے چار دانگ عالم میں علم کی شمعیں لے دوڑی اور وہ نور جو فاران کی چوٹیوں پر چمکا تھا، ہمالیہ کی چوٹیوں سے برسنے لگا اور سارا عالم جگمگا اٹھا۔

مولانا محمد باقر شمس

تخلیقِ زبان کا فلسفہ

محترمی فرمان فتحپوری صاحب!

اس مضمون کو میں نے بڑے غور سے اور بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس میں کچھ وہ باتیں ہوں گی، جو لسانیات کے سلسلہ میں عام طور پر کہی جاتی ہیں، مگر میں نے یہ دیکھا کہ اس میں شروع سے آخر تک سب نئی باتیں ہیں۔ لسانیات کے مسئلہ پر یہاں بالکل نئی اور اچھوتی نظر ملتی ہے، جو بہت ہی زیادہ قابل قدر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے زیادہ سے زیادہ اشاعت دی جائے تاکہ لسانیات میں دلچسپی رکھنے والے لوگ اس پر غور کریں اور دیکھیں کہ کہاں تک اس علم میں اس مضمون کی وجہ سے اضافہ ہو سکتا ہے۔ صوت اور الفاظ کا تعلق یہاں خاص توجہ کے قابل ہے جو لسانیات کی اس شاخ کے مسائل پر خاصی روشنی ڈالتا ہے، جس کو phonetics کہتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مضمون کی کن الفاظ میں تعریف کروں، میں اس درجہ اس سے متاثر ہوا ہوں۔"

(ڈاکٹر محمد احسن فاروقی)

آلاتِ اصوات : جس ذی روح کے پھیپھڑا، حلق، تالو، زبان، دانت، ہونٹ یا منقار ہے، وہ مختلف آوازیں نکالتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اعضا آلاتِ اصوات ہیں۔ شاما کا نغمہ، کوئل کی کوک پپیہے کی پی کہاں، کوے کی کائیں کائیں، کتے کا بھونکنا، بلی کی میاؤں، شیر کی گرج، ہاتھی کی چنگھاڑ کا صوتی تفاوت بتاتا ہے کہ

ان کے آلاتِ صوت کی ساخت میں فرق ہے۔

فطری حالتوں کی آوازیں : ایک ہی جانور کی مختلف حالتوں کی آوازیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ چڑا جب چڑیا کے پاس ہوتا ہے، اس وقت اس کی آواز میں لگاوٹ کا انداز ہوتا ہے۔ اس کو پکڑ لیجیے تو چیں چیں کرنے لگتا ہے۔ مرغی بچوں کو دانہ پر بلاتی ہے تو اور آواز ہوتی ہے، بلی یا چیل کو دیکھ کے دوسری آواز نکالتی ہے۔ کڑکڑانے کی آواز اس کی مستی کو ظاہر کرتی ہے۔ کتے کی آواز حملہ کرنے اور شکست کھا کے بھاگنے کی بالکل الگ ہوتی ہے۔

معلوم ہوا کہ جانوروں کی قلبی کیفیت ان کی آوازوں سے ظاہر ہوتی ہے، جس میں ان کے ارادہ کو دخل نہیں ہوتا۔ بتقاضائے فطرت مختلف حالتوں میں مختلف آوازیں ان کے منہ سے نکل جاتی ہیں، اس سے دوسرے جانور بھی ان کی حالت کو سمجھ لیتے ہیں۔ ایک مرغی خوف کی حالت میں جب چیختی ہے تو تمام مرغیاں اس کی ہم آواز ہو جاتی ہیں، لیکن کڑکڑانے میں کوئی مرغی اس کی شریک نہیں ہوتی ان میں اتنا شعور نہیں کہ وہ آوازوں کو اپنی فطری حالت کے اظہار کا ذریعہ سمجھ سکیں

جانوروں کی کوئی زبان نہیں : اسی ذہنی جمود اور شعوری فقدان سے وہ اپنے لیے کوئی زبان نہ بنا سکے۔ بعض حالتوں کے اظہار تک ان کی آوازیں محدود رہیں، حالانکہ وہ مختلف آوازوں سے مرکب الفاظ بولنے پر قادر ہیں۔ لب و دندان رکھنے والے جانوروں میں بلی سب سے زیادہ آواز نکالتی ہے۔ میں نے اس کی مختلف حالتوں پر غور کیا ہے ... آؤ ... اؤں ... غاؤں ... اے آؤں ... میاؤں صاف کہتی ہے۔ اتنے الفاظ بولنے پر بھی اس کی کوئی زبان نہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انھیں کیا معلوم کہ جانور بات نہیں کرتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ دو جانور آپس میں بات چیت کر رہے ہوں یا کبھی جانوروں کے غول میں کوئی جانور مسلسل اظہارِ خیال کر رہا ہو اور سب سکون سے سن رہے ہوں۔ بیشک بلبل

محبت کی ہزاروں داستانیں سناتی ہے اور شاما کے نغمۂ سحری میں تسلسل ہوتا ہے، مگر اس کے گرد و پیش کا سناٹا کہتا ہے کہ عالم کیف و مستی میں اپنی مخاطب آپ ہے۔ جانور اپنے ہم جنس کے نغمہ سے بھی لذت اندوزی کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

شام کو بسیرے کے لیے چڑیاں کسی درخت پر اکٹھا ہوتی ہیں۔ لتنے بڑے مجمع کی بے ترتیبی بتاتی ہے کہ ان کی زبان ہوتی تو اس وقت یہ مجمع اتنا بے ربط نہ ہوتا۔ کوئی چڑیا چوں چوں کر کے پھدکی اور جدھر دم تھی، ادھر منہ کر لیا، کبھی دم ہلا کے اس شاخ سے اس شاخ پر جا بیٹھی۔ وقتِ واحد میں اتنی چڑیاں بولتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہہ رہی ہیں۔ ذرا سا کھٹکا ہوا اور سب پھرا مار کے اس درخت سے اس درخت پر جا بیٹھیں، پھر نہ اس کھٹکے کا سبب معلوم کرنے کی فکر، نہ اس کو دفع کرنے کا خیال۔ وہاں پھر وہی سابقہ حالت عود کر آئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان میں حافظہ اور عقل کی بے اتنا کی ہے۔

زبان کس طرح بنی : صرف انسان ایسی ذہین مخلوق ہے، جو دریا بندۂ معقولات ہے، تجربے کرتا اور تجربے پر تجربے کرتا چلا جاتا ہے، کسی منزل پر رکتا نہیں۔ اس کی اسی صلاحیت نے مختلف حالتوں میں فطری طور پر منہ سے کچھ آوازیں نکل جانے کو اظہار جذبات کا ذریعہ سمجھ لیا اور ادائے مفہوم کا ایک طریقہ اس کی سمجھ میں آگیا اور اس پر اس نے الفاظ و معانی کی ایک دنیا آباد کر دی۔

زبان نقالی ہے : انسان کے لیے فطرتاً سب سے زیادہ آسان نقالی ہے۔ اس نے خیالات، جذبات اور مادیات کی نقالی مرکب آوازوں سے شروع کی، جسے ہم "لفظ" کہتے ہیں۔ مجھے آدمی کی اس فطری صلاحیت کا علم اس طرح ہوا کہ ہندوستان میں میرا تین، چار برس کا ایک لڑکا تالاب پر گیا۔ وہاں اس نے پہلے پہل ایک بڑا کچھوا دیکھا۔ مجھ سے آکے کہنے لگا کہ آج اس نے تالاب پر "پھودا" دیکھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ کچھوے کو کہہ رہا ہے اور اندازہ ہوا کہ اس نے اس کی صورت کی نقالی اپنی آواز سے بہت اچھی کی اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ انسان نے اسی طرح پہلے اپنی آوازوں سے چیزوں

کی نقالی کی، پھر وہی نام رکھ دیا۔

افلاطون کی رائے : لفظ اپنی آواز کے اتار چڑھاؤ سے اپنے معنی آپ ادا کرتا ہے حکما میں افلاطون اور میر باقر داماد اور ادبا سلیمان ابن عباد ضمیری کی یہی رائے ہے۔ بعد کو اس پر بحثیں چھڑ گئیں کہ اگر ایسا ہوتا تو ہر شخص لفظ کو سمجھتا، کسی کو سیکھنے یا لغت میں دیکھنے کی ضرورت نہ ہوتی، پھر لغاتِ اضداد اپنے معنی کیونکر ادا کر سکتے ہیں

تلفظ میں مفہوم نظر آنے کی وجہ یہ ہے کہ مفہوم پہلے سے ذہن میں ہوتا ہے لفظ سنتے ہی اس کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً "برق" ابر میں ایک چمکتی اور لچکتی ہوئی سنہری لکیر اور برق شاعر ہمارے دماغ میں محفوظ ہیں۔ ہم اس لفظ کا تصور جس معنی میں کرتے ہیں، وہی شکل سامنے آجاتی ہے۔

لفظ و معنی کا تعلق محلِ استعمال سے : یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ لفظ و معنی کا صوتی تعلق استعمال کا تابع ہوتا ہے۔ مثلاً:

وہ آئیں رقیبوں کو لیے ساتھ، غضب ہے!

---- ---- ---- ----

وہ آئیں گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے

"وہ آئیں" دونوں میں ہے، لیکن مفہوم دونوں کا الگ الگ ہے۔ دوسری مثال ملاحظہ ہو:

ہائے! میں کیا کروں، کہاں جاؤں
ہائے! اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ہائے! اس چار گرہ کپڑے کی قسمت، غالب!
ہائے! وہ حسن، وہ شباب کے دن
ہائے! وہ کس ٹھسک سے چلتے ہیں

"ہائے" سب میں ہے، لیکن ہر ایک کا مفہوم محلِ استعمال سے بدل گیا۔

معنی کا تعلق لہجہ اور طرزِ ادا سے: لہجہ اور طرزِ ادا بھی معنی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، لیکن وہ بھی محلِ استعمال کے تابع ہیں۔ مفہوم محلِ استعمال، مفہوم کا تابع اور انھیں کی ہم آہنگی کلام میں تاثیر پیدا کرتی ہے۔ غیظ و غضب، کرب و اذیت، خوشی و مسرت میں جو الفاظ نکلتے ہیں، ان کا لہجہ اور طرزِ ادا اس کو بتا دیتا ہے ایک عرب یا انگریز رزمیہ داستان یا حزنیہ اشعار پڑھ رہا ہو تو ہم اس کا موضوع سمجھ لیں گے۔

پروفیسر لیمبورن نے اس کے امتحان کے لیے دس، بارہ برس کی عمر کے بچوں کو، جو اپنی مادری زبان انگریزی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے تھے، یونان کے مشہور شاعر ہومر کے اشعار سنائے تو انھوں نے بتا دیا کہ ان میں جنگ و جدل کا ذکر ہے۔ اس کے بعد اٹلی کے شاعر ورجل کے شعر پڑھے۔ انھوں نے کہا کہ کوئی شخص کسی کی موت پر نوحہ کر رہا ہے، اس کی وجہ یہی تھی کہ طرزِ ادا نے مفہوم اتنا واضح کیا کہ زبان نہ جاننے والوں نے بھی مفہوم کو بھانپ لیا۔

دلی جذبات ادا ہونے میں نہ صرف آلاتِ صوت کام کرتے ہیں، بلکہ تمام اعضا پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ چہرہ کا رنگ، آنکھوں کی گردش، ہاتھ کا اشارہ، سب مفہوم کی تصویر کشی کرتے ہیں۔

میر انیس ایک دفعہ الہ آباد مرثیہ پڑھنے گئے۔ تمام دفاتر بند ہو گئے۔ ہر طبقہ کے لوگ سننے آئے، ان میں ایک انگریز بھی تھا۔ پروفیسر ذکا اللہ نے مجلس کے بعد اس سے پوچھا،

"تم نے کیا سمجھا؟" کہا،

"ایک آدمی جادو کر رہا تھا اور جو اثر چاہتا تھا، وہ مجمع پر پیدا کر دیتا تھا۔"

مشہور ہے کہ میر انیس کے بیٹے میر خورشید علی نفیس نے ایک مجلس میں یہ مصرع اس طرح پڑھا کہ پوری مجلس مڑ کے دیکھنے لگی:

وہ گرد اٹھی ، وہ جگر بند بوتراب آیا

اس کی ایک مثال نغمہ ہے ۔ میدان کارزار کے ترانے ، محفل عیش کے گانے مجلس غم کے راگ الگ الگ ہیں ۔ اگر غم انگیز مضامین جنگی ترانوں میں گائے جائیں تو کوئی اثر نہ ہوگا۔

دوسری زبان نہ سمجھنے کی وجہ : دوسری زبان کے الفاظ نہ سمجھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لہجہ سے ہمارا سامعہ مانوس نہیں ، ہم اس کی صوتی کیفیت کا پورا اندازہ نہیں کر سکتے ، لیکن وہ کیفیت جو تمام انسانوں میں مشترک ہے ، ان کے اظہار میں جو آوازیں نکلتی ہیں ، وہ ہم سمجھ لیتے ہیں ۔

اپنی زبان کے بعض الفاظ نہ سمجھنے کے وجوہ : خود اپنی زبان کے بعض الفاظ نہ سمجھ سکنے کی کئی وجہیں ہیں ۔ بہت سی چیزوں اور کیفیتوں کے نام دوسری زبان سے آئے ، کیونکہ وہ اتفاق سے ہماری زبان میں نہ تھے یا اتنے بہتر نہ تھے اور وہ اپنے اصلی تلفظ کے کچھ حصہ کو ضائع کر کے ہماری زبان کی ساخت کے موافق بنے ۔ ان میں وہ صوتی و معنوی ہم آہنگی باقی نہیں رہی ۔ اگر اس کی اصل کو تلاش کیجیے تو اس کا تلفظ مفہوم سے زیادہ مشابہ ہوگا ۔ مثلاً ہم "آگ دہکنا" کہتے ہیں ۔ یہ ہندی سے لیا گیا ہے ۔ اس میں آگ کی کیفیت کو "دھدھکنا" کہتے ہیں ۔ یہ تلفظ اس کیفیت کا زیادہ محاکاتی ہے ۔

جب فصیح و غیر فصیح کا فرق محسوس ہوا تو الفاظ میں تراش خراش کی ۔ اس سے معنی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ، صوتی ہیئت میں فرق آگیا ۔ اس کی صوتی و معنوی مطابقت کی طرف توجہ نہیں رہی ، کیونکہ مفہوم ذہن میں بیٹھ چکا تھا ، معنی کا ادراک صوتی نقالی پر منحصر نہ تھا ۔ جس طرح اشارہ سے بھی مطلب ادا ہوتا ہے ، اسی طرح ان اصوات میں اشاراتی نقالی رہ گئی ۔ اب اگر ہم تمام الفاظ کے صوتی اتار چڑھاؤ میں اس کے معنی کی پوری نقل دیکھنا چاہیں تو ہرگز نظر نہ آئے گی ۔

یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ لفظ صوتی حیثیت سے تنہا اپنے مفہوم کی ایسی کامل

نقالی نہیں کر سکتا کہ ہم بغیر قرینے کے سمجھ لیں ۔ ہم نے ۔ پھودے ۔ کو ۔ کچھوا ۔ اس وجہ سے سمجھا کہ اس کے ساتھ تالاب کا ذکر موجود تھا ۔ جس چیز کو ہم نے کبھی نہیں دیکھا ، اس کا نام کتنا ہی موزوں ہو ، ہم ہرگز نہیں سمجھ سکیں گے ۔ عنقا کا کوئی صوری تصور ہمارے دماغ میں نہیں ہے ۔ ہم اسے معدوم شے کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں ۔ اگر اس کا وجود کبھی تھا تو آج اس لفظ کے سننے سے اس کی تصویر سامنے کیوں نہیں آتی ؟ جب آدمی نے کسی چیز کی نقل اپنی آواز سے اتاری ہو گی تو کوئی قرینہ بھی ضرور ہو گا ، جو یہ متعین کرتا ہو گا کہ اس آواز سے یہ شکل مراد ہے اور ہم بغیر کسی قرینے کے صرف لفظ و معنی پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں ۔

ایک غلطی ہم یہ بھی کرتے ہیں تمام الفاظ کو ایک ہی ترازو میں تولتے ہیں ، حالانکہ ان کی مختلف قسمیں ہیں ۔ ان میں اسما بھی ہیں اور افعال و حروف بھی ۔

حرف کی نہ صوتی ہیئت مکمل ہے ، نہ کوئی مستقل معنی ہیں ۔ افعال خود کوئی چیز نہیں ۔ ان کی اصل اسم ہے ۔ اس سے فعل بنانے میں تغیر ہوا اور وہ صوتی کیفیت باقی نہیں رہی ۔ اسم کی تین قسمیں ہیں :

(۱) اسمائے اصوات (۲) اسمائے کیفیات (۳) اسمائے مادیات ۔

اصوات کی نقل میں انسان کو سب سے زیادہ کامیابی ہوئی ۔ جس آواز کی نقل اتارنا چاہی ، وہی آواز اپنے منہ سے نکال دی اور وہی اس کا نام رکھ دیا ۔ جیسے : ٹن ٹن ، دھم دھم ، گھم گھم ، ٹپ ٹپ وغیرہ ۔

اس کے بعد اسمائے کیفیات کی نقالی میں کامیابی ہوئی جیسے : سرسرانا ، پھڑپھڑانا ، تھرتھرانا ، لپکنا ۔ ان مختلف حالتوں اور کیفیتوں کے صحیح مفہوم کو ذہن میں اتارنے کے لیے نقالی کی صلاحیت پر پورا زور دینا پڑا اور چونکہ ان حالات کے اظہار کا تعلق ہر شخص سے تھا ، لہٰذا جو شخص جس کیفیت کو زیادہ بہتر ادا کر سکا ، وہی نقل اس کی مقبول ہوئی اور وہی اس کا نام پڑ گیا ۔

اسمائے مادیات کی دو قسمیں ہیں :

(الف) معرفہ

(ب) نکرہ

اسمائے معرفہ اپنے مسمیٰ کی تکمیلی حالت سے پہلے معین ہو جاتے ہیں، صوری و صوتی مشابہت ملحوظ بھی نہیں ہوتی۔ وہ مفہوم کے تصور کے تابع ہیں۔ "کے" اور "جم" میں اس وقت شوکت نظر آتی ہے، جب ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ یہ فارس کے دو عظیم المرتبت فرمانروا ہیں۔

اسمائے نکرہ بیشک اپنے مسمیٰ کی تکمیلی حالت کے بعد معین ہوئے ہیں۔ ان میں بعض نام اپنے مسمیٰ کی پوری نقل ہیں۔ جیسے: گنبد، بھالو، تیر، گولا، جھولا وغیرہ۔

بعض نام کامل نقل نہیں ہوتے۔ جیسے: زمین، آسمان، پانی، مٹی وغیرہ۔

بات یہ ہے کہ مادی چیزوں کی نقل آواز سے اتارنا، ایک قسم کی پھبتی ہے۔ آج زبان کی ترقی کے دور میں استعارہ سے پھبتیاں کستے ہیں۔ لیکن جب زبان اس قابل نہ تھی تو اس وقت یہ پھبتی آواز کے چڑھاؤ اتار تک محدود تھی، جس طرح وہی پھبتی پھبتی ہے، جو بیساختہ زورِ طبیعت میں زبان سے نکل جاتی ہے ___ اور جہاں یہ فطری صلاحیتِ قوت سے کام نہیں کرتی، وہاں کامیابی نہیں ہوتی۔ یہی کمزوری ان چیزوں کے نام میں کارفرما ہے، جو مسمیٰ کی کامیاب نقل نہیں ہیں۔

مادی چیزوں میں آواز سے نقالی مشکل بھی ہے اور چونکہ وہ ایک محسوس وجود رکھتی ہیں، اس وجہ سے غیر موزوں نام بھی ان کے جاننے اور پہچاننے کے لیے کافی ہو گئے۔ اس کے علاوہ زبان کی ترقی کے ساتھ لفظ میں اتنے تغیرات ہو گئے کہ ان کی صوتی کیفیت محفوظ نہ رہی اور معنی کثرتِ استعمال سے محفوظ رہ گئے۔

بہت سی چیزوں کے نام انسانی صنعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا جو نام صانع نے تجویز کیا، اسی سے سب نے جانا، خواہ اس میں صوتی مشابہت ہو یا نہ ہو، یا کسی چیز کو سب سے پہلے جس نے دریافت کیا، اس کا جو نام اس نے بتایا، وہی

مشہور ہو گیا۔

مختلف المعنی اور متعدد المعنی الفاظ ضرورت فرض کیے گئے ہیں ۔ محل استعمال کے ذرا ذرا سے فرق میں نئے نئے الفاظ کا وضع کرنا ممکن نہ تھا ، انھیں لفظوں میں نئے نئے مفہوم سماتے رہے اور صوتی تعلق کمزور ہوتا گیا ، لیکن ایسے الفاظ کو کسی ایک معنی سے مشابہت ضرور ہوتی ہے ، جیسے آہنگ ، جس کے معنی نغمہ و ارادہ ہیں ، کو نغمہ سے صوتی مشابہت حاصل ہے ۔

علمی نام : علم و تمدن کے دور میں تشبیہ و استعارہ کے سہارے بہت سے نام بنے : شمع کے ڈورے کی آگ کو گل اور اس کو کاٹنے کے آلہ کو گلگیر ، بڑے لٹھے کو شہتیر ، دو ناموں کو جوڑ کر " گل آب " (گلاب) ، " سورج مکھی " ، " کھٹ مل " ، " آس مان " (آسمان) ، علاماتِ فاعلیت سے نگا اچکا ، مچھیرا ، علاماتِ ظرفیت سے عیدگاہ ، گلاب باڑی ، شمعدان ، ان سب میں صوتی مشابہت کا کوئی خیال نہیں کیا گیا ۔ اس لحاظ سے الفاظ کی چار قسمیں ہوئیں :

الف ۔ وہ نام ، جن کی آواز کسی کی صورت کی نقل ہیں ۔ جیسے : گنبد ، بھالو ، تیر وغیرہ ۔

ب ۔ وہ نام ، جن کی آواز معنی کی تصور کی تابع ہے ۔ جیسے : کے اور جم ۔

ج ۔ وہ نام ، جن کی آواز ان کی صورت کے مطابق نہیں ۔ جیسے : زمین ، آسمان ، مٹی وغیرہ ۔

د ۔ وہ نام ، جو کسی اصول اور قاعدہ کے ماتحت بنائے ۔ جیسے : گلگیر ، کفگیر ، شمعدان وغیرہ ۔

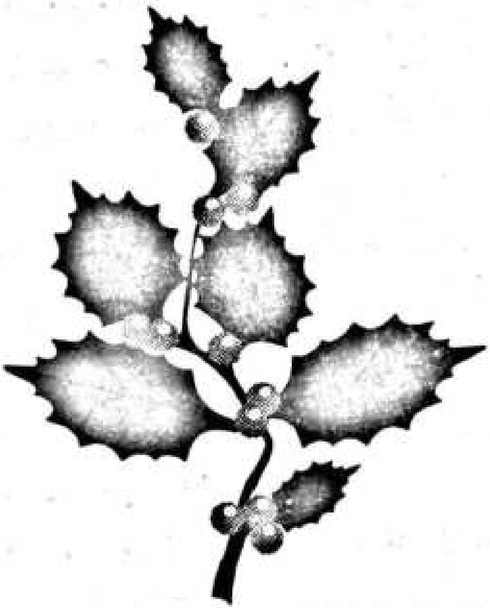
یہ تقسیم ہم نے زبان کے اس دورِ ترقی میں کی ہے ، لیکن ابتدا میں انسان نے آوازوں ، کیفیتوں اور چیزوں کی نقالی صرف آواز سے کی اور مدتوں وہ اسی طرح کام چلاتا رہا ۔ اس کے بعد اس نے وہی نام رکھ دیا اور صدیوں اسی منزل میں رہا ، لیکن اس کی ذہانت ، اس کا ادراک ، اس کا شعور ، اس کی قوتِ اختراع یہیں ختم نہیں ہو

سکتی تھی ۔ نام رکھنے کا گُر اسے معلوم ہو گیا تھا۔ اس کی طبعی ضرورتوں نے بہت سے نام تجویز کرنے پر مجبور کیا۔ سونے جاگنے، کھانے پینے کی حالتوں کے نام بھی اس نے رکھے، من و تو کا فرق واضح کرنا بھی زندگی کی اہم ضرورتوں میں سے تھا، اس کے لیے بھی اس نے الفاظ بنائے اور صدیوں اسی طرح کام چلاتا رہا۔ اس میں صرف ناموں سے بعض طویل المعنی فقرے بھی بن گئے ہوں گے، جن کی یادگاریں آج تک زبان میں موجود ہیں، مثلاً کفن کو چرانے والا کفن چور یا گرہ کٹ ۔ اسم فاعل بنانے کا یہ قاعدہ زبان کے ابتدائی دور کا معلوم ہوتا ہے۔

چونکہ انسان کا ذہن ایک نقطہ پر نہیں ٹھیرتا، آگے بڑھنا اس کی فطرت ہے، ادائے مطلب کے لیے اس نے آواز سے کام لیا۔ جب یہ گُر سمجھ میں آگیا تو ہر آواز کو ایک مفہوم کے لیے معین کر لیا۔ اس سے نام رکھنے کا طریقہ ہاتھ آگیا۔ جب ناموں سے بات کرنے پر قادر ہو گیا تو اس کو زبان میں ایک خلا اور بے ربطی کا احساس ہوا اس کو دور کرنے کے لیے بعض جگہ لفظوں کو آگے پیچھے کر کے تسلسل پیدا کر لیا، جیسے چینی زبان، جس میں تمام الفاظ ایک حیثیت کے ہیں، اسم، فعل، حرف کا کوئی فرق نہیں ۔ ہر لفظ الگ، مستقل، آزاد، غیر تغیر پذیر ہے، صرف اس کو آگے پیچھے کر دینے سے فقرے بنتے چلے جاتے ہیں ۔ یہ زبان یک لفظی کہی جاتی ہے اور دورِ اول کی زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ بعض جگہ لفظوں کو جوڑنے کے لیے کسی لفظ کے اجزا ملا دیتے ہیں اور اصل مادہ وہ اپنی صورت پر باقی رہتا ہے، جیسے ترکی زبان ۔ بعض میں حروف کے اختلاط سے ربط و تسلسل پیدا ہوا۔ یہ تصریفی زبانیں کہلاتی ہیں، جیسے عربی فارسی وغیرہ اور اسی سے زبانوں کے خاندان کا پتا لگایا گیا ہے ۔۔ لیکن دنیا کی تمام زبانوں کو صرف تین یا چار زبانوں کی نسل قرار دینا قرائن عقلیہ کے صریحی خلاف ہے بلکہ ہر خطہ کی زبان اپنے وجود میں مستقل ہے ۔ دوسری زبان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ آمد و رفت اور میل جول بڑھا اور ہر زبان نے اپنے سے بہتر اور قریب تر زبان سے بہت کچھ لیا۔ اس طرح بہت سی زبانوں نے ایک ایسا

اشتراک پیدا ہو گیا کہ وہ ایک خاندان کی سمجھی جانے لگیں ۔ اگر دنیا کی تمام زبانوں کا وقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو ہر زبان میں ایسی انفرادی خصوصیتیں ملیں گی ، جو اس کے مستقل وجود کو ثابت کریں گی ، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں زبان سے زبان کے پیدا ہونے کا کلیتہً منکر ہوں ۔ یقیناً ایسی بہت سی زبانیں ہیں ، جو کسی ایک زبان سے نکلی ہیں ، لیکن انھیں چار میں محدود کر دینا درست نہیں ۔

(نگار ، پاکستان ـــ جنوری ، فروری ، ۱۹۶۸ء)



مولانا محمد باقر شمس

تخلیقِ غنا کا فلسفہ اور اس کی شرعی حیثیت

صنعتِ غنا : موسیقی فلسفیوں کی ایجاد ہے۔ انسان کے ذہن سے جتنی آوازیں نکلتی ہیں، ان میں سے سات آوازوں سا، رے، گا، ما، پا، دھا، نی کو منتخب کرنا اور ان کی تالیف سے نغمات پیدا کرنا اور ان میں زیر و بم سے جان ڈالنا، فلسفیوں کے سوا اور کسی سے ممکن نہیں۔ یونان میں اس وقت تک کوئی فلسفی کامل نہیں سمجھا جاتا تھا، جب تک وہ موسیقی میں بھی کمال حاصل نہ کر لے۔

مسلم فلاسفہ میں ابو النصر فارابی، جو ارسطو کے بعد معلم ثانی کہا جاتا ہے، اعلا درجہ کا موسیقار اور الغوزہ کا موجد ہے۔

ہندوستان میں امیر خسرو ایسا علامۂ روزگار اور صوفی صافی طینت موسیقی میں ایسا کامل تھا کہ ہندوستانی اور عجمی موسیقی کے امتزاج سے ایک نئی موسیقی ایجاد کی اور بہت سے راگ ایجاد کیے۔ جیسے: پروا، غالا، زیلف وغیرہ۔

غایتِ غنا : فلاسفر کہتے ہیں کہ غنا لحن موزوں ہے۔ اگر یہ اپنی صنعت میں کامل ہے تو دلوں میں اتر جاتی ہے، بات کے اثر کو بڑھا دیتی ہے اور وجد کا عالم طاری کر دیتی ہے، دلوں کے مخفی رازوں کو باہر نکال دیتی ہے، اخلاقِ فاضلہ سے نزدیک اور اخلاقِ ذمیمہ سے دور کر دیتی ہے۔ افلاطون موسیقی کی تعلیم کو لازمی قرار دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ اس سے دل کو سکون حاصل ہوتا ہے، طبیعت میں موزونیت پیدا ہو جاتی ہے، سکونِ قلب بڑھ جاتا ہے اور انسان اخلاقِ فاضلہ سے قریب ہو جاتا ہے۔

روایتِ غنا : یونان میں مندروں کے اندر گانا ہوتا تھا۔ قدیم ہندوستان کے مندروں میں عورتیں معرفت کے ترانے گاتی تھیں، جن سے جذباتِ معرفت بھڑک اٹھتے تھے، لوگ وجد میں آکے جھومنے لگتے تھے اور یہ بڑی عبادت سمجھی جاتی تھی

ہندوستان کے مندروں میں اب بھی بھجن گائے جاتے ہیں ۔

پیغمبرِ اسلامؐ جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو انصار کی لڑکیاں " طلع البدر علینا " کا ترانہ گاتی ہوئی گھروں سے باہر نکل آئیں اور پیغمبرِ خدا نے انھیں منع نہیں کیا، کیونکہ یہ ان کے عقیدت و احترام کے جذبات تھے، جنھوں نے غنا کی شکل اختیار کر لی تھی ۔۔ یہ بڑی عبادت تھی ۔

خاتونِ جنت جب رخصت ہو کے علیؑ کے گھر جانے لگیں تو ان کی سواری کے آگے جوانانِ ہاشمی تلواریں علم کیے ہوئے تھے اور عقب میں ازواجِ رسولؐ، زنانانِ ہاشمیہ اور انصار و مہاجر کی خواتین خوشی کے ترانے گا رہی تھیں اور خدا کا رسولؐ ساتھ تھا ۔ اس زمانۂ عرب میں موسیقی اسی حد تک تھی ۔ حضرتِ عثمانؓ کے زمانہ میں اس کو ترقی ہوئی ۔

غنا عبادت ہے : صوفیائے کرام اس کو غذائے روح کہتے ہیں اور معرفت کے ترانے ان کے جذباتِ معرفت کو بھڑکا دیتے ہیں اور وجد و حال کی کیفیت طاری کر دیتے ہیں ۔ کوئی جھومنے لگتا ہے اور کوئی ہُو حق کرنے لگتا ہے اور کسی کی آنکھ میں آنسو آجاتے ہیں اور کوئی رقص کرنے لگتا ہے ۔

۱۱۷۱ء کا واقعہ ہے کہ مولانا سما الدین ایک محفلِ سماع میں معرفت کے ترانے سن رہے تھے، غش آگیا اور اسی حال میں خالقِ حقیقی سے جا ملے ۔

۱۰۷۰ء میں مولانا ابو الفتح ایک محفلِ سماع میں بیٹھے تھے ۔ مغنی غزل گا رہا تھا جب اس نے یہ شعر گایا

جاں بجاناں دہ وگرنہ از تو بستاند اجل
خود تو منصف باش اے دل ان نکو یا ان نکو

مولانا پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو گئی اور " ان نکو یا ان نکو " کی تکرار

کرتے ہوئے جان سپردِ جاناں کر دی ۔ (نزہتہ الخواطر)

اس سے بڑھ کر کوئی اور عبادت کیا ہو سکتی ہے ۔ جو انسان کو واصل بحق کر دے ۔ بیشتر علما شادی کے موقع پر جواز غنا کے قائل ہیں اور بعض علمائے شیعہ بھی معرفت کے ترانوں کو جائز سمجھتے ہیں ۔

حرمتِ غنا : جو علمائے شیعہ حرمت غنا کے قائل ہیں ، ان کے پاس سے قرآن و حدیث سے کوئی نص نہیں ہے ۔ اس کو علما نے زور اور لہو و لعب میں داخل کر کے حرام قرار دیا ہے اور بعض احادیث سے یہی ظاہر ہوتا ہے ۔ لیکن جو غنا معرفت کے ترانوں پر مشتمل ہے ، جس سے جذبات معرفت بھڑک اٹھتے ہیں ۔ ان کے جواز میں کوئی اشکال نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کو بہترین عبادت سمجھنا چاہیے ۔



مولوی عبدالحق اور مقدمۂ باغ و بہار

مولوی عبدالحق صاحب (سیکریٹری انجمن ترقی اردو)، جو اردو دانی اور اردو نوازی میں بڑی شہرت حاصل کر چکے ہیں، "مقدمۂ باغ و بہار" میں لکھتے ہیں:

"عام پڑھے لکھے لوگ بھی شاعر ہی کی زبان کو زبان مانتے ہیں۔ لغت نویسوں نے بھی اکثر انھیں کی پیروی کی اور دیوانوں کو ٹٹول کر الفاظ اور محاورے جمع کر دیے۔ بہت سے لفظ یوں ہی پڑے رہ گئے اور کسی نے خیال بھی نہ کیا۔ اب ضرورت ہے کہ ایسے لفظوں کو، جو آڑے وقت پر کام آنے والے ہیں اور جن کے مفہوم کو دوسرے لفظ اس خوبی سے ادا نہیں کر سکتے، گمنامی سے نکال کر کام میں لایا جائے۔"

اس عبارت میں "دیوانوں کو ٹٹولنا" محاورہ کا بے محل صرف ہے۔ بصارت نہ ہونے یا بصارت سے کام نہ لے کے کسی چیز کو ڈھونڈنا "ٹٹولنا" کہا جاتا ہے۔ اندھا راستہ ٹٹولتا ہے، اندھیرے میں چیز ٹٹولی جاتی ہے۔ ٹٹولنے اور ڈھونڈنے میں بھی فرق ہے کہ ڈھونڈنے والا آنکھ سے دیکھ کے عقل سے سمجھ کے کام کرتا ہے اور ٹٹولنے والا اندازہ سے۔ دیوانوں سے لفظوں اور محاوروں کو جمع کرنا اندازہ سے نہیں ہوتا، بلکہ اس میں بصارت و بصیرت (دونوں) سے کام لینا پڑتا ہے، جس کو ٹٹولنے سے تعبیر کرنا منشائے بلاغت کے خلاف اور محاورہ کا غلط استعمال ہے۔ پھر لطف یہ کہ ٹٹولا دیوانوں کو، ملیں لفظیں ... "ماروں گھٹنا، پھوٹے آنکھ"۔ اس سے بھی زیادہ پرلطف یہ عبارت ہے۔

" اب ضرورت ہے کہ ایسے لفظوں کو، جو آڑے وقت پر کام
آنے والے ہیں اور جن کے مفہوم کو دوسرے لفظ اس خوبی سے ادا
نہیں کر سکتے، گمنامی سے نکال کر کام میں لایا جائے۔"

" آڑے وقت پر کام آنا " ایک محاورہ ہے، جس کے معنی ہیں آنے والی مصیبت کو روک لینا۔ دوسری لفظوں میں یوں کہیے کہ مصیبت میں سپر بن جانا۔ مثلاً کوئی مصیبت آنے والی ہو اور رک جائے تو کہتے ہیں، " کبھی کی نیکی تمھارے آڑے وقت پر کام آگئی " یا کسی کی وجہ سے کوئی بلا ٹل جائے تو کہتے ہیں، " فلاں تمھارے آڑے وقت پر کام آگیا "۔ اس محل پر " آڑے وقت پر کام آنا " ایک مہمل بات ہے اور صرف محاورہ استعمال کرنے کے شوق یا اردو دانی کی نمائش نے قلعی کھولی ہے۔

یہ تو تھے محاورے۔ اب لغت دانی کا حال ملاحظہ فرمائیے۔ اسی کتاب کے آخر میں ایک فرہنگ ہے، جس سے اردو دانی میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً

اوقچہ : اس کے معنی لکھے ہیں پلنگ پوش یا بالا پوش۔ اوقچہ ایک پٹی ہے، جو عرض میں تخت، پلنگ یا مسہری کے پایوں کے برابر ہوتی ہے اور طول میں چاروں پایوں کو گھیر لیتی ہے۔ پلنگ پوش اس کے علاوہ ہے۔

بُجھرا : کوزہ، آبخورہ۔ اس کا املا بھی غلط ہے۔ بجائے ہائے مخلوط کے، ہائے ہوز (بجہرا) ہونا چاہیے اور معنی بھی غلط ہیں۔ یہ نہ آبخورہ، نہ کوزہ بلکہ گھڑے کا ڈھکنا ہے، جس میں اوپر ڈنڈی لگی ہوتی ہے۔

خورد خام کرنا : ٹکڑے کرنا، چورا کرنا۔ اس کے معنی ہیں زد و کوب کرنا، مارنا، پینڈیہ مشتے نمونہ ہے۔

مولانا محمد باقر شمس

ذکرِ جمیل

(ماہر القادری کا مجموعۂ نعت)

فنی حیثیت سے نعت گوئی جداگانہ صنف سخن نہیں۔ مگر معنوی حیثیت سے ضرور مختلف ہے۔ کیونکہ دوسرے اصناف سخن میں صرف حسن طبیعت کی ضرورت ہوتی ہے، مگر نعت و منقبت میں حسن عقیدت بھی شامل ہوتا ہے اور ایک ساتھ ان دونوں کا نباہنا بہت مشکل ہے۔

زبان عشق اور زبان عقیدت میں بڑا نازک فرق ہے اور ان دونوں کا امتزاج بہت دشوار ہے۔ اسی لیے علم معانی بیان میں تمام اصناف سخن کی معنوی خصوصیات کے لحاظ سے اس کی صراحت کر دی گئی ہے کہ ہر صنف کی ایک زبان ہوتی ہے، ایک مخصوص لب و لہجہ ہوتا ہے۔ اگر اس کا لحاظ نہ کیا جائے گا تو کلام معیار سے گر جائے گا۔ غزل کی زبان قصیدہ سے، قصیدہ کی زبان مثنوی سے، مثنوی کی زبان رباعی سے ہمیشہ مختلف ہونا چاہیے اور اسی خصوصیت کے پیش نظر ہر شاعر کی فنی حیثیت متعین کی جاتی ہے۔ سعدی غزل گو تھے۔ اس لیے وہ کامیاب قصیدہ نگار نہیں بن سکے خاقانی قصیدہ نگاری کے لیے پیدا ہوا تھا۔ وہ غزل گو نہ بن سکا۔ عرفی قصیدہ اور غزل خوب کہتا تھا۔ مگر اس کی مثنوی نگاری کے متعلق فیضی کی یہ رائے ہے

شوریش رنگ فصاحت نہ داشت
کان نمک بود و ملاحت نہ داشت

مختصر یہ کہ ایک صنف سخن کی کوئی مخصوص اصطلاح یا لب و لہجہ۔ انداز بیان دوسری صنف سخن کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔ مثلاً غزل میں جب معشوق کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کی شکل و صورت اور اعضا کی تعریف میں چاند سورج، تیغ و

خنجر، تیر و پیکاں، اس کا ناز و غمزہ دلربا اور جانستاں اور اس کے صفات میں ستمگری، خونریزی، بے رحمی و سفاکی وغیرہ کا ذکر اور ذکرِ عشاق میں ہجر و وصال، شکوہ و شکایت اور محرومی و ناکامی کے اظہار کے سلسلہ میں بہار و خزاں، بلبل و صیاد وغیرہ کا ذکر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مگر حمد و نعت و منقبت میں یہ باتیں نازیبا ہیں، اس لیے کہ ان کا تعلق محض جذباتِ تقدس سے ہے اور اس میں فنی تکلفات سے کام نہیں چلتا۔ مثلاً غزل میں آپ اپنے معشوق کو تو حسین و دلربا، خوش ادا، جانستاں سب کچھ کہہ سکتے ہیں، مگر نعت و منقبت میں ان الفاظ کا استعمال قطعاً بے محل ہے۔ اردو، فارسی میں نعت اکثر شعرا نے کہی ہے، مگر ان میں چند ہی ایسے ہیں جنھوں نے نعت کے حقیقی احترام کو ملحوظ رکھا ہے۔ زیادہ اسی غلطی کا شکار ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں غالب کی نعت

آرے کلامِ حق بزبانِ محمد است

مثالی ہے۔ اپنی زندگی میں ایک ہی نعت کہی اور نعت گوئی کا حق ادا کر دیا۔ اس میں نہ مبالغہ ہے، نہ تشبیہات و استعارات ہیں، نہ معنی آفرینی ہے بلکہ محض صداقتِ جذبات و خلوص و عقیدت اور والہانہ اندازِ جذبۂ فدویت ہے۔ اردو میں بھی اس کی مثالیں بہت کم ہیں۔ اگر محض تفننِ شاعری کو لیجیے تو اس کو محسن کاکوروی اس شان سے ادا کر گئے ہیں کہ اس کے بعد کسی اور کو جرأت کرنا ہی نہ چاہیے۔ بہرحال نعت گوئی بڑی پرکیف چیز ہے۔ اگر واقعی کسی کے دل میں رسول اللہؐ کی عظمت و احترام کا جذبہ موجود نہیں ہو تو بالکل لغو و مہمل۔

جس وقت جناب ماہر القادری کا مجموعۂ نعت "ذکرِ جمیل" مجھے ملا تو میں نے سب سے پہلے یہی معلوم کرنا چاہا کہ انھوں نے واقعی نعت کہی ہے یا محض شاعری کی ہے اور باور کیجیے کہ افتتاحی نظم دیکھنے کے بعد ہی میرا دل بجھ گیا، کیونکہ نعت کا حقیقی رنگ تو خیر کیا، بدقسمتی سے متغزلانہ رنگ بھی مجھے اس میں کہیں نظر نہیں آیا۔

سب سے پہلے تو میں اس مجموعہ کا نام ہی دیکھ کر کھٹکا کہ اس کو "ذکرِ جمیل" کا عنوان کیوں دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ذکرِ جمیل کی ترکیب اضافی ہو سکتی ہے یا توصیفی اگر اضافی ہے تو اس کے معنی ہوں گے کہ کسی جمیل کا ذکر اور رسول اللہؐ کو "جمیل" کے نام سے موسوم کرنا بڑی گری ہوئی بات ہے۔ لیکن اگر یہ ترکیب توصیفی ہے تو اس کے معنی ہوں گے کہ اس کتاب کا موضوع جمیل ہے۔ لیکن محض موضوع کے جمیل ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اگر اس کی پیشکش واقعی جمیل نہ ہو ـــ مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اس مجموعہ کی پہلی نظم، جسے اصولاً زیادہ معیاری ہونا چاہیے تھا، نہ صرف یہ کہ نعت گوئی کے معیار سے گری ہوئی ہے بلکہ شاعری کے لحاظ سے بھی کوئی مستحسن سعی نہیں۔

مطلع ملاحظہ ہو:

حسن کی جان، ایمان محبت، صلی اللہ علیہ وسلم
سر تا پا رحمت ہی رحمت، صلی اللہ علیہ وسلم

اس میں شک نہیں کہ آنحضرتؐ قبول صورت انسان تھے، لیکن آپ کا ظاہری حسن کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی کہ اسے صفتِ اولین قرار دے کر جانِ حسن سے خطاب کیا جائے۔ آنحضرتؐ کے زمانۂ حیات میں جو صحابہ آپ سے قریب تر اور محبت کا دم بھرنے والے تھے، ان میں سے بھی کسی نے ان کی شان میں ایسا فقرہ نہیں کہا۔ صرف حضرت ابو ذر غفاریؓ کو بیشک یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ رسول اللہؐ کو "میرے حبیب" کہا کرتے تھے، لیکن دوسرے صحابہ کو اتنی جرأت بھی نہ تھی، اس لیے آپؐ کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کرنا، جو دنیاوی معشوق کے لیے کہے جاتے ہیں، بڑی نامناسب بات ہے۔ علاوہ اس کے "ایمان محبت" بالکل بے معنی فقرہ ہے دوسرا مصرع بھی اپنی بندش کے اعتبار سے کچھ نہیں۔ نہ اس میں کوئی شاعرانہ لطف ہے، نہ موسیقیت۔ یہ شعر اگر اس طرح نظم کیا جاتا تو مناسب تھا:

خلق کے پیکر ، جان رسالت ، صلی اللہ علیہ وسلم
رحمتِ عالم ، عالمِ رحمت ، صلی اللہ علیہ وسلم

دوسرا شعر:

محرمِ راز ، ظاہر و باطن ، اگلی پچھلی باتیں روشن
واقفِ کل اسرارِ حقیقت ، صلی اللہ علیہ وسلم

پہلے مصرع کا دوسرا ٹکڑا پہلے ٹکڑے کی معنوی تکرار ہے اور بالکل بے لطف اسی طرح دوسرا مصرع بالکل پہلے مصرع کی معنوی تکرار ہے ۔ "محرمِ اسرارِ حقیقت" میں سارا مطلب آجاتا ہے ۔ اس کو آگے بڑھانا نہ معنویت میں کوئی اضافہ ہے ، نہ حسن بیان کی کوئی اچھی مثال ۔ علاوہ اس کے "کل" محض وزن پورا کرنے کے لیے لایا گیا ہے اور بالکل غیر ضروری ہے ۔ یہ شعر یوں ہونا چاہیے:

واقفِ رمز باطن و ظاہر ، اصل و نسب میں طیب و طاہر
حاملِ عصمت ، نازشِ قدرت ، صلی اللہ علیہ وسلم

تیسرا شعر

بدر و خندق میں خود آ کر کفر کو دیں ہر بار شکستیں
مالکِ سطوت ، صاحبِ شوکت ، صلی اللہ علیہ وسلم

"بدر و خندق" کے واو عطف کو کھینچ کر پڑھنے سے مصرع موزوں ہوتا ہے اور مصرع لفظ "بدر و" سے شروع ہوتا ہے ، جو نفاستِ ذوق کے منافی ہے ۔ علاوہ اس کے "بدر و خندق" کی تاریخی ترتیب بھی غلط ہے ۔ اس کو "بدر و احد" ہونا چاہیے "خود جا کر" کو "خود آ کر" کہنا بھی درست نہیں ۔ "ہر بار" کے ساتھ "شکست" (واحد) ہونا چاہیے ، نہ کہ جمع "مالکِ سطوت و شوکت" کہنا بھی شانِ رسالت کے منافی ہے شعر یوں درست ہو سکتا ہے:

بدر و احد میں خود جا کر ہر بار ہزیمت کفر کو دی

ساتھ تھی ہر جا حق کی حمایت ، صلی اللہ علیہ وسلم

چوتھا شعر:

فخرِ امم ، غمخوارِ امت ، صاحبِ عظمت ، حامل قرآں

فرق پہ جن کے تاج شفاعت ، صلی اللہ علیہ وسلم

آنحضرتؐ کو "فخرِ امم" کہنا غلط تعبیر ہے۔ فخرِ امم تو دراصل ان کی امت ہے۔ وہ فخرِ رسل تھے۔ پہلے مصرع کے باقی ٹکڑے بھی بے جوڑ ہیں۔

پانچواں شعر:

خندق میں سلمان نے دیکھا ان کے لطف و عطا کا جلوہ

کھول دیے ابوابِ حکومت ، صلی اللہ علیہ وسلم

(حاشیہ پر لکھا ہے غزوۂ خندق کی تاریخ تلمیح جبکہ) جنگِ خندق میں آنحضرتؐ کے لطف و عطا کا کوئی واقعہ حضرتِ سلمان سے مخصوص نہیں۔ "حکومت کے دروازے کھولنا" بھی غلط ہے۔

چھٹا شعر:

بندے اور اللہ میں رکھا ہر عالم میں فرقِ مراتب

شرک کے دشمن ماحی بدعت ، صلی اللہ علیہ وسلم

پہلا مصرع بالکل بے معنی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ماہر صاحب کیا کہنا چاہتے ہیں اور "فرق مراتب" سے کیا مراد ہے۔ دوسرے مصرع میں رسول اللہؐ کو "ماحی بدعت" کہنا عجیب سی بات ہے، جبکہ بدعت کی اصطلاح رسول اللہؐ کے بعد کی چیز ہے۔

ساتواں شعر:

فرمایا ، "تم قبر کو میری سجدہ گہ ہرگز نہ بنانا"
اللہ اللہ ! پاس شریعت ، صلی اللہ علیہ وسلم

بڑا ملایا اور بے مزہ شعر ہے ۔ پاس شریعت کے سلسلہ میں شاید سب سے بڑا کارنامہ ، رسول اللہؐ کا ، ماہر صاحب کے نزدیک یہی تھا ۔

آٹھواں شعر:

دین کی ہے تکمیل انھیں پر ، بتلا دیں سب اچھی باتیں
خاتم و روحِ و نبوت ، صلی اللہ علیہ وسلم

شعر واعظانہ انداز کا ہے ، حسن خیال اور حسن بیان (دونوں) سے معرا ۔ پہلے مصرع میں "ہے" کی جگہ "ہوئی" کہنے کا موقع تھا ۔ علاوہ اس کے ، پہلا مصرع ساقط الوزن ہے ۔

نواں شعر:

آدمؑ کا پتلا نہ بنا تھا ، جب وہ دنیا میں نبی تھے
ان سے ہے آغازِ رسالت ، صلی اللہ علیہ وسلم

جب آدمؑ کا پتلا بھی نہ بنا تھا تو نہ دنیا تھی ، نہ رسول اللہؐ ، پھر وہ دنیا کے نبی کیونکر ہو گئے ؟ اس اصلاح کے بعد کچھ لطف پیدا ہو سکتا ہے :

پیکرِ آدمؑ جب نہ بنا تھا ، نورِ نبوت جلوہ نما تھا
مظہرِ قدرت ، نازشِ فطرت ، صلی اللہ علیہ وسلم

دسواں شعر:

سنجیدہ سنجیدہ ادائیں ، شرمیلی نگاہیں
فخرِ حیا ، نازِ غیرت ، صلی اللہ علیہ وسلم

شرمیلی نگاہوں کے ساتھ ادا، ناز، حیا کا ذکر کسی عورت کے حق میں تو موزوں ہو سکتا ہے، پیغمبر اسلامؐ کی شان میں گستاخی ہے۔ پہلا مصرع غیر موزوں بھی ہے۔

گیارھواں شعر:

ماتھا ان کا نور کا تڑکا، گیسو میں رحمت کی گھٹا
لب پہ تبسم، صبح سعادت، صلی اللہ علیہ وسلم

اگر "ماتھے میں نور کا تڑکا" کہا جاتا تو البتہ "گیسو میں رحمت کی گھٹا" کا تقابل درست ہو سکتا تھا۔ لیکن جب ماتھے کو نور تڑکا کہا ہے تو گیسو کو "رحمت کی گھٹا" کہنا چاہیے۔ "گیسو میں گھٹا" کوئی پر لطف بات نہیں۔

بارھواں شعر

سب سے اونچا درجہ ان کا، حق نے بخشا رتبہ ایسا
جس کی نہیں کوئی بھی نہایت۔ صلی اللہ علیہ وسلم

دوسرے مصرع میں لفظ بھی زائد ہے اور محض وزن پورا کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔

تیرھواں شعر

دین و دنیا یکجا کر کے راز ترقی سکھائے
یہ بھی رحمت، وہ بھی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم

دوسرے مصرع میں "یہ بھی"، "وہ بھی" کہنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ دین و دنیا الگ الگ ہی، لیکن جب ان کو ملا کر راز ترقی سکھایا تو یہ تفریق ختم ہو گئی۔

چودھواں شعر:

کوہِ فاراں کی چوٹی سے نور کی مشعل لے کر اترے
نورِ مجسم، دافع ظلمت، صلی اللہ علیہ وسلم

نور کی مشعل اور نورِ مجسم (دونوں) کا ایک ساتھ ذکر کرنا بڑی عجیب سی بات ہے! جب آپ خود نورِ مجسم تھے تو پھر مشعلِ نور کی کیا ضرورت باقی رہی۔ یہ شعر یوں ہونا چاہیے:

کوہِ فاراں کی چوٹی سے نور کی مشعل لے کر اترے

دور ہوئی سب کفر کی ظلمت ، صلی اللہ علیہ وسلم

پندرھواں شعر:

مشرق میں ان کا فرمان ہے جاری ، مغرب بھی ان کے در کا بھکاری

عام ہوا پیغام ہدایت ، صلی اللہ علیہ وسلم

یہ نظم بحرِ متقارب میں لکھی گئی ہے ، مگر پہلے مصرع میں "فرمان" کا نون غنہ غائب ہو جاتا ہے ، حالانکہ اصولاً اس کا اعلان ہونا چاہیے ، اس لیے "ہے" غیر ضروری ہے۔ معنی کے لحاظ سے بھی یہ مصرع غلط اور خلافِ حقیقت ہے۔

سولھواں شعر:

وہ جو نہ ہوتے ، کچھ بھی نہ ہوتا ، دنیا ان سے ، عقبیٰ ان سے

دونوں جگ ہیں ان کی بدولت ، صلی اللہ علیہ وسلم

اس شعر میں تکرار بے لطف ہے۔ "وہ جو نہ ہوتے ، کچھ بھی نہ ہوتا" اسی کو دوسری طرح یوں کہا ہے: "دنیا ان سے ، عقبیٰ ان سے"۔ اس اصلاح سے غالباً یہ شعر کچھ بہتر ہو سکتا ہے:

مزرعِ دنیا ، گلشنِ عقبیٰ ، دونوں شاداب ان کے قدم سے

تابشِ قدرت ، بارشِ رحمت ، صلی اللہ علیہ وسلم

سترھواں شعر:

ان کا گر اقرار نہ ہو گا ، تکمیل توحید نہ ہو گی
عین ایماں ان کی الفت ، صلی اللہ علیہ وسلم

اقرارِ نبوت سے توحید کو کوئی واسطہ نہیں ۔ دونوں ایک دوسرے سے علاحدہ ہیں ۔ "توحید" کی جگہ "اسلام" کہنا مناسب تھا ۔

اٹھارھواں شعر:

حق نے شبِ اسریٰ میں بلایا ، عرش بھی ان کے زیرِ قدم تھا
یہ رفعت اور شانِ قربت ، صلی اللہ علیہ وسلم

پہلے مصرع میں "بھی" بے ضرورت ہے اور دوسرے مصرع میں "یہ رفعت" کے مقابلہ میں "قربت" ہونا چاہیے ۔ شعر اس طرح درست کر دینے سے کچھ بہتر ہو جاتا ہے:

حق نے شبِ اسریٰ میں بلایا ، عرشِ اعظم تحتِ قدم تھا
ایسی رفعت ، اتنی قربت ، صلی اللہ علیہ وسلم

انیسواں شعر:

خون کے پیاسے دشمن کو چھوڑ دیا قبضہ پا کر
پیکرِ خلق و عفو و مروت ، صلی اللہ علیہ وسلم

اگر اس کو یوں کہا ہوتا تو ایک بات پیدا ہو جاتی:

خون کے پیاسے دشمن کو بھی کر دیا سیراب آبِ کرم سے
بحرِ عطوفت ، قلزمِ رافت ، صلی اللہ علیہ وسلم

بیسواں شعر:

رات کی تنہائی میں بخشش امت کی دعائیں
جن کے سجدے فخرِ عبادت ، صلی اللہ علیہ وسلم

پہلا مصرع ناقص الوزن ہے۔ دوسرے مصرع میں "جن" کا مرجع غلط ہے یوں لکھنا چاہیے تھا:

رات کی تنہائی میں کبھی اور دشت کی پہنائی میں کبھی
خاک پہ سجدے ، جانِ عبادت ، صلی اللہ علیہ وسلم

اکیسواں شعر:

سائل کو ناکام نہ پھیرا ، بخش دیا جو کچھ گھر میں تھا
بھوکے سو رہنے کی عادت ، صلی اللہ علیہ وسلم

دوسرے مصرع کا پہلا ٹکڑا پہلے مصرع سے بالکل بے تعلق ہے۔ ہاں! اگر "عادت" کی جگہ "عادی" ہوتا تو ، البتہ ، صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہو سکتا تھا۔

بائیسواں شعر:

اپنی بیٹی کے سر پر تھا ایک دوپٹا وہ بھی شکستہ
بانٹ رہے تھے سب کو دولت ، صلی اللہ علیہ وسلم

اس شعر میں "اپنی" کا لفظ غیر ضروری ، بلکہ منافیٔ فصاحت ، ہے۔ پہلا مصرع اس طرح نظم کرنا چاہیے تھا:

بیٹی کے سر پر ایک دوپٹا وہ بھی کہنہ اور بوسیدہ

اس سلسلہ میں ایک بات اور مجھے یاد آگئی۔ وہ یہ کہ ماہر صاحب نے بارہا اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ وہ شاعری میں اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ انبیا کے حق میں تحقیری الفاظ استعمال کیے جائیں۔ مثلاً تجلی طور کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ

سے طنز آمیز خطاب کرنا یا معشوق کی تعریف میں حضرت یوسف کے حسن پر طعن کرنا یا محبوب کے لب جاں بخش کے بیان میں حضرت عیسیٰ کے معجزۂ احیائے موتی کی تخفیف کرنا اور اس میں شک نہیں کہ اجتنابِ تقدس کا تقاضا یہی ہے ۔ لیکن مجھے حیرت ہوئی ، جب ایک دن جناب ماہر کا یہ نعتیہ شعر میں نے ریڈیو پر سنا:

تھا مسجدِ اقصیٰ میں جھرمٹ جو رسولوں کا
ان سب میں حسیں میرے سرکار نظر آئے

دوسرے مصرع کو پڑھیے اور اس کے اندازِ بیان پر غور کیجیے ۔ کیا اس سے یہ مفہوم نہیں پیدا ہوتا کہ رسول اللہؐ کے علاوہ تمام دوسرے انبیا بدشکل یا معمولی شکل و صورت کے تھے ؟ وہ اگر یوں کہتے کہ ان سب میں حسین ترین رسول اللہؐ تھے تو بیشک درست ہوتا ، لیکن جو لب و لہجہ اس مصرع میں استعمال کیا گیا ہے ، اس سے یہی مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ دوسرے انبیا حسین نہ تھے ، حالانکہ مسجد اقصیٰ میں جمع ہونے والے انبیا میں حضرت یوسف بھی ضرور ہوں گے ۔ حیرت ہے کہ ماہر صاحب کا خیال کلام مجید کی اس آیت کی طرف نہیں گیا کہ "لانفرق بین احد من رسلہ" اور اس beauty contest میں انھوں نے بڑی ناحق شناسی سے کام لیا ہے ۔

(اس مضمون کے جواب میں ماہر صاحب نے جو مضمون لکھا ، اس کا جواب جو مولانا شمس نے دیا ، ان سب کے مطالعہ کے بغیر یہ مضمون پوری طرح محظوظ نہیں کر سکتا اس لیے مولانا کی کتاب "شعور و شاعری" میں یہ مضامین ملاحظہ کرنے چاہییں ۔ (مرتب)

مولانا محمد باقر شمس

لکھنؤ کا تمدن

تمدن انسانیت کا معیار ہے ۔ جتنا تمدن ترقی کرتا ہے ، انسانیت نکھرتی ہے ، یہی وجہ ہے کہ ہر بلند تمدن کو کم متمدن افراد فوراً قبول کر لیتے ہیں ، کیونکہ وہ اسے انسانیت کی زینت سمجھتے ہیں ۔

ایران کا تمدن ساری دنیا سے قدیم اور فائق ہے ۔ جب بہت سے متمدن ممالک وحشیوں کے ملک تھے ، اس وقت ایران کے لوگ بوقلموں لباس پہنتے تھے ۔

قانون فطرت ہے کہ حکمرانوں کا تمدن محکوم اختیار کرتے ہیں ۔ ایران کے تمدن کی بلندی کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ عربوں نے ایران کو فتح کیا ، لیکن ان کے تمدن کے آگے مفتوحانہ سر جھکا دیا ۔

نہ صرف عرب بلکہ ساری دنیا میں ، خصوصاً مشرق وسطیٰ کی تہذیب کا ، ایران کی نقالی پر انحصار ہے ۔ لکھنؤ کے تمدن کو سمجھنے کے لیے پہلے ایران کے تمدن کو سمجھنا چاہیے ۔

ایران کے تمدن میں اس کشش و برتری کی وجہ وہ جغرافیائی اور طبعی خصوصیتیں ہیں ، جو اہل ایران کو تمام دنیا سے ممتاز کرتی ہیں اور وہ پانچ ہیں : نفاستِ طبع ، شاعرانہ ذہنیت ، حسن پرستی ، پھولوں کا شوق اور ذہانت ۔ یہ باتیں ، کم یا زیادہ ، دنیا بھر میں پائی جاتی ہیں ، مگر ایرانیوں میں اس شدت سے ہیں کہ ان کی معاشرت میں ابھر ابھر کے اپنے وجود کو ظاہر کرتی ہیں اور نگاہیں فوراً ان کو دیکھ لیتی ہیں ۔

نفاست کو یوں سمجھیے کہ بدصورت چیز کو نفیس نہیں کہتے ہیں ۔ جس میں صفائی نہ ہو ، وہ نفیس نہیں ۔ ٹیڑھی بکلی اور بدقوار چیز نفیس نہیں ۔ بھونڈی اور

بھدی چیز کو نفیس نہیں کہا جاتا ۔ جس میں چھچھورا پن ہو ، وہ نفیس نہیں ۔ حسن ، نزاکت ، صفائی ، سب کچھ ہونے کے بعد اگر رنگ شوخ یا متعدد ہوں تو اسے شوخ نہیں کہیں گے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وضع قطع ، رنگ روپ ، ہر حیثیت سے خوبصورت اور بے عیب چیز کو نفیس کہتے ہیں ۔

جس کی فطرت میں نفاست ہوتی ہے ، اس کے اٹھنے بیٹھنے ، کھانے پینے ، چلنے پھرنے ، زبان اور خیالات میں بھی نفاست ہوتی ہے اور زندگی کے کسی شعبہ میں وہ خرابیاں پیدا نہیں ہوتیں ، جنھیں ہم کہیں بھونڈا پن ، کہیں ابتذال ، کہیں چھچھورا پن کہیں بے سلیقگی ، کہیں بازاریت ، کہیں بدصورتی کہتے ہیں ۔ اہل ایران کا یہی حال ہے ۔

۱۹۵۴ء میں عراق کے راستہ سے میں ایران گیا ۔ ایک ایرانی ہمارے ہمسفر تھے ۔ اتفاق سے بس میں ہم اور وہ ایک سیٹ پر بیٹھے ۔ کھڑکی کی طرف وہ تھے ۔ جب انھیں جانا ہوتا تھا تو پہلے اپنے جوتے اتار کر ہاتھ میں لیتے ، اس کے بعد ہمارے زانو کو نانگھتے اور پھر جوتا پہنتے ۔ اسی طرح آتے وقت وہ زحمت اٹھاتے ۔ میں نے ان سے کہا کہ تکلیف کی کیا ضرورت ہے ، مگر انھوں نے گوارا نہیں کیا ۔ اس سے پہلے کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی اور ایک دوسرے سے بے خبر تھے ۔ اب میں نے ان کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ " آقائے علی نقی " فلسفی کے بھائی ہیں اور میرے متعلق انھیں ایک پاکستانی مسافر ہونے کا علم ہوا ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک عام آدمی کے ساتھ ان کا یہ مہذب برتاؤ انسانیت کا احترام تھا ۔ ہمارا سفر جاری رہا ۔

غروب آفتاب کے قریب ہم عراق کی سرحدی چوکی خانقیں پہنچے ۔ وہاں آمد و روانگی کو دخول و خروج سنا ۔ وہاں سے چل کر تین ، چار کوس پر ایران کی سرحدی چوکی مورد خسروی میں صدور و خروج سننے میں آیا اور ایرانیوں کی پاکیزگی ذوق کا اندازہ ہوا ۔ صدور و ورود بھی عربی لفظیں ہیں اور دخول و خروج میں بھی جو زم کا پہلو ہے ، وہ بھی عربوں کے استعمال کے موافق ہے ، مگر انھیں اس کا احساس نہیں ہوا ۔

جبکہ وہ آسانی سے ورود یا صدور کہہ سکتے تھے ۔

اب ایران میں ہمارا سفر شروع ہوا ۔ جس چیز نے سب سے پہلے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا ، وہ نہروں ، آبشاروں ، درختوں ، پھولوں اور سبزوں کی افراط تھی ۔ راستوں ، گلیوں ، چوراہوں پر ایک دائرہ میں سبزہ ، درخت ، پھول اور حوض نظر آیا ۔ حوض پر ایک چھوٹی سی تختی پر لکھا ہوا تھا " نظافت رامراعات دارید " (صفائی کا لحاظ رکھیے) ۔ ہم نے کسی کو حوض پر منہ ہاتھ دھوتے یا وضو کرتے نہیں دیکھا ۔ پانی الگ لے جا کر منہ ہاتھ دھوتے ہیں ۔ اس سے جہاں ملک نہروں ، آبشاروں ، درختوں اور پھولوں سے بہشت نظر آیا ، وہاں اس کے باشندوں کی طبعی نفاست کا اندازہ بھی ہوا اور یہی وہ چیز ہے ، جس نے ان کے معاشرہ کو ساری دنیا سے ممتاز کیا ہے ۔

ہر گھر میں قدرتی نہر کی ایک پتلی سی شاخ گذرتی ہے ، جس سے ہر وقت سرد و شیریں ، صاف اور تازہ پانی ملتا ہے ۔

گھر پھولوں سے بھرے ہیں ، دیواروں پر بیلیں چڑھی ہیں ۔ خانۂ باغ ، پائیں باغ انھیں کی زبان کی لفظیں ہیں ، جو ان کے تمدن کا آئینہ ہیں ۔ راستے اور گلیاں پھولوں اور درختوں سے گلزار ہیں ، رنگ اور پھول ان پر برس رہا ہے ۔ قالین پر بیل بوٹے ، دروازوں پر پھول پتیاں ، اینٹوں پر گل بوٹے ، مکان کی جالیوں میں پھول ، زمین پر گلکاریاں (ٹائل) ، در و دیوار پر نقش و نگار صنادید عجم کی یادگار ہیں ۔ ان کی زبان میں رنگینی ہے ۔ ان کی شاعری میں رنگ اور پھول سب سے زیادہ نمایاں ہے ۔ آنکھ نرگس ، چہرہ گلاب ، جسم یاسمین ، دہن غنچہ ، لب برگ گل ، ہنسی خندۂ گل ، قد سرو ، زلف سنبل ہے ۔ یہ استعارے ایران نے تمام دنیا میں پھیلے ۔

مہندی ، گلاب اور نرگس ایران کی خاص چیزیں ہیں ۔

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے لکھا ہے :

" ہندوستان کے قدیم ہندو لٹریچر میں عورت کے سولہ سنگھار میں مہندی نہیں ۔ یہ ہندوستان کی چیز نہیں ہے ، مسلمانوں

کے ساتھ ایران سے آئی ہے ۔"

فارسی شاعری میں سے اس سے جتنے مضمون پیدا کیے ہیں، وہ کسی اور زبان میں نہیں ہیں ۔ نرگس اور گلاب بھی وہاں کا خاص پھول ہے ۔ نرگس کو کہیں اور کی اب و ہوا راس نہیں آئی، اس لیے اس نے ایران سے باہر قدم نہیں نکالا ۔ گلاب ہر جگہ پہنچا، مگر ایران میں اس کا جس طرح استعمال ہوا، کہیں نہ ہو سکا ۔ وہاں اسے گل کہتے ہیں ۔ تمام پھولوں کا سرتاج ہے ۔ اس کا رنگ آنکھوں میں کھپ پاتا ہے ۔ اس کی خوشبو شامہ کو معطر، دل میں سرور، آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا کرتی ہے ۔ بلبل مست ہو کے چہکنے لگتی ہے اور اس کے قریب بیٹھ کے اس کی مستی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ رات رات بھر بولتی ہے ۔

گلے کے ہار میں اس کا پیوند ہار کو بھاری بھر کم بنا دیتا ہے ۔ گلدان میں دوسرے پھولوں کے ساتھ رعایا میں بادشاہ معلوم ہوتا ہے ۔ شاعری میں تشبیہ و استعارہ ہے ۔ اس کا عرق کھانوں کو معطر کرتا ہے، محفلوں کو بساتا ہے، مریضوں کی دوا ہے ۔ زبان میں اس کا اثر سب سے زیادہ نمایاں ہے ۔ سیکڑوں مرکبات میں تنہا گل کے کئی معنی ہیں ۔ "گلابی" کے کئی مفہوم ہیں ۔ ہر اچھی چیز اس سے تعبیر کی جاتی ہے ۔ اچھی صورت گل رو، گل رخسار، گلعذار، گل چہرہ .... خوبصورت جسم گل اندام، گلبدن .... اچھا لباس گل پیرہن .... اچھی بات گلفشانی، گلپاشی، گلریزی .... اچھی آواز گلبانگ .... دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں، جس کے سابقہ، لاحقہ سے اتنے مرکبات ہوں ۔

لاحقے : گلاب، گل آفتاب، گلابی، گل بو، گلباری، گلبرگ، گلبن، گل بیگانہ، گلبانگ، گل پاپوش، گلپاش، گلپوش، گل پیادہ، گل تر، گل تراش، گل تسبیح، گلچین، گلگوں، گل خوردہ، گل صبح، گلدم، گل دام، گلدار، گل دوز، گل رعنا، گلرنگ، گل زمین، گلزار، گلستان، گل شمع، گل شکر، گلشن، گل صبح، گلفام، گلکار، گلقند، گل کدہ گلگوں، گلگوں، گلگونہ، گل میخ، گل مہتاب، گلنار، گل دوش، گلی ۔

سابقے : برگ گل، تبسم گل، خندۂ گل، عرق گل، غنچۂ گل، دامن گل، زر گل، بوئے گل، نکہت گل، شمیم گل، فصل گل، موسم گل، سبد گل، قبائے گل، جامۂ گل، رنگ گل، روغن گل، ساغرِ گل۔

محاورے : گل گفت، گل دیگر، شگفت، گلگشت، گل در آب کردن، گلدادن، گلگل شگفت، گل خوردن۔

اب معلوم ہوا کہ وہ دنیا کو گلشن ایجاد کیوں کہتے ہیں۔

یہی عالم رنگ کا ہے۔ ہر اچھی چیز رنگین ہے۔ رنگیں نوا، رنگیں سخن، رنگیں زباں، رنگیں بیاں، رنگین شعر، رنگین ادا .... بہت سے محاورے ہیں۔ رنگ بروئے اور دن، رنگ ریختن، رنگ زدن، رنگ بستن، رنگ شکستن، رنگ بر آب ریختن رنگ گرفتن، رنگ گذاشتن، رنگ نہادن، رنگ ماندن، رنگ چسپیدن، رنگ مالیدن، رنگ پوشیدن، رنگ خندیدن، رنگ برخاستن، رنگ گسیختن، رنگ گرداند، رنگ جستن، رنگ، رنگ بردن وغیرہ .... غرض رنگ و بو کا ایک سیلاب ہے اور دنیائے رنگ و بو اسی سے تعبیر ہے۔ اپنی شاعرانہ طبیعت سے روزانہ نئی تشبیہیں اور استعارے پیدا کرتے رہتے ہیں۔

خراسان میں ایک لڑکا دو گلدان ہاتھ میں لیے بیچ رہا تھا اور کہتا جاتا تھا،

"ہم گل و ہم گلدستہ"۔ گلدستہ کے لیے ہم نے یہ فقرہ نہیں سنا تھا۔ ان کے طرزِ معاشرت میں جس نفاست اور سلیقہ کا اظہار ہوتا ہے، کہیں اور نظر نہیں آتا۔

اہل ایران کی ایجادیں : دنیا میں ہزاروں چیزوں کے وہ موجد ہیں اور اسی دورِ ترقی میں بھی ان کی بہت سی ایجادوں پر کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ جام و شراب، تخت و تاج، دربار اور اس کے آئین ساری دنیا نے ایران سے سیکھے۔ کافوری شمعیں، شمعدان اور فانوس ان کی نفیس طبیعت اور پر ایجاد ذہن کی پیداوار ہے۔ بیمارستان (اسپتال) دنیا میں سب سے پہلے ایران (جندشاپور) میں بنا اور طبِ یونانی وہیں سے ساری دنیا میں پھیلی۔

دنیا میں سب سے پہلے مشین ایرانیوں نے ایجاد کی ۔ ابوالفضل نے "آئین اکبری" میں لکھا ہے کہ میر فتح اللہ شیرازی نے آلۂ جر ثقیل ، مشین گن (ایک راؤنڈ میں بارہ فائر کرنے والی بندوق) ، قلعہ شکن توپ ، ہوا سے چلنے والی چکی ایجاد کی ۔

خط نستعلیق ایرانیوں نے ایجاد کیا ۔ جب ایران میں عربی خط (نسخ) رائج ہوا تو اس کی ناہمواری اہل ایران کی نفیس اور حسن پرست طبیعت پر بار ہوئی ۔ انھوں نے اس میں گول دائروں اور نوک پلک سے حسن پیدا کیا اور اس کا نام نسخ تعلیق رکھا کیونکہ وہ نسخ پر تعلیق تھی ، ثقل کی وجہ سے خارج ہو گئی اور نستعلیق رہ گیا ۔ پھر اس میں جدتیں پیدا کیں اور اس کی بہت سی قسمیں ایجاد کیں خط گلزار ، خط غبار ، خط ماہی ، خط طغرا ، خط ریحان ، خط شفیعہ وغیرہ اور ہر خط کو مضمون کی مناسبت سے استعمال کیا ۔

نسخ کو بھی انھوں نے اس کی حالت پر نہیں چھوڑا ، بلکہ اس میں بھی ایک حسن پیدا کیا ، گویا اونٹ کو بنا سنوار کے حسین بنا دیا ۔ قالین کی ایجاد بھی ان کی حسن کی حسن پسند طبیعت کا کارنامہ ہے ۔ انھوں نے جیسے قالین بنائے ، دنیا میں کہیں نہ بن سکے ۔ آج بھی وہ اعلا تمدن کا اہم جزو ہے اور اس سے بہتر کوئی ایجاد اب تک نہیں ہو سکی ۔ سفید فرش اور اس کا نام چاندنی نور جہاں کی اختراع ہے ۔ عطر بھی اس کے حکم اور تجویز سے بنا ۔ اس سے پہلے مشک رکھتے تھے اور غالیہ (خوشبودار پوڈر) بالوں میں ملتے تھے ۔

راستوں میں درخت میلوں کے نشانات اور کاروان سرائیں دنیا میں سب سے پہلے انھوں نے بنائیں ۔ کھانے میں پلاؤ زردہ ، قورمہ ، کباب ، شیر برنج ایسے نفیس کھانے انھیں کی ایجاد ہیں اور پلاؤ قورمہ ساری دنیا کے لیے مرغوب غذا بن چکا ہے ۔

دہلی کا تمدن : ہندوستان میں جن بادشاہوں نے حکومت کی ، وہ افغانستان و ترکستان کے مغل اور پٹھان تھے ، لیکن دربار اور اس کے آئین "شان و شوکت"

"رعب و داب"، "تہذیب و تمدن"، "نفاست و شائستگی" میں ایران کی نقل کرتے تھے ... حد یہ ہے کہ درباری اور سرکاری زبان ایرانی تھی، شعر و شاعری ایرانی تھی۔

ایرانی کھانے دسترخوان کی زینت تھے، ایرانی اطبا، شعرا، فلاسفر، اہل قلم اور اہل سیف سے پایۂ تخت بھرا ہوا تھا۔ ایران میں خط (نستعلیق) کی بہت قدر تھی۔ ایران ولایت اور ایرانی ولایتی کہے جاتے تھے اور اس میں تمدنی، لسانی اور علمی عظمت و برتری کا مفہوم مضمر تھا۔ خاص طور پر مغلوں کے زمانہ میں تو وہی طبیب، منجم، شاعر فاتح ملک، مدبر سلطنت، حکومت کے بانی، سلطنت کی شان اور ملک کا استحکام تھے۔ ان وجوہ سے ہندوستان ایران سے ہر بات میں متاثر تھا اور اس کی نقل تہذیب و شائستگی کا معیار تھی۔

ہندوستان کے قدیم تمدن میں ہاتھی کی سواری کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور اس میں شک نہیں کہ اس سے زیادہ شاندار سواری نہیں اور جامہ مختلف قسم کی پگڑیاں، مٹھائیاں، کھانے میں پوریاں، کچوریاں، دہی بڑے، پھلکیاں، مزیدار چیزیں تھیں۔ پان بھی یہاں کی خاص چیز تھی، جس سے منہ کسی وقت سیٹھا پھیکا نہیں رہتا اور اس کی سرخی کا ہونٹوں کے دریچہ سے جھانکنا گورے چٹے اور خوبصورت لوگوں کے حسن میں اضافہ کر دیتا تھا۔ شعر و شاعری، طب و نجوم میں بھی ان کی عظمت مسلم تھی۔ مسلمانوں نے ان سب کو اور ان کے ساتھ شادی بیاہ کے بہت سے رواسم اختیار کر لیے۔ اس طرح ایک مخلوط تمدن قائم ہوا، جس کا غالب حصہ ایرانی تھا۔

ایران کے تمدن میں انقلاب : ایران کے تمدن میں بھی صفویوں کے زمانہ میں انقلاب آیا۔ شاہی رعب و داب، شان و شوکت، نفاست، پاکیزگی ذوق، حسن خلق احترامی شجاعت، شعر و شاعری سے دلچسپی تو باقی رہی صوفیت و امرپرستی کا خاتمہ ہوا خانقاہیں ویران ہوئیں، اہلبیت مرکز عقیدت بنے، تعزیہ داری، مجلس و ماتم، نذر و نیاز ہونا شروع ہوئی، علما کی قدر و منزلت بڑھی، یہاں تک کہ سلاطین ان کے

سامنے تخت و تاج پیش کر کے ان کی نیابت میں امور سلطنت انجام دیتے تھے۔ اپنی بیٹیوں کی شادی ان کے ساتھ کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ شعرا کی قدر و منزلت میں بھی اضافہ ہوا۔

یہی زمانہ ہندوستان سے روابط بڑھنے کا تھا۔ شاہ اسماعیل نے بابر کی اور شاہ طہماسپ نے ہمایوں کی مدد کی، جس کے نتیجے میں ترکستان، افغانستان اور ہندوستان میں مغلیہ سلطنت قائم ہوئی۔ ایرانی علما، شعرا اور اہل سیف کثرت سے ہندوستان آئے۔ ان کے ساتھ تعزیہ داری بھی آئی۔ بابر اور ہمایوں سے قریبی تعلق رکھنے والوں کا بیان ہے کہ یہ دونوں خود بھی شیعہ ہو گئے تھے۔ تعزیہ داری کا تعلق امام حسینؑ سے ہے اور صوفیائے اہلبیت سے عقیدت میں کسی سے کم نہیں ہیں، اس وجہ سے وہ بھی تعزیہ داری اور نذر و نیاز عقیدت و احترام سے کرنے لگے۔ آج تک اکابر صوفیا کے مزاروں پر تعزیہ داری ہوتی ہے۔ اس طرح ہندوستان میں صوفیت کے ساتھ تعزیہ داری کو فروغ ہوا اور فارسی اصنافِ سخن کے انداز پر اردو میں شاعری شروع ہوئی، جس میں مضامین، تشبیہ و استعارے، ترکیب و بندش، سب فارسی تھی۔

لکھنؤ کا تمدن : سید محمد امین (ایرانی امیر زادے) جوانی میں گھر سے خفا ہو کے ہندوستان آئے اور اپنی اعلا صلاحیتوں سے بہت جلد بلندی پر پہنچ گئے۔ ۱۷۳۶ء میں اودھ کے صوبہ دار ہوئے۔

وہ ایران میں پیدا ہوئے تھے۔ وہیں کی تہذیب میں پل کر جوان ہوئے۔ ان کی معاشرت اور تہذیب ایران کی نقل نہیں، اصل تھی۔ وہی نفاست، شان و شوکت، تہذیب و شائستگی، شعر و شاعری، علم و فن کی قدر، مجلس و ماتم، ان کی فطرت بنی ہوئی تھی۔

اجودھیا کے قریب دریائے گھاگرا کے بند پر انھوں نے ایک نیا شہر ایرانی طرز کا بسایا، جو بنگلے کے نام سے مشہور ہوا، کیونکہ وہ پھونس کے بنگلے میں رہتے تھے۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ سرِ شام سے رات گئے تک ایرانی شہروں کی طرح اس کی

چہل پہل بڑھتی تھی ۔ رفتہ رفتہ پورے صوبہ کی یہی حالت ہو گئی ۔ دوسرے صوبوں کے بھی بعض مقامات کی شادی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی ۔ اس سے پہلے ہندوستان میں سرشام سے بازار بند ہو جاتے تھے ۔ اب بھی پاک و ہند کے اکثر مقامات پر یہی ہوتا ہے ۔

صفدر جنگ : اپنے بھانجے مرزا مقیم کو ایران سے بلوا کے اپنی لڑکی صدر جہاں بیگم سے شادی کی ۔ وہ شاہی نسل سے تھے ۔ وہی نفاست اور شان و شوکت ان کی طبیعت میں داخل تھی ۔ اہل علم کے قدرداں اور آل رسولؐ کے عقیدتمند تھے ۔ یہ باتیں اس معیار پر دہلی کے نوابین میں بھی تھیں ۔

میر تقی میر نے لکھا ہے کہ وہ اپنے زمانۂ وزارت میں جس شان و شوکت سے رہتے تھے ، وہ شان بادشاہ کی بھی نہیں تھی ۔ بنگلے کو انھوں نے خوب سجایا اور اس کا نام فیض آباد تھا ۔ لکھنؤ جو اصل دارالحکومت تھا ، اس میں بھی نئی عمارتیں بنوائیں اور پرانی عمارتوں کو درست کر کے شہر کو آراستہ کیا ۔

شجاع الدولہ : شجاع الدولہ نے فوج کو ترقی دی ، سپاہیانہ جوش خروش بڑھا ، اسلحہ کے کارخانے کھولے ۔ اس پیشہ کے لوگ دور دور سے آئے ۔ ایرانی طرز کے باغ اور سیر گاہیں بنائی گئیں ، تعزیہ داری کو فروغ ہوا ۔ علما ، اطبا اور شعرا کی قدر افزائی ہوئی اور اہل کمال سے شہر بھی بھر گیا ۔ شہر کی درستی اور خوبصورتی کا بھی بڑا خیال تھا اس کی حفاظت وہ خود کرتے تھے ۔

وہ ایرانی ہونے کے ساتھ دہلوی بھی تھے ۔ ان کی ماں ایرانی تھی ، لیکن ایرانی باپ کی بیٹیاں ضرور تھیں ، مگر دہلی میں پیدا ہوئی تھیں ۔ خود شجاع الدولہ نے بھی دہلی میں آنکھ کھولی ۔

وہ دہلی کو اپنا وطن ثانی سمجھتے تھے اور سلاطین دہلی کے اکثر ذوق ان میں موجود تھے ۔ رقص و سرور ، جانوروں کی لڑائی ان کا دلچسپ مشغلہ تھا ۔ ارباب نشاط سے دلچسپی کے ثبوت دور دور پہنچ گئے اور کشمیر سے حسین و جمیل طوائفیں آئیں اور

کوچے ان سے بھر گئے ۔ کسی عورت کو شہر سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی ۔ اس حکم میں طوائفوں پر پابندی مقصود تھی ۔ گو وہ اپنے کو قید نہ سمجھیں ۔ اس کے لیے ان پر طرح طرح کی نوازشیں ہوئیں اور بغیر کسی خدمت کے انعام و اکرام کا دستور قائم کیا کہ وہ خوش اور مطمئن رہیں ۔ اس کے باوجود وہ محمد شاہ رنگیلے نہیں بنے ۔

ان کے گھر میں ایرانی فضا تھی ، جس میں انھوں نے پرورش پائی ، اس وجہ سے وہ طبعاً ایرانی تھے ۔ ایرانی نفاست ، شان و شوکت اور رکھ رکھاؤ ان میں موجود تھا نہایت رعب و داب سے رہتے ۔ طوائفوں سے اتنی دلچسپی کے باوجود انھیں اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ بے تکلف ہو کے ادب و تعظیم سے ہاتھ اٹھائیں ۔ نہایت ادب سے سامنے آتی تھیں ، اس کی تعلیم حاصل کرتی تھیں ۔ اس سے معاشرہ میں ابتذال اور چھچھورا پن پیدا نہیں ہو سکا ، بلکہ ادب تعظیم اور نفاست کا لحاظ بڑھ گیا ۔

سپہ گری ، اسلحہ سازی ، خطاطی کو ترقی ہوئی ۔ تصنیف و تالیف کو بھی پوری ترقی ہوئی ، چرچا بڑھا ، نفیس و لذیذ کھانوں کا شغل پھیلا ۔

شیعہ سنی کی تفریق نہ تھی ۔ شیخ سدو کا بکرا میراں جی کے گلگلے میں ، احمد کبیر کی گائے ، بابا فرید کا کونڈا ، امداد صاحب کی کندوری ، غازی میاں کا جھنڈا ، عرس ، قوالی ، چادر ، گاگر ، مذہبی رواسم تھے ۔ نکاح ، طلاق ، دفن ، کفن ، سب ہی اہلسنت کے طریقہ پر ہوتا تھا ۔ جمعہ اور عیدین کی نماز شیعہ اہلسنت کے ساتھ پڑھتے تھے ، کیونکہ شیعہ عالم نہ تھا ۔ شیعوں کی کوئی مسجد نہ تھی ، نہ امام باڑہ ۔ محرم میں کپڑے یا پھونس کا امام باڑہ تھا اور دس دن بعد غربا لے جاتے تھے ۔

آصف الدولہ : آصف الدولہ نے باون گاؤں ملا کے لکھنؤ کو وسیع کیا اور مغربی طرز کے چار سو باغ بنوائے ، جس کی وجہ سے لکھنؤ کو انگریز "ہندوستان کا باغ" (Lucknow. the Garden of India) کہتے تھے ۔ شیشے اور ہاتھی دانت کا مکان ، شیر کی کھال کا شامیانہ ، عالیشان عمارتیں بنوائیں ، جن کی برجیوں کے کلس اور گھڑیوں سے صبح کو سارا شہر چمک اٹھتا تھا ۔

موسیقی کی گرم بازاری ہوئی ۔ کوئی گلی کوچہ ایسا نہیں تھا، جو طوائفوں سے نہ بھرا ہو ۔

سپہ گری، شہسواری، خطاطی بام عروج پر پہنچی ۔ شعر و شاعری کا چرچا زیادہ ہوا اور عام طور پر لوگوں میں اس کا مذاق پیدا ہوا ۔ نفیس اور لذیذ کھانوں کا شوق بڑھا ۔

ہر طبقہ کے لیے ادب اور تعظیم کا پابند ہونا ضروری تھا ۔ بڑے بڑے کامل فن لکھنؤ آئے، جنھوں نے رؤسا کی محفل میں باریابی کے لیے ادب و تعظیم کے طریقے سیکھے تھے ۔

مولوی دلدار علی (غفرانمآب) عراق سے تحصیل ہو کر آئے اور لکھنؤ میں مسندِ درس بچھائی، شیعوں کی جمعہ و جماعت قائم کی، صوفیت اور اخباریت کے خلاف محاذ قائم کیا ۔ مدار صاحب کی کندوری، بابا فرید کا کونڈا، شیخ شدو کا بکرا اور احمد کبیر کی گائے ایسے رواسم شیعوں نے چھوڑ دیے ۔ ان کی جگہ نذر و نیاز اور علم و تعزیہ کو رواج دیا ۔ نکاح، طلاق، دفن، کفن شیعوں کے طریقہ پر ہونے لگا اور شیعہ بحیثیتِ قوم وجود میں آئے ۔ انھوں نے امام باڑہ کا ایک طبزاد نقشہ دہرے دالان اور شہ نشین کا بنایا ۔ شہ نشین میں ضریح اور علم رکھے ۔ اسی نقشہ کے موافق سارے ہندوستان میں امام باڑے تعمیر ہونے لگے اور پختہ امام باڑوں کا رواج ہوا ۔ محرم میں گھر گھر تعزیہ رکھا جاتا تھا ۔ کوئی گلی کوچہ خالی نہ رہتا ۔ آصف الدولہ نے امام باڑہ بنوایا، جو ہندوستان کی مشہور اور عجیب عمارتوں میں ہے ۔

سعادت علی خان : سعادت علی خان میں ہندوستانیت نام کو بھی نہ تھی ۔ وہ طبعاً ایرانی تھے ۔ سنجیدگی، رکھ رکھاؤ، حسن پرستی اور نفاست ان کی فطرت تھی ۔ روزانہ کی بات چیت میں بھی وہ اس کا خیال رکھتے تھے ۔ نہایت مختصر، معنی خیز اور خوبصورت جملے بولتے تھے ۔

سواری کے ساتھ بجائے مشعلوں کے، چاندی سونے کی لالٹینیں ہوتی تھیں، جن میں مومی شمعیں جلتی تھیں۔ ان کے دور میں ہر چیز میں حسن و نفاست کا لحاظ بڑھا کوئی چیز ایسی نہیں رہ گئی، جس میں نفاست اور حسن نہ پیدا کیا گیا ہو۔ برتنوں کی ساخت بدل گئی، لوٹا اور پتیلی کی اونچائی اور گولائی میں ایک خاص تناسب پیدا ہوا، جس سے وہ بہت خوبصورت اور نفیس معلوم ہونے لگی اور آج تک لکھنوی ساخت مشہور اور پسندیدہ ہے۔ کپڑوں کی وضع بدلی، گھیر دار جامہ اور پٹکا پرانے لوگوں میں رہ گیا۔

شہر کی بڑی طوائفوں کو شہر سے باہر جانے کی ممانعت ہوتی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ شہر کی رونق ہیں۔

غازی الدین حیدر : غازی الدین حیدر نے شاہی کا اعلان کیا۔ ادب و تعظیم کے قاعدے سخت ہو گئے، شعر و شاعری کو ترقی ہوئی، رقص و موسیقی کو عروج ہوا۔ مصوری اس عہد کا مخصوص امتیاز ہے۔ کھانوں میں تکلفات بڑھے۔ اب تک چاولوں کو نرم کرنے کے لئے دودھ ڈالا جاتا ہے۔ اب پلاؤ زردہ میں بالائی ڈالی جانے لگی اور نفاست کے خیال سے چھان کے ڈالی جاتی تھی کہ کوئی ٹکڑا ظاہر نہ ہو۔ اس نفاست کے ساتھ مزہ بھی دس گنا ہو گیا۔ جانوروں کی لڑائی کو ترقی ہوئی۔

نصیرالدین تا واجد علی شاہ : سلیمان نصیر الدین حیدر بادشاہ (۱۲۴۲ھ) سے لے کے سلطان عالم واجد علی شاہ اختر (۱۲۷۳ھ) تک تینتیس سال لکھنؤ کا عہد شباب ہے، جس پر تمام دنیا کی رعنائیاں پھٹ پڑی تھیں۔

آبادی : "اس وقت پون ملین (یعنی ساڑھے سات لاکھ) تھی"۔ پروفیسر جولیس بلاک۔

شان و شوکت : "سیاحان ممالک کہتے تھے کہ ایسا شہر روئے زمین پر نہیں دیکھا"۔ مولانا قبول محمد۔

"یورپ کا کوئی دارالسلطنت ایسا نہ تھا، جو شان و شوکت میں لکھنؤ سے بڑھا ہوا ہو"، مولانا شرر۔

شاہی عجائب خانہ کے جانوروں اور شیروں کے بولنے کی آواز سے صبح کو سارا شہر گونج اٹھتا تھا۔ پانچوں وقت نوبت بجتی تھی، تین وقت توپیں چھوٹتی تھیں۔ رئیسوں، شاہی بیگمات اور شاہی سواریوں کا اہتمام، روپے پیسے کی بارش لوٹنے والوں کا شور و غل، نقیب کی ہٹو بچو سے زندگی کا ایک سیلاب تھم تھم کے آتا رہتا تھا

اکبری دروازہ، چوک شاہ گنج، چاول والی گلی، نخاس، پاٹا نالہ، یحییٰ گنج، راجا کی بازار، چینا بازار، جوہری بازار، امین آباد پرانی وضع اور حضرت گنج انگریزی قطع کا بازار ہے۔

اکبری دروازہ سے پکے پل تک : کیا صراط مستقیم ہے، کیا جلسہ ہے! نانبائی خوش سلیقہ، شیرمال کباب، نہاری ادرک کا لچھا، میاں خیراللہ کی دکان کا بال سے باریک کترا، حسینی کا حلوہ سوہن پپڑی، دبیز، جوزی دودھیا، ہر کنجڑن کی تیکھی چتون کہ آدمی صورت دیکھتا رہے، رعب سے بات نہ کر سکے۔ سندر نین، پریزاد سرو قامت، دکانوں میں انواع و اقسام کے میوے قرینے سے چنے۔ ان کے روز مرہ محاورے دیکھے، نہ سنے۔ شیخ کولی کی مٹھائی، برفی کی نفاست، بوباس، دوراپن، نقرئی ورق کا جوبن، امرتی مسلسل کا ہر پیچ ذائقہ کو بیچ دیتا ہے۔ پراچیوں کی گلی کی گجور، بالائی نورا کی دکان کی۔ مدرسے جتے ایسے لیجاد ہوئے کہ جب تڑاقا ان کا سنا، تنگوان کا دم بند ہوا۔ پٹھانا کا تمباکو، مشک و عنبر کی خوشبو، میاں خیراتی سے حجامت بنوائے، چار پہر کھونٹی کا پتا نہ پائے۔ سید حسین خان کے دروازہ پر عبداللہ عطر فروش کی دکان، جائے نشست، ہر وضعدار جوان ہے۔

برسات : ادھر مینہ برسا، پانی جا بجا بہ گیا، گلی کوچہ صاف رہ گیا۔ ساون بھادوں میں زردوزی جوتا پہن کر پھرے، کیچڑ تو کیا مٹی نہ بھرے۔ فصل بہار کی قدرت

پروردگار کی ۔ آم کے درختوں میں ٹپکا لگا، جھولا وہیں پڑا ۔ جھولنے والوں پر دل ٹپکا پڑتا ہے، محبت کے پینگ پڑتے، کوئی پپیہے کا شور، گھٹا گھنگھور، ساون بھادوں کے جھالے وہ رنگین جھولنے والے ۔

عیش باغ میں تماشے کا ہر وقت میلا چین کا جلسہ ۔ موتی جھیل کا پانی چشمۂ زندگانی کی آب و تاب دکھاتا ہے ۔

ہار سنگھار کے جنگل میں لوگوں کا جمگھٹا، رنگا رنگ کی پوشاک، آپس کی جھانک تاک، کوٹھیاں فرح بخش، دلکشا، سلطان منزل، استری مکھن ۔۔ انسان کو دیکھ کر سکتہ ہو جائے ۔ بارہ دری جواہر سے جڑی پری کی صورت قریب نہر جاری ۔ پائیں باغ اس کا حسن جس نے دیکھا، باغ ارم سمجھا ۔ رومی دروازہ کی نقل، جلوخانہ کا وہ ترپولیا ہے، جو حواس خمسۂ بشر کھوتا ہے ۔ سہ پہر کو وہاں سیر گزری (گذڑی) نظارہ ہر رہگذری ہے ۔

مینا بازار کا جلسہ ہر روز صبح کو ہو جاتا ہے ۔ ایک جہان لینے دینے کو آتا ہے ۔ کسی جا کبوتر گرہ باز، کہیں شیرازی گلی نگار، کوئی نیم کی پتی لگی یا کوڑی اچھال کر بیاسے منگواتا ہے، کسی کا یہ دل گردہ ہے کہ بیاسے توپ چھڑواتا ہے، کہیں توتا بنیٹھی ہلاتا ہے، کہیں مینا پھدک رہی ہے، نیل کنٹھ چھوٹتا ہے، کہیں بشرا اور بازوں کا غول ہے، کہیں لوے تیتر کا غول ہے، کسی جا ٹینی مرغیاں، کہیں اصیل، کسی طرف انڈے لڑتے جال میں کوے، چیل، خوشرو جوان، جھمکڑے کے گھوڑوں پر سوار ایک سمت فیل نشینوں کی قطار، کسی جا سن رسیدہ عورتیں برقع پوش، کرتی، ازار بند، گڑیاں مچکیں لیے موجود ۔ ایک طرف میوہ فروشوں کی صدا ۔ کہیں سقوں کے کٹوروں کا کھنکنا ۔ گرمی کی فصل میں فالودے والے غل مچاتے ہیں ۔ کسی جگہ کورے گھڑوں میں فرید کی گھاس، کہیں بانس گرانٹ بانس پر چڑھا، کوئی سانپ اور نیولا لڑانے کو بڑھا ۔ ایک جا قصہ خوان حمزہ و عمرو کی داستان، نقال جدا نیغ کھونسے مسخرہ پن کرتے ہیں ۔ کہیں لونگ چڑے دال موٹ کے خوانچوں پر جوبن ۔

ایک مچھلی کے کباب پر سندوں کا رنگ اور کلیجی کے کباب مٹھائی برابر خوانچوں میں رکھی کھٹے چٹنے پر مزہ بنے ریوڑی کو منہ لگایا، ذہن معطر ہوا۔

لازندازوں کی دکانیں جدا۔ بنارس، ڈھاکا، چین، گجرات کا ریزا۔ کم مایہ گزی گاڑھا، سوسی دھوتر کا بیوپار کرتے ہیں۔ صرافوں کے سامنے اشرفی، روپے کا ڈھیر ہے۔

زرق برق جوہری بیچ گھیر دار جامے پہنے پگڑی سر پر، کمر پھولی بندھی، مونگا، موتی، الماس، زمرد، یاقوت، پکھراج، نیلم لیے ٹہلتے ہیں۔ لین دین سے بازار گرم ہے۔

محمد شاہی طرحداری ہے۔ کوئی بیلے کی بہار دیکھ کے ہار چکاتا ہے، کوئی چنبیلی، جوہی کی بھینی بو باس سے بے چین ہوا جاتا ہے۔ کوئی ککڑ والے کو بلا کے سلفے کے دام لگاتا ہے، کوئی گانجا چرس کے دھویں اڑاتا ہے۔

سرئے، مکانات خوش قطع، مستحکم، صحن وسیع۔ نشستہ ورفتہ، جوان جوان بھٹیاریاں عمدہ و صاف پوشاک پہنے، گرما گرم بائیں داہنے مسافروں کو یہ کہہ کے بلاتی ہیں:

"بڑا مزہ ہے کہ مکان نفیس، صاف، گرم کھانا، سرد پانی کورے گھڑوں میں بھرا ہے، ٹھنڈی چھاؤں۔ رنگ کا چبوترہ پکا ہے، نہ چور ہے، نہ اچکا ہے۔ دن کو چین، رات کو ہر طرح کا آرام ہے۔ نہ چارپائی میں کھٹمل، نہ گھر میں مچھر۔ پاؤں دبانے کو حجام ہے۔ پہر بیٹے یہ آواز آتی ہے، اپنے اپنے مسافر کو جگاتی ہے۔ ہر ایک بھاتی ہے، راہ کے ملنے کا اعتبار نہ کرنا، دن رہے منزل پر اترنا۔"

اٹھوانس کا تالاب: "ہشت بہل، شش جہت میں اس کا جواب نہیں۔ مختصر ساگر اس کے پائیں باغ ہے۔ جا بجا پتھر کی تصویریں۔ گویا بولا چاہتی ہیں۔ رنگ رنگ کے چوبی بنگلے، ان میں سرخ شیر، سیاہ ریچھ۔ درندے بیشل، جو کبھی کسی نے دیکھے نہیں۔ ہر وقت میلا، ہر دم سیر ہے"۔ سرور۔

خاص بازار و جوہری بازار : "عمارتوں کی ترتیب نثر کے مقفیٰ فقروں کی طرح متوازن۔ دو رویہ آبادی نظم کے مصرعوں کی طرح موزوں۔ عمارتیں کشادہ، گلیاں چوڑی، مکان صحن باغ سے جنت بازار کا راستہ سلک جواہر کی طرح درخشاں، دکانیں معشوقوں کے ابروؤں کی طرح پیوستہ"۔ مولانا محمد قبول۔

چوک کی سڑک : "یہ دراصل شہ رگ تھی لکھنؤ کی، جس میں خون کی جگہ شاہد و شمع، شراب و شکر جاری و ساری تھے۔ ساری دنیا میں آفتاب چاہے جب طلوع ہو، لیکن یہاں طلوع ہوتا تھا شام ہی کو اور جب صبح ہوتے ہوتے وہ غروب ہوتا تھا تو خدا جانے حسن و محبت کی کتنی داستانیں اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ جھٹپٹا ہوتے ہی وہ پردہ گیان حریم ناز کا اہتمام دلربائی، وہ حوریان بزم سوز و ساز کی جلوہ فرمائی"۔ نیاز فتحپوری۔

"کوئی گوری، کوئی چمپئی، کوئی سانولی سلونی۔ خدوخال اس قدر باریک، گویا ہیرے کے قلم سے ترشے ہوئے ہیں۔ کوئی کڑیل جوان، کوئی نوجوان، کوئی ان دونوں کے درمیان۔ ہمکتی ہوئی اٹھان، کوئی گٹھے جسم کی اور کوئی دھان پان۔ کسی کی ناک میں نتھ، کسی کی ناک میں نیم کا تنکا"۔ جوش ملیح آبادی۔

"ہر ایک حسن میں یکتا، چاند سا چہرہ، کالے کالے بال، پھول سے گال، سرو سا قد، حور کی صورت، پری کی خصلت، ہرن کی چھلبل، چکور کی چال، مور کی طرح مست، تارے کی طرح چمکتی کوٹھوں پر دل چھیننے اور جان لینے کو بیٹھتی ہیں :

خونیں نگہاں ، کرشمہ کوشاں
ہم خنجر و ہم نمک فروشاں"

مولانا قبول محمد

"وہ سارنگیوں کی تھرتھراہٹ کے ہواؤں میں ہلکورے، وہ گھنگتے ہوئے طبلے، بالا خانوں کے چھجوں سے وہ مکھڑوں کی برستی ہوئی چاندنی اور زلفوں کے گرتے ہوئے سیاہ آبشار" جوش ملیح آبادی۔

"وہ فردوس گوش نغمہ ہائے جانگداز، وہ جنت نگاہ عشوہ ہائے ناز، وہ فضائے مشکبو، وہ صدائے ہاؤ ہو ــ گویا ایک سیلاب تھا رنگ و نور کا، ایک تلاطم تھا نشاط و سرور کا یا بقول غالب:

عرش سے تا فرش اک طوفان موج رنگ تھا"

نیاز فتحپوری

"باشندے یہاں کے ذکی، فہیم، عقل کے تیز"۔ سرور۔

"عام طور پر اپچی بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس ڈھال، تلوار اور پستول، بندوق ضرور ہوگی، حتیٰ کہ وہ لوگ جو کاروبار روزمرہ کرتے ہیں، وہ بھی تلوار ضرور باندھتے ہیں اور کوچہ گرد جب سر گشت کو نکلتے ہیں تو کمر میں پیچ کی جوڑی اور ڈھال (دونوں) لگائے ہوئے ہوتے ہیں"۔ ولیم نائٹن۔

"وہ ان کے لچکیلے سلام، وہ ان کی نشست و برخاست کے پاکیزہ انداز، وہ ان کی تہذیب میں ڈوبی ہوئی وضع قطع، وہ ان کے لباس کی انوکھی تراش خراش، وہ مسائل علمی و ادبی کی توضیح کے ہنگام، ان کے الفاظ کا ٹھیراؤ، وہ ان کے لہجوں کے کٹاؤ اثنائے غزلخوانی میں وہ حسب مفہوم شعر، ان کی آنکھوں کا رنگ اور ان کے چہروں کا اتار چڑھاؤ۔ وہ قہقہوں سے دامنکش ان کا ہلکا ہلکا تبسم، وہ ان کا انکسار کے سانچوں میں ڈھلا ہوا وقار اور باوجود کمال وہ ان کا ہاتھ جوڑ جوڑ کے اپنی ہیچدانی کا اعتراف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کرۂ خاک کے نہیں، کسی کرۂ نور کے باشندے ہیں"۔ جوش ملیح آبادی۔

"یہ وہ مبارک عہد ہے کہ رئیس و فقیر، امیر و وزیر، شاہ و گدا ــ غرض جس کے دل میں ذرا سا بھی سوز و گداز کا جوہر موجود ہے، وہ سخن فہم اور قدر سخن ہے۔

غرض اس وقت قدیم ایتھنس کی طرح علم و ہنر کا بحر مواج جوش زن تھا اور زباندانی اور مضمون آفرینی کا یہ شہر ایسا مرکز ہو رہا تھا کہ اس کی دلکش سیر گاہوں اور اس کے دلچسپ منظروں، میلوں، ٹھیلوں کی بہار دیکھنا۔ انسان کو ادب سکھانے کے لیے کافی تھا"۔ امیر احمد علوی۔

یہ شہر خراد ہے۔یہاں ہر فن کا استاد ہے۔ سیکڑوں گھامڑ، بدعقل کندہ ناتراش، طراف و جوانب سے ہفتہ عشرہ میں چھل چھلا وضعدار ہو گئے۔ کیا نستعلیق شہر ہے کہ بیرو نجات کے رئیس مرزا منش یہاں کے اہل حرفہ کی فصاحت پر کف افسوس ملتے ہیں!

"زبان و شاعری کے کمالات کے ساتھ لکھنؤ نے علم و فن میں بھی ہندوستان کے تمام شہروں سے زیادہ ترقی کی۔ اگر سچ پوچھیے تو علوم کے اعتبار سے لکھنؤ ہندوستان کا بغداد، قرطبہ اور اقصائے مشرق کا نیشا پور اور بخارا تھا"۔ شرر لکھنوی۔

لطف زبان کے لیے عام طور پر لوگ صنائع و بدائع میں بات کرتے تھے۔ سلطان العلما سید محمد صاحب مجتہد العصر کے بہت سے لطیفے کتابوں میں ملتے ہیں۔ وہ مقدمات کے فیصلے بھی صنائع و بدائع کی زبان میں لکھتے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک حکیم صاحب نے کسی کی زمین پر ناجائز قبضہ کر لیا۔ انھوں نے فیصلہ میں لکھا،

"حکیم صاحب رفع قبض نمائندہ۔"

سادہ بات چیت جہلا بھی نہیں کرتے تھے۔ سودے والوں کی صدائیں مشہور ہیں۔ لکڑیوں کو لیلیٰ کی انگلیاں، مجنوں کی پسلیاں، جامن کو کالی گھٹا کے کالے پھلیندے، گنڈیریوں کر برفی ڈلیاں، گولر کو شہد کی کپیاں کہہ کے بیچتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ لکھنؤ کی بان میں صنائع و بدائع کی زبان بن گئی تھی۔

تہذیب : حسن خلق، شیریں گفتاری و ادب کا شوق، موسیقی کا ذوق، تہذیب و متانت وقار و سنجیدگی، حسب مراتب سرو قد کھڑے ہو کے یا کر تک جھک کے سات سات تسلیمیں بجا لانا، نیچی نظریں، مودب نشست، چھوٹوں کو چشم و ابرو یا سرد

گردن کے اشارے، دوستوں کو "آداب عرض ہے" "تسلیمات عرض ہے" سے میں الف کی آواز کے اتار چڑھاؤ سے اشتیاق اور خلوص کا مفہوم پیدا کرتے ہیں۔ کھانسنا، چھینکنا، کھجانا، جمائی لینا، آداب مجلس کے خلاف ہے۔

خطاب و جواب میں لہجہ کی نرمی، الفاظ کی شیرینی، خنداں پیشانی، پروقار انکسار۔ پانچوں کپڑوں سے درست، شائستگی و متانت سے اٹھنا بیٹھنا، سکون و وقار سے راستہ چلنا، اپنے ہر انداز پر نگاہِ احتساب رکھنا کہ کوئی بات سنجیدگی کے خلاف نہ ہونے پائے۔ شیریں گفتاری کے ساتھ بردباری، انکساری کے ساتھ خودداری، لفظی و معنوی صنعتوں میں باتیں، بلیغ کنائے، لطیف اشارے، شعر کی تعریف میں اپنی ذہانت اور بلند ذوقی کا اظہار، بات چیت میں اشعار کا برمحل صرف، اہل کمال کی قدر، بزرگوں کی عزت، اپنی ہیچمدانی کا اظہار، بازاریوں کے الفاظ (لونڈا لپاڑہ، چاٹنا، جھوٹا، چوبٹا، ابے) سے اجتناب، شین قاف اور لب و لہجہ میں خواص و عوام کی یکسانی۔

شام: گھڑی دن چڑھے سے لکھنؤ پر بہار آتی ہے۔ بیشتر لوگ صاف ستھرے کپڑے پہن کے گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ کسی کا اپنے محلہ میں کسی جگہ نشست کا معمول ہے، کوئی کسی رئیس کے یہاں پابندی سے جاتا ہے، جہاں اور بہت سے مطائب و لطائف گو اور قصہ خواں شعرا اور محلہ کے خوش مذاق لوگ اکٹھا ہوتے ہیں۔ ہر ایک کے آگے حقہ اور خاصدان رکھا جاتا تھا۔ گرمیوں میں فالسے یا خربوزہ کی برف اور جاڑوں میں کشمیری چائے سے تواضع کی جاتی تھی۔ کبھی لطیفے، کبھی شعر و سخن، کبھی نغمہ و سرود سے محفل گرم ہوتی۔ کچھ لوگ تفریح کے لیے چوک کا رخ کرتے، جہاں اکثر دکانیں ہم مذاق احباب کا اڈہ ہوتی تھیں۔ کچھ محض چہل قدمی کی غرض سے جاتے تھے۔ مختلف وضع کے لوگوں کی چال ڈھال بھی ان کی وضع کی مناسبت سے ہوتی تھی۔ بانکے اپنے مخصوص رنگ کے لباس میں چھری کٹاری اور تمنچے سے لیس اینڈتے پھرتے۔

سپاہی ڈھال تلوار، چھری کٹاری لگائے، اکڑتے ہوئے، شرفائے چو گوشیہ

وہی انگرکھا پہنے، تلوار کمر سے باندھے تفریح کے لیے نکلتے اور کوئی تسبیح ہاتھ میں لیے جھکائے چوک سے راستہ طے کرنے کی غرض سے گذرتا۔ لکڑ والے اپنے مخصوص لباس میں حقہ اور بہشتی مشکیزہ لیے کٹورا بجاتے ٹہلتے رہتے تھے .... خوش اخلاق اتنے کہ ہر ایک کو خنداں پیشانی سے پلاتے اور پیسا نہ مانگتے۔

تحسین کی مسجد کا چوک کی طرف کا رخ شعرا، ادبا اور پڑھے لکھے لوگوں کا اڈہ تھا۔ میر تقی میر وہیں بیٹھتے تھے، جب نواب سعادت علی خاں کی سواری گزری اور دونوں کی ملاقات ہوئی، جس کا ذکر "آب حیات" میں ہے۔ سارا مجمع صاف ستھرا

جو شکل نظر آئی ۔ تصویر نظر آئی

شعرا کے یہاں شاگردوں کے مجمع اور سیف سخن پر صیقل کا وقت بھی یہی تھا۔ طلبا کا درس بھی اسی وقت شروع ہوتا تھا اور علما کے درس کا ہنگامہ بھی اسی وقت برپا ہوتا۔ کوئی محلہ ایسا نہ ہوتا، جہاں متعدد علما کی مسند درس بچھتی ہو اور اس کے حاشیہ پر طلبا کا جم غفیر نہ ہو۔

شفا و اشارات کے غوامض، صدرا و شمس بازغہ کے مطالب اور افق المبین کی نہیں معلوم کتنی گتھیاں سلجھا کے لکھنؤ کا آفتاب ڈوبتا اور اذان مغرب سے فضا گونجتی، رات کی تاریکی خیمہ لگاتی اور ساز و آہنگ کی لہریں ناچنے لگتیں۔ اس نغمہ و سرود والی رات میں، اسی کیف و سرور والی رات میں اسی ناز و نیاز والی رات میں ایسے گوشے بھی تھے، جو عبد و معبود کے راز و نیاز سے روشن ہو جاتے۔ تسبیح و تہلیل کی آوازیں بلند ہوتیں اور صلوٰۃ نیم شبی سے محراب عبادت گونجتی اور رات کی اسی ہنگامہ خیزی میں ہزاروں اشہب قلم میدان تحقیق میں اس طرح دوڑتے کہ سینا و فارابی کی روح پھڑک جاتی۔

صبح: جب صبح کا قافلہ منزل شب طے کر کے افق لکھنؤ پر اترتا تو نہیں معلوم کتنی حسن و عشق کی داستانیں بناتے، فلسفہ و منطق کے کتنے مسئلے حل کر کے، ادب و شعر

کے کتنے دفتر مرتب کر کے رات رخصت ہوتی اور اذان صبح کے ساتھ نغمہ و آہنگ کا سیلاب تھمتا۔ رات کے جاگے اور تھکے ہوؤں کو خستگی بستر پر ڈال دیتی۔ نسیم صبح گاہی کے جھونکے خواب سحر گاہی کا پیغام دیتے اور آفتاب نئے ہنگاموں کا سیلاب ڈھکیلتا افق سے سر نکالتا۔ اکھاڑوں میں پہلوانوں کا زور، گلی گلی اور گھر گھر ورزش اور سپہ گری کی مشق سے لکھنؤ پہلوانوں کا شہر معلوم ہوتا تھا۔ اطبا کے مطب کا ہنگامہ، کہاروں کا ڈولیوں پر مریضوں کو لانا، سودے والوں کی آوازیں، کھیر کے پیالے، نمش کی قفلیوں کی صدائیں، بالائی کے سکورے، دودھ کی ہانڈیاں گھروں میں عورتیں مثتی پھرتی تھیں۔ شیرمال، نانفتان، کلچے، نہاری، بالائی کی دکانوں پر ہجوم، طلبا کا کتابیں بغل میں دبائے اساتذہ کے یہاں جانا۔ گھڑی دن چڑھے سے دکانیں کھلنا شروع ہو جاتیں۔ کاروباری لوگ تیزی سے اپنے کام میں مشغول ہو کر سہ پہر کے ہنگامہ کی تیاری شروع کر دیتے۔

عقیدہ : اہلبیت رسولؐ کی فضیلت و برتری اور ان کی صورت کے وجوب کا عقیدہ عام تھا۔ ان کے فضائل کا بیان عبادت تھی، ان کے ناموں پر نام رکھے جاتے تھے، ان کے ناموں کی قسمیں کھائی جاتی تھیں۔ رات کو پہرہ دینے والے "یا علی حیدر!" کی آواز لگا کے پہرہ دیتے تھے، فقیر مناقب پڑھ کے بھیک مانگتے تھے۔ صبح کے وقت راستے، گلیاں مناقب کی آواز سے گونجنے لگتی تھیں۔

مجلسیں : بڑی شان اور اہتمام سے مجلسیں ہوتی تھیں۔ ایک لمبے چوڑے دالان میں، جو جھاڑ اور کنول سے آراستہ ہوتا تھا، چاندنی کا سفید براق فرش بچھایا جاتا تھا، جس میں شکن کا نام نہیں۔ جگہ جگہ میر فرش اور قطار سے اگالدان رکھے جاتے تھے۔ لوگوں کی آمد کے ساتھ حقے آنا شروع ہوتے تھے۔ گرمیوں میں زعفرانی شربت --- پستے کی ہوائیاں چھڑکی ہوئیں --- بہت میٹھا اور جاڑے میں کشمیری چائے، جس میں بالائی چھان کے اور زعفران حل کر کے ڈالی جاتی تھی --- مٹھاس تیز، لب دوز، لب سوز، لبریز۔

ختم مجلس پر کاغذی ہانڈیوں میں کم از کم سوا پاؤ نہیں تو سوا سیر برنی یا مٹی کے طباق میں پلاؤ اور اس پر قورمہ کا پیالہ اور شیرمال رومال میں بندھی ہوئی تقسیم ہوتی تھی۔

بڑے ذاکر ایسی ہی مجلسوں میں پڑھتے تھے، جن کے منعقد کرنے والے روسا ہوتے تھے۔ وہ مجلس پڑھنے والے کو ایک معقول نذرانہ بھی پیش کرتے تھے۔

جس مجلس کے لیے اتنا اہتمام اور اتنا خرچ کیا جاتا تھا، اس میں یہ کس طرح ممکن تھا کہ دس، پندرہ منٹ کی ذاکری پر ختم کر دی جائے۔ ولیم نائٹن نے شاہی مجلس کے بیان میں لکھا ہے کہ پہلے سوز خوانوں کے کئی جوڑ سوز خوانی کرتے تھے۔ اس کے بعد واقعہ خوان، مرثیہ خوان اور حدیث خوان پڑھتے تھے۔ اس طرح کئی گھنٹے مجلس جاری رہتی تھی۔

اس زمانہ میں کوئی ایسا کامل فن نہ تھا، جو سب پر بھاری ہو اور مجمع سب سے زیادہ اس کا مشتاق ہو۔

مرثیہ : نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں میر ضمیر نے مرثیہ میں جدتیں کیں، طولانی مرثیے کہے اور راگ سے پڑھنے کے بجائے، ایک خاص طرز ایجاد کیا۔ اس کا نام تحت لفظ قرار پایا۔ اس میں پاٹدار آواز سے حسب مفہوم اسی ٹھاٹھ اور پیترے سے پڑھا۔ یہ طریقہ بہت موثر ثابت ہوا۔ اس نے مجمع پر ایک کیفیت طاری کر دی اور اسے مقبول بنا دیا۔

ایک طرف میر ضمیر کا شاعرانہ کمال اور دوسری طرف مرثیہ میں جدتیں، اس پر نئے طرز خواندگی کی ایجاد سے اس وقت کی تمام قسم کی ذاکری پر مرثیہ چھا گیا اور سوز خوانی، کتاب خوانی، حدیث، سب اس کے سامنے ہیچ ہو گئی اور انھوں نے مرثیہ کو طولانی بنا کے کسی اور قسم کی ذاکری کی اپنے ساتھ ضرورت باقی نہیں رکھی۔

اب مجلس کا اصل مقصد میر ضمیر کو سننا تھا۔ مجلس جمانے کے لیے کچھ دیر سوز خوانی اور پیش خوانی ہوتی تھی۔ اس کے بعد وہ زیب منبر ہوتے تھے اور رزم،

بزم، مناظرِ قدرت کی تصویر کشی سے مجمع کو مسحور کر دیتے تھے۔

یہ مرثیہ لکھنؤ کی تہذیب کا مرقع ہے۔ بات چیت کے موقع پر لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے، رسم و رواج کے محل پر لکھنؤ کے رسم و رواج ہیں۔ سپاہیانہ زندگی ہر جگہ نمایاں ہے۔ عشق و عاشقی کی عمومیت سے گھوڑے اور تلوار کی تعریف ۔۔ سراپا کے بیان میں بڑا لطیف تغزل ہے، صنائع و بدائع کا بہترین استعمال ہے۔ اہلبیت سے عقیدت کی وجہ سے ان کے فضائل و مصائب کے بیان میں بڑا اہتمام ہے اور واقعہ کے تمام اجزا کی بنیاد اخلاقیات پر ہے۔ اس طرح مرثیہ اخلاق کا ایک دفتر ہے، جس کی تفصیل مرثیہ کی بحث میں آئے گی۔

مشاعرے : بڑے اہتمام سے مشاعرے ہوتے تھے۔ لوگوں کا آنا، حاضرین کا حسبِ مراتب تعظیم کے لیے اٹھنا، مشاعرہ شروع ہوتے ہی مصرعوں کا اٹھایا جانا، آہاہا، واہ وا، سبحان اللہ کا شور، ادبی نکتوں اور شاعرانہ لطافتوں کی داد دہی، نو مشقوں کی غلطی پر نہایت مناسب اور مہذب طریقہ سے اشارے لکھنؤ کے مشاعروں کی خصوصیت تھی۔

کم و بیش یہی تمدن ہمارے زمانہ تک قائم تھا۔ ایک واضح فرق یہ ہو گیا تھا کہ انگریزوں نے ہتھیار لے لیے تھے۔ اب صرف باندھنے کی ہردتی مہندی سے سرخ تیل پی ہوئی اعلا درجہ کی یورپین بنی ہوئی ۔۔ اوپر چاندی کی موٹھ، نیچے لوہے کی شام ۔۔ ایک انچ موٹی نیچے، آدھ انچ سے بھی کم گاؤدم سینے تک لمبی، پرانی وضع کے لوگوں کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ اگر کسی کو اتفاق سے کام لینے کا موقع مل گیا تو یہی شمشیر جوہر دار تھی، جو خون کی ندیاں بہا دیتی تھی۔ یہ حسن خلق تھا کہ کسی گھر یا کسی محلہ میں کسی سے لڑائی نہیں ہوئی اور لکڑی نہیں چلی، بس فرقہ وارانہ فسادات میں اس فن کا مظاہرہ ہو جاتا تھا۔ لوگوں کی بھنکیتی اور جیالے پن کے برسوں چرچے رہتے تھے۔ اس سب کا اثر زبان و شاعری پر نمایاں ہے۔

شیعیت کے اثر سے صوفیت کا خاتمہ ہوا۔

عورت معاشرہ پر چھائی ہوئی تھی ۔ وہ غزل کا موضوع بنی ۔ غزل میں بھی نہایت لطیف ، سپاہیانہ انداز پیدا ہوا ۔ زبان صاف ستھری فارسیت کے غلبہ سے محفوظ ، صنائع و بدائع کا بہترین استعمال ہے ۔ تہذیب و شائستگی کے اثر سے ہر موضوع کے اظہار میں سنجیدگی اور متانت ہے ۔

نفاستِ طبع سے ذوق اتنا پاکیزہ ہے کہ کسی چیز اور کسی بات میں بھونڈا پن باقی نہیں رہا اور پورے ہندوستان ، بلکہ دنیا بھر ، میں لکھنؤ کی تہذیب اور تمدن کا شہرہ ہو گیا ۔

مولانا سلیمان ندوی کا بیان ہے :

"مولانا شبلی نفاست پسندی کی وجہ سے لکھنؤ کے تمدن کو دہلی کے تمدن پر ترجیح دیتے تھے ۔" (حیاتِ شبلی)

یہی زبان و شاعری کا امتیاز ہے ۔ "ایام" بغیر عطف و اضافت اہل لکھنؤ نہیں بولتے ۔

کبھی قبلہ رو جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا

لکھنؤ کا شاعر نہیں کہہ سکتا ۔

خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

اگر لکھنؤ کا شاعر کہے تو چٹکیوں میں اڑا دیا جائے ۔

انشائیہ　　　　　　مولانا محمد باقر شمس

لکھنؤ کی صبح و شام

جب صبح کا قافلہ منزلِ شب طے کر کے افقِ لکھنؤ پر اترتا تو نہیں معلوم کتنی حسن و عشق کی داستانیں بنا کے، فلسفہ و منطق کے نکتے حل کر کے، ادب و شعر کے کتنے دفتر مرتب کر کے رات رخصت ہوتی اور اذانِ صبح کے ساتھ نغمہ و آہنگ کا سیلاب تھمتا۔ رات کے جاگے اور تھکے ہوؤں کی خستگی بستر پر ڈال دیتی اور نسیمِ صبح گاہی کے جھونکے خوابِ سحر گاہی کا پیغام دیتے اور آفتاب نئے ہنگاموں کا سیلاب ڈھکیلتا افق سے سر نکالتا۔ اکھاڑوں میں پہلوانوں کا زور، گلی گلی اور گھر گھر ورزش اور سپہ گری کی مشق سے لکھنؤ پہلوانوں کا شہر معلوم ہوتا ہے۔ اطبا کے مطب کا ہنگامہ، کہاروں کا ڈولیوں پر مریضوں کو لانا، سودے والوں کی آوازیں، کھیر کے پیالے، نمش کی قلفیوں کی صدائیں، بالائی کے سکورے، دودھ کی ہانڈیاں گھروں میں عورتیں بیچتی پھرتی تھیں۔ شیرمال، تافتان، کلچے، نہاری اور بالائی کی دکانوں پر ہجوم، طلبا کا کتابیں بغل میں دبائے اساتذہ اور مدارس کی طرف جانا۔ گھڑی دن چڑھے سے دکانیں کھلنا شروع ہوتیں اور کاروباری لوگ تیزی سے اپنے کام میں مشغول ہو کے سہ پہر کے ہنگامہ کی تیاری شروع کر دیتے۔

یہ ہے لکھنؤ " مثل جس کا کوئی دنیا میں نہیں "۔ اس کی تاریخ دلچسپ بھی ہے۔ حیرت انگیز بھی ہے، عبرت خیز بھی ہے اور قابلِ فخر بھی۔ اس واسطے اسے ضبطِ تحریر میں لانا اور دنیا کے سامنے پیش کرنا قومی فریضہ تھا۔ جس کو میں نے انجام دینا ضروری سمجھا۔

لکھنؤ کی شام : گھڑی دن چڑھے لکھنؤ پر بہار آتی ہے۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے پرانے لوگ جریب، نوجوان چھڑی ہاتھ میں لیے سڑکوں اور گلیوں میں نظر آتے

ہیں - کسی کا محلہ میں کسی کے یہاں بیٹھنے کا معمول ہے - بعض دکانیں احباب کا اڈہ ہیں - کمپنی باغ تفریح گاہ ہے - گرمیوں میں بینچوں اور گھاس پر احباب کی ٹولیاں ہوتی ہیں ، دلچسپی کی باتیں اور شعرو شاعری ہوتی ہے -

حضرت گنج لندن کا بازار معلوم ہوتا ہے - امین آباد فینسی چیزوں کا بازار ہے چینی کے برتن ، گھڑیاں ، سائیکلیں ، بچوں کی گاڑیاں ، اعلا قسم کے کپڑے ، جوتے ، ٹوپیاں ، کتابیں اور طرح طرح کے سامان کی بڑی بڑی دکانیں ہیں - ایسا عمدہ سامان شہر میں کہیں اور نہیں ملتا - چاروں طرف دکانیں ---- بیچ میں بہت بڑا پارک ہے ، جس میں سبزہ لگا ہے ، جہاں لوگ بیٹھتے ہیں اور دلچسپی کی باتیں کرتے ہیں اور نمازِ مغرب جماعت سے پڑھتے ہیں - مجمع کی کثرت سے کھوئے سے کھوا چھلتا ہے -

وکٹوریا اسٹریٹ یہاں ایک طرف بزازا ہے ، دوسری طرف ہر قسم کی دکانیں ہیں -

پارچہ والی گلی : یہ کڑھی ہوئی دوپلی ٹوپیوں اور کرتوں کا بازار ہے -

چاول والی گلی : سونے چاندی کے زیور اور دلہن دولھا کے پرتکلف جوڑوں کی یہاں دکانیں ہیں ، جہاں یہ سب چیزیں کرایہ پر ملتی ہیں -

چوڑی والی گلی : یہاں صرف چوڑیوں کی چھوٹی بڑی دکانیں ہیں -

پھول والی گلی : یہ گلفروشی کا بازار ہے -

یحییٰ گنج : یہاں تانبے اور پیتل کے برتنوں کی بڑی بڑی کوٹھیاں ہیں - اسی کے برابر مسی گر اور قلعی گروں کی دکانیں ہیں -

میوہ والی سرائے : یہ اچار ، چٹنی ، سرکہ ، عرق نعناع اور مربوں کا بازار ہے -

ڈالی گنج : یہ غلہ کی بہت بڑی منڈی ہے - ہر بازار کی ایک خاص خصوصیت اور اس کی چہل پہل کی خاص نوعیت ہے -

چوک کی سڑک دراصل لکھنؤ کی شہ رگ ہے ، جس میں خون کی جگہ شراب و

شکر جاری و ساری ہے۔

"ساری دنیا میں آفتاب چاہے جب طلوع ہو، لیکن یہاں طلوع ہوتا ہے شام ہی کو اور جب صبح ہوتے ہوتے وہ غروب ہوتا تو خدا جانے حسن و محبت کی کتنی داستانیں اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ جھٹپٹا ہوتے ہی وہ پردہ گیان حریم ناز کا اہتمام دلربائی، وہ "یان بزم سوز و ساز کی جلوہ فرمائی۔" نیاز فتحپوری۔

"کوئی گوری، کوئی چمپئی، کوئی سانولی۔ خدوخال اس قدر باریک، گویا ہیرے کے قلم سے ترشے ہوئے ہیں۔ کوئی کڑیل جوان، کوئی نوجوان، کوئی ان دونوں کے درمیان۔ بھکتی ہوئی اٹھان، کوئی گٹھے جسم کی، کوئی دھان پان، کسی کی ناک میں نتھ کسی کی ناک میں نیم کا تنکا"۔ جوش ملیح آبادی۔

"ہر ایک حسن میں یکتا۔ چاند سا چہرہ، کالے کالے بال، پھول سے گال، سرو سا قد، حور کی صورت، پری کی خصلت، ہرن کی چھلبل، چکور کی چال، مور کی طرح مست، تارے کی طرح چمکتی کوٹھوں پر دل چھیننے اور جان لینے کے لیے بیٹھتی ہیں:

خونیں نگہاں ، کرشمہ کوشاں
ہم خنجر و ہم نمک فروشاں "

مولانا قبول محمد

"وہ سارنگیوں کی تھرتھراہٹ کے ہواؤں میں ہلکورے، وہ گھنکتے ہوئے طبلے، بالاخانوں کے چھجوں سے وہ مکھڑوں کی برستی ہوئی چاندنی اور زلفوں کے گرتے ہوئے سیاہ آبشار۔" جوش ملیح آبادی۔

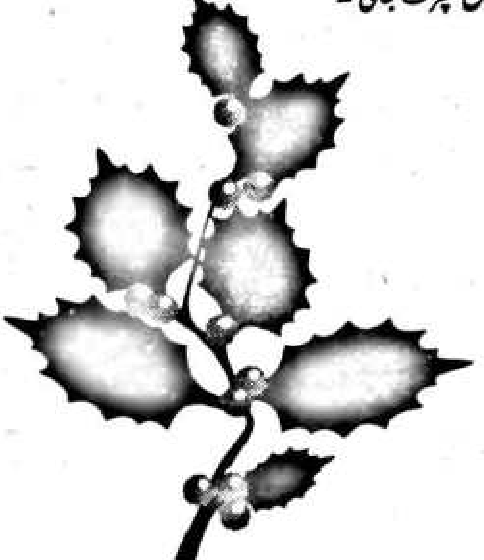
"وہ فردوس گوش نغمہ ہائے جانگداز، وہ جنت نگاہ عشوہ ہائے ناز، وہ فضائے مشکبو، وہ صدائے ہاؤ ہو ــــ گویا ایک سیلاب تھا رنگ و نور کا، ایک تلاطم تھا نشاط و سرور کا یا بقول غالب:

عرش سے تا فرش اک طوفان موج رنگ تھا۔

نیاز فتحپوری

شعرا کے یہاں شاگردوں کے مجمع اور سیف سخن پر صیقل کا وقت بھی یہی تھا اطبا کا درس بھی اسی وقت شروع ہوتا تھا اور علما کے درس کا وقت بھی یہی ہوتا۔ کوئی محلہ ایسا نہیں ہوتا، جہاں متعدد علما کی مسند درس بچھتی ہو اور اس کے حاشیہ پر طلبا نہ ہوں۔

شفا و اشارات کے غوامض، صدرا و شمس بازغہ کے مطالب اور افق المبین کی نہیں معلوم کتنی گتھیاں سلجھا کے لکھنؤ کا آفتاب ڈوبتا اور اذان مغرب سے فضا گونجتی، رات کی تاریکی خیمہ لگاتی اور ساز و آہنگ کی لہریں ناچنے لگتیں۔ اسی نغمہ و سرود والی رات میں، اسی کیف و سرور والی رات میں، اسی ناز و نیاز والی رات میں ایسے گوشے بھی تھے، جو عبد و معبود کے راز و نیاز سے روشن ہو جاتے۔ تسبیح و تہلیل کی آوازیں بلند ہوتیں اور صلوٰۃ نیم شبی سے محراب عبادت گونجتی اور رات کی اسی ہنگامہ خیزی میں ہزاروں اشہب قلم میدان تحقیق میں اس طرح دوڑتے کہ سینا و فارابی کی روح پھڑک جاتی۔



مولانا باقر شمس

لکھنؤ کی مادری زبان و بیگماتی زبان

لکھنؤ میں جو زبان گھر کے اندر بولی جاتی ہے، وہ اہل لکھنؤ کی مادری زبان ہے، جو عورتوں کی بنائی ہوئی ہے۔ تمام علما، فضلا، شعرا، ادبا گھر کے اندر یہی زبان بولتے ہیں۔ لکھنؤ کی شریف زادیاں مردوں کی طرح ثقیل لفظیں اور ترکیبیں بولنا اپنی نسوانیت کے خلاف سمجھتی ہیں۔ مثلاً: مرد کہتے ہیں "آداب بجالاتا ہوں"، "تسلیمات عرض کرتا ہوں" عورتیں صرف "تسلیم" کہتی ہیں اور "لیم" کی آواز کو کھینچ کر اس میں اتار چڑھاؤ پیدا کر کے، محبت اور اشتیاق کا مفہوم پیدا کرتی ہیں، مگر بزرگوں کو صرف "تسلیم" کہتی ہیں، جس میں اتار چڑھاؤ نہیں ہوتا۔ مرد کہتے ہیں: مزاج عالی، مزاج اقدس، مزاج مقدس، مزاج معلیٰ، مزاج گرامی، مزاج مبارک۔ عورتیں کہتی ہیں: کیسی ہو، اچھی ہو، خیریت سے ہو، سب خیریت ہے۔ بزرگوں سے مزاج پرسی نہیں کرتیں، نہ بزرگ خوردوں سے مزاج پرسی کرتے ہیں۔ یہ خوردی اور بزرگی کے آداب ہیں۔ مرد کہتے ہیں: "کربلائے معلیٰ"، عورتیں "دُھری کربلا" کہتی ہیں۔ لکھنؤ میں کربلائیں بہت ہیں، جو اپنے بانی یا مقام کے نام سے مشہور ہیں۔ جیسے: پار کی کربلا، دیانت الدولہ کی کربلا، تال کٹورے کی کربلا.... اس وجہ سے عورتیں "کربلائے معلیٰ" کو "دُور کی کربلا" کہتی ہوں گی، جو رفتہ رفتہ "دُھری کربلا" ہو گئی۔

اس کے علاوہ بہت سی لفظیں عورتوں نے اپنے مزاج کے موافق بنالی ہیں۔ جیسے: نعوذ باللہ کو نوج، صحنک کو سرنَک، جزوی کو جزبی، مسمار کو بسمار، من و سلویٰ کو سلومن، برکت کو بھدرک، طعن و طنز کو تان تروز، صبر کو صَبَر، صبر و شکر کو صَبَر

شکر (صبر کی "ب" اور شکر کا "ک" مفتوح) ۔ اس کے علاوہ بہت سی لفظیں، محاورے، روزمرہ اور ضرب المثل عورتوں کے بنائے ہوئے ہیں، جو انھیں کے ساتھ مخصوص ہیں، مرد نہیں بولتے ۔ اس کے علاوہ عورتوں کی بنائی ہوئی لفظیں بہت سی ہیں جنھیں مرد بھی بولتے ہیں ۔ مثلاً: افیون کو افیم، بہم کو گھم، تنور کو تندور، لیمو کو نیبو، کباب کو کواب، سیخ کو سیک، سیک کے کواب، بوٹیوں کے کواب، تکیہ کے کواب، پتیلی کے کواب، نیبو کا آبشورہ، تندوری پراٹھے زبان زد ہے ۔ نیبو نہاری کا ساتھا ضرب المثل ہے ۔ ہم نے کسی عالم سے بھی تنوری پراٹھے اور لیموں کا آبشورہ نہیں سنا ۔ برہمن کو بھمن سب کی زبان پر ہے ۔ ان میں سے بہت سے الفاظ شعرا نے نظم بھی کیے ہیں ۔ مصحفی کا مصرع ہے:

شفق شام نے بھی شام سے کھائی ہے افیم

آرزو صاحب کہتے ہیں:

گھم بات پہیلی ایسی، کوئی نہ بوجھے جس کو بجھائے

ظریف صاحب کا مصرع:

یہ فقط نیبو لگا کر ہیں کھجاتے داد قوم

ان کا شعر ہے:

ماش کی دال جو بھمن کو ملی کھانے میں
جا کے ناقوس بجانے لگا بتخانے میں

اس طرح کے بہت سے الفاظ ہیں، جو تلاش سے شعرا کے یہاں مل جائیں گے ۔

لکھنئو میں جو گھر دیوار بیچ ہوتے ہیں، ان کی دیوار میں اتنی بڑی کھڑکی ہوتی ہے کہ آدمی جھک کے نکل جائے ۔ جب ایک گھر میں کوئی مرد نہیں ہوتا تو دوسرے گھر کی عورتیں کھڑکی سے دوسرے گھر میں چلی جاتی ہیں اور بات چیت کر کے دل بہلا

لیتی ہیں ۔ کبھی گھر میں کوئی اور نہ ہوا صرف بچے ہوئے تو کھڑکی میں بیٹھ کر بات کر لیتی ہیں ۔ اس طرح گھر کی بھی خبر رہتی ہے ۔

آج ہم آپ کو لکھنؤ کی دو بیگموں کی بات چیت سناتے ہیں ۔ ایک کا نام نزکن بیگم ہے، دوسری کا کامنی بیگم ۔

لکھنؤ کی بیگماتی زبان

نزکن بیگم اپنے گھر کی کھڑکی سے کامنی بیگم کے گھر جاتی ہیں :۔

نزکن بیگم : بہن ! تسلیم ۔

کامنی بیگم : تسلیم ! آج کہاں بھول پڑیں ۔

نزکن بیگم : کیا بتاؤں ، سارا دن بکھس بڑ کرتے گذرتا ہے ۔ دم مارنے کی مہلت نہیں ملتی ۔ آج بہت سے کام تج کے تم سے ملنے آئی ہوں بہت دن سے تمھیں نہیں دیکھا تھا ۔ جی لگا تھا ۔

کامنی بیگم : ایک ماما رکھ لو ۔

نزکن بیگم : رکھی تھی ، موئی دیدہ پھٹی ۔ چپ تختی دکھاتی ، پانچ پھولوں میں تلتی ، پان کی گلوری کلّے میں دبی ۔ آئی ، جھپا جھپ چار برتن مانجھے ، کھانا پکایا ، وہ بھی گت کا نہیں ۔ کبھی برنج تیز ، کبھی نمک ، جانے کی جلدی میں اہل دلی سے کام نہیں کرتی تھی ۔

کامنی بیگم : کوئی چربانک ہوگی ۔

نزکن بیگم : ہاں ! ایک دن کھانا پکاتے میں سر جھکا کے کن انکھیوں سے میرے میاں کی طرف دیکھ کے مسکرائی ۔ میں نے دیکھ لیا ۔ اسی وقت اس کا حساب کر دیا ۔

کامنی بیگم: تمھارے میاں تو کلیجا پکڑ کے رہ گئے ہوں گے۔

نرگس بیگم: نہیں! وہ ایسے نہیں ہیں۔ مجھ سے کہتے ہیں،

"میں کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتا۔"

کامنی بیگم: تم مردوں کے چُن فن سے واقف نہیں۔ تمھارے میاں تم سے میٹھی میٹھی باتیں کر کے تمھارا دل رکھ لیتے ہیں۔ تم سمجھتی ہو کہ مجھی تک ہے۔ میرے میاں جب مجھ سے چکنی چپڑی باتیں کرتے ہیں تو میں کہتی ہوں،

"چلو! مجھے جو چوچو اچھی نہیں لگتی۔ دن کا دن غائب رہتے ہو۔ آدھ رتیا کو آتے ہو۔ میں گھر میں بیٹھی گھڑیاں گنتی رہتی ہوں۔ اب آتے ہوں گے، اب آتے ہوں گے۔ آئے ان کی بلا! وہ کہتے ہیں،

"کیا میں گھر گھسنا ہوں، جو گھر میں بیٹھا رہوں؟" میں کہتی ہوں،

"میں نے کب کہا کہ دن بھر گھر میں بیٹھے رہو۔ آدمی وقت سے گیا، وقت سے آیا۔ تم رات گئے تک کیا کرتے ہو؟" وہ کہتے ہیں،

"کمانے کی فکروں میں لگا رہتا ہوں۔" میں کہتی ہوں،

"مجھے تو بندھی ہوئی تنخواہ لا کے دیتے ہو۔ وہ کمائی کس کے کلیجے میں اتر جاتی ہے؟"

وہ: آخر میرے بھی تو کچھ اخراجات ہیں۔

میں: وہ کون سا خرچ ہے، جو مجھ سے چھپا کے کیا جاتا ہے؟

وہ : تم سے بحث کون کرے۔

جب میں دھر بگیر کرتی ہوں تو بنائے نہیں بنتی۔ غٹ غوں کر کے رہ جاتے ہیں۔

نزکن بیگم : میرے میاں ایسے نہیں ہیں۔

کامنی بیگم : اچھا ہے! تم یہی بھتی رہو۔ تمھارا کلیجا تو ٹھنڈا ہے۔

نزکن بیگم : بٹیا کہاں ہیں؟

کامنی بیگم : باجی اماں کے یہاں رتجگے میں گئی تھیں۔ صبح ہوتے آئی ہیں۔ سو رہی ہیں۔

نزکن بیگم : خدا رکھے! اب کیا سن ہو گیا؟

کامنی بیگم : اُنگنا برس ہے۔

نزکن بیگم : اب تو شادی کا سن آگیا۔

کامنی بیگم : ہاں! جب خدا چاہے گا، سہرے کے پھول کھلیں گے۔

نزکن بیگم : تمھارے ماموں کے لڑکے کی تو ٹھیکرے کی منگیتر ہے۔ اس کے ساتھ کر دو۔

کامنی بیگم : دوئی بیوی! تم کہاں رہتی ہو۔ اس کی تو شادی بھی ہو گئی۔

نزکن بیگم : سچ کہو! کہاں ہوئی؟

کامنی بیگم : خالہ کی لڑکی سے۔

نزکن بیگم : جہیز کیا ملا؟

کامنی بیگم : جہیز کی بھلی چلائی۔ وہی ماں کے بوری بوری کچھ جوڑے۔ انھیں کے ہاتھ گھلے کے دو چار نوتنگ چھلے، تانبے کے دو چار ٹھیکرے۔ موئی پچھیا بہمن کے نام۔

نزکن بیگم : چلو! دو سر تو جڑ گئے۔ جہیز کے دن کا۔ صورت شکل کیسی ہے؟

کامنی بیگم: چندے آفتاب، چندے ماہتاب، بوٹا سا قد، کامنی سی صورت، نکھ سکھ سے خوبصورت۔

نزکن بیگم: میاں کا کیا حال ہے؟

کامنی بیگم: دیکھے جیتا ہے۔

نزکن بیگم: پھر کیا چاہیے۔ پیٹ سے ہے؟

کامنی بیگم: دوئی بیوی اکل پڑی بوند، آج نام میاں محمود۔ ابھی شادی کو کے دن ہوئے ہیں۔

نزکن بیگم: تخت کا بھی ہوتا ہے۔

کامنی بیگم: اگر تخت کا بھی ہے تو دو، چار مہینے میں کھلے گا۔

نزکن بیگم: تمھارے جیٹھ کا لڑکا بھی تو سمجھدار ہو گیا ہے۔

کامنی بیگم: میں تو اس گھر میں اپنی لڑکی نہیں دوں گی۔ جیسا باپ ہے، ویسا ہی بیٹا ہو گا۔

نزکن بیگم: ان میں کیا کیڑے پڑے ہیں؟

کامنی بیگم: تمھیں نہیں معلوم۔ ملکہ بیگم پوتڑوں کی رئیس زادی بے اولادی تھیں۔ یہ ان کے مکان کے پاس رہتے تھے۔ لمبی ڈاڑھی، ہاتھ میں تسبیح۔ مُقطع چُقطع بنے رہتے تھے۔ وہ سمجھیں دیندار آدمی ہے، اپنے وقف کا متولی بنا دیا۔ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی یہ متولی ہو گئے۔ نیک کام جتنے تھے، سب بند کر دیے اور گلچھرے اڑانے لگے۔ بیواؤں کی جو تنخواہ بندھی تھی، وہ بھی بند کر دی۔ جب انھوں نے تقاضا کیا تو کہا،

"مجھے معلوم ہو گیا ہے تم لوگ بیوہ نہیں رہیں۔" الٹی آتیں ان کے گلے میں ڈال دیں۔ وہ بیچاریاں عزت، آبرو والی

تھیں ۔ سوچیں کہ داد فریاد کروں گی تو یہی الزام لگائیں گے ۔
مفت میں رسوائی ہوگی ۔ صبر کر کے بیٹھ رہیں ۔ اندھے کی داد ،
نہ فریاد ۔ اندھا مار بیٹھے گا ، والی ہائی ہوئی ۔

نزکن بیگم: کوئی پوچھنے والا نہیں ؟

کاسنی بیگم: اس کا بھی قصہ ہے ۔ باپ بڑا بیٹا سمجھ کے اپنی ساری جمع پونجی
انھیں دے گئے تھے کہ میرے بعد حصہ رسد بانٹ دینا ۔ سب
ان کے پیٹ میں اتر گئی ۔ میں نے اپنے میاں سے کہا ۔
" تم کیوں دبڑو گھسڑو بنے ہو ۔ اپنا حصہ کیوں نہیں
مانگتے ۔" انھوں نے کہا ۔
" میں بڑے بھائی سے لڑائی مول نہیں لوں گا ۔" بہن
بھی چپکی ہو رہیں ۔ سوتیلا بھائی دشمن ہو گیا ۔ اس نے اپنے
حصہ اور وقت کی حساب فہمی کی نالش کرنا چاہی ۔ نواب
دلارے مرزا ان کے ولی کھنگو آڑے آگئے ۔ اس کو بلا کے ، نیچ
اونچ دکھا کے تو تمبو کر دی ۔ اب وہ چین سے ہو گئے ۔ ڈاڑھی
بلتی رہتی ہے ، تسبیح چلتی رہتی ہے ، رام رام جپنا ، پرایا مال اپنا
کرتے رہتے ہیں اور نواب دلارے مرزا کی نقلے نویسی میں لگے
رہتے ہیں ۔ وہی ان کی برائیوں کو دبو دبو کر دیتے ہیں ۔ جس کا
مال ہتھے چڑھا ، دم غلق میں ۔ اگر اس نے فریاد کی تو ایسا پھندا
اس کے گلے میں ڈالا کہ اف نہ کر سکا ۔ اگر کنویں بانس ڈالو گی
تو ایسا قابوچی نہیں ملے گا ۔ جس دن ستر بھوت پیدا ہوئے تھے ،
اس دن وہ پیدا ہوئے تھے ۔ غضب خدا ! چھوٹے بھائی بہن کا
حصہ ہضم کر گئے ۔ نہ خدا کا ڈر ، نہ پنچ کا ۔

نزکن بیگم: خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ۔ کوئی بھی جیسے کو تیسا مل جائے گا

ساری بائی کچائی نکال دے گا، سب کھایا پیا، اگلوالے گا۔

کامنی بیگم: اگلوا کیا خاک لے گا! ان کے پاس دھرا کیا ہے۔ ایسے پیسے میں کہیں بھڑک ہوتی ہے۔ ان کا ذکر نہ کرو۔ لو! تمھیں پان تو کھلا دوں۔

نزکن بیگم: پان نہیں کھاؤں گی، منہ کٹ گیا ہے۔

کامنی بیگم: اتنا چونا کیوں کھالیا۔

نزکن بیگم: بازار سے چونا منگوایا تھا۔ دہی کا توڑ نہیں ملا، پانی سے بجھا دیا۔ اس سے منہ کٹ گیا۔

کامنی بیگم: کھوپرا چبالو۔

نزکن بیگم: ہاں! کسی سے منگواؤں گی۔ تمھارے بیٹے کا کیا حال ہے؟

کامنی بیگم: موا لونبڑ ہو گیا۔ خدا موت دے! ایسی اولاد سے بے اولاد ہونا اچھا۔

نزکن بیگم: اے نوج! خدا نہ کرے۔ چھائیں پھوئیں دور پار، شیطان کے کان بہرے۔ موت آئے انگریز بندوں کو! اکلوتا بچہ تمھارے گھر کی رونق ہے۔ اس کے دم سے تمھارے گھر کی آبادی ہے۔

کامنی بیگم: پھٹ پڑیں وہ بالیاں، جن سے ٹوٹیں کان! مجھے تو پھوٹی آنکھ اچھا نہیں لگتا۔

نزکن بیگم: کیا کرتا ہے، جو اتنی بیزار ہو۔

کامنی بیگم: صبح ہوئی، وہ ہے اور کنکوا ہے۔ دن بھر لترلتر کرتا پھرتا ہے۔ نہ کھانے کی سدھ، نہ پینے کی۔ دو نوالے کھائے اور بھاگا، دو نوالے کھائے اور بھاگا۔ آنکھیں ڈھکر ڈھکر کرنے لگیں۔

نزکن بیگم: کہاں کنکوا اڑاتا ہے؟

کاسنی بیگم: بارہ دری کے صحن میں۔

نرگن بیگم: اکیلا؟

کاسنی بیگم: اکیلا کیوں۔ ہُرمزی خانم کا لڑکا، محلہ کے لفنڈرے جمع رہتے ہیں۔ ان میں نواب ثریا قدر بھی سینگ کٹا کے بچھڑوں میں داخل ہو گئے ہیں۔ مانجھا سوتنا، کنا باندھنا، پیچ لڑانا سب انھیں کا سکھایا ہوا ہے۔ خود جب کوئی پیچ کاٹتے ہیں تو "وہ کاٹا!" کی آواز یہاں تک آتی ہے۔ ایک دن میں نے اپنے میاں سے کہا،
"سنا تم نے!" وہ مسکرا کے چپ ہو رہے۔ میں نے کہا،
"آخر ان سے کیوں نہیں کہتے کہ نہ آیا کریں۔" انھوں نے کہا،
"کیا تم نے ان کو کوئی دھنیا منگیا سمجھا ہے۔ بڑے بڑوں کے پر ان کے آگے جلتے ہیں۔ یہی کیا کم ہے کہ تمھارا لڑکا دن بھر اپنے گھر میں رہتا ہے۔ آخر رات کو مولوی صاحب آتے ہیں، ان سے پڑھتا بھی تو ہے۔ میں نے کہا،
"یہ سب تمھاری ڈھیل کا نتیجہ ہے۔"

نرگن بیگم: سمجھدار ہو گا تو چھوڑ دے گا۔

کاسنی بیگم: بہن کی باتیں، ایسی عادتیں کہیں چھوٹتی ہیں۔ بچپنے سے سنتی آرہی ہوں کہ نواب آغن صاحب نے میدان بدا ہے۔ کنکوا لڑ رہا ہے۔

نرگن بیگم: ایک آغن صاحب ایسے نکل گئے۔ سب ایسے تھوڑی ہوتے ہیں۔

کاسنی بیگم: ایک آغن صاحب ہی پر کیا ہے، ان سے کنکوا لڑانے والے بھی تو کچھ ہوں گے۔

نرگن بیگم: بھئی آجکل لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تمھارا لڑکا کنکوا لڑا؟

ہے ، میرا لڑکا بٹیریں لڑاتا ہے ۔ باپ گھر سے نکلے ، اس نے کابک سے بٹیر نکالی اور یہ چل ، وہ چل ۔ کہاں گیا ، پھر کچھ پتا نہیں ۔ کھاتی ہوں تو لنئے تھمی کو غزے ڈبے دکھاتا ہے ۔ باپ کی مار پیٹ کا کچھ اثر نہیں ہوتا ۔ نو سو نکے مرے ڈنڑ پر لکھے ۔ کسی کی نصیحت نہیں سنتا ۔ چکنا گھڑا ہے ۔ مگر کیا کروں ۔ دو بچیاں ہیں ۔ ایک اپنے گھر کی ہو گئی ، دوسری بھی اپنے گھر چلی جائے گی ۔ یہی اکیلا گھر کا چراغ ہے ۔ ماما سے مجبور ہوں ۔ صدقے واری ہوتی رہتی ہوں ۔ سوچتی ہوں کہ سمجھدار ہو گا ، شادی بیاہ ہو گا ، بال بچے ہوں گے تو سدھر جائے گا ۔

کامنی بیگم: تمھارا ایسا میرا دل نہیں ہے ، نہ ایسی ماما ، کھتی ہوں ۔ برائیوں کو سلومن نہیں کر سکتی ۔ تمھاری بٹیا کیسی ہیں ؟

نزکن بیگم: بہن ! کیا بتاؤں ۔ پہلا بچہ تھا ، پیٹ گر گیا ۔ اب پھر پیٹ سے ہے اب سے دور ، ہزار قران درمیان ، میرے بھی شروع کے دو پیٹ گر چکے ہیں ۔ اس کے بعد یہ تین پھوڑے دکھائی دیے ہیں ۔ اس سے اس کی طرف سے دل دھڑکتا رہتا ہے ۔ دعائیں مانگتی رہتی ہوں ۔ بوباجی نے کہا کہ شاہ میر خان کا تعویذ اکسیر ایک ہے ۔ ان سے تعویذ لائی ہوں ۔ درگاہ میں چلہ باندھا ہے ۔ منت مانی ہے کہ اصل خیر سے جیتا جاگتا بچہ پیدا ہو گا تو مسجد میں طاق بھروں گی ۔ گھی کے چراغ جلاؤں گی ، رحم اور گھگھے چڑھاؤں گی ۔

کامنی بیگم: خدا کرے چاند سا بیٹا پیدا ہو !

نزکن بیگم: تمھارے منہ میں گھی شکر !

کامنی بیگم: میاں کا کیا رنگ ہے ؟

نزکن بیگم: خدا ایسا داماد سب کو دے ! پرواہ ہے ، چاند کا ٹکڑا ہے ۔ منہ

ہی دیکھتا رہتا ہے۔ تیوری پر بل نہیں آنے دیتا۔

کامنی بیگم: ساس نندوں کا کیا برتاؤ ہے؟

نوکن بیگم: نندیں بن بیاہیاں ہیں۔ بھائی سے آس لگائے بیٹھی ہیں کہ وہی پار لگائے گا۔ بھاوج سے دل میں جلی جلی، منہ پر علیٰ علیٰ کرتی رہتی ہیں، پھر بھی گھمم گھما میں تان تروڑ کر کے دل کی بھڑاس نکال لیتی ہیں۔ جب وہ میاں سے شکایت کرتی ہے تو وہ کہتے ہیں "چپ رہو! کے دن کی ہے۔" میں نے بھی سمجھا دیا ہے کہ بٹیا تھوڑی بجا کے لڑنا اچھا نہیں۔ محلہ والے سنیں گے تو کہیں گے، "بہو چوبائی ہوا ہے۔ کبھی ساس سے لڑتی ہے، کبھی نندوں سے لڑتی ہے۔" ساس بڑی کنکالا ہے۔ ہر وقت جلی کٹی کرتی رہتی ہے، کونچنے دیتی رہتی ہے۔ چاہتی ہے کہ تھوڑی بچے، مگر وہ ایک چپ ہزار چپ۔ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی ہے۔ بڑی بہو کو نکال چکی ہے۔ ہر وقت کے ٹنک توڑے کہاں تک سہتی۔ اس کی بھی للو بارہ ہاتھ کی ہو گئی۔ برابر سے جواب دینے لگی۔ وہ کہتی،

"تجھے پیٹوں، تیرا حلوہ کھاؤں!" یہ کہتی،

"تجھے ہے ہے کروں، تیری بھتی کھاؤں!" آخر بیٹا عاجز آ کے اپنی بیوی کو لے کے الگ ہو گیا۔ اس کو بھی چین آ گیا۔ اس کے بھی پتڑوں پانی پڑ گیا۔ یہی میری بچی کے ساتھ بھی چاہتی ہے۔ میں نے سمجھا دیا ہے کہ ٹنٹش ہو گئی۔ نہ منہ میں دانت، نہ پیٹ میں آنت۔ کے دن کی ہے۔ نندیں بھی اپنے گھر کی ہو جائیں گی، پھر تم ہی تم ہو گی۔ اس کا دل بھی میاں کی طرف

سے قوی ہے۔ مسز شنکر سے بینئی ہے۔

کامنی بیگم: چھوٹی بٹیا کیسی ہے؟

نزکن بیگم: خدا رکھے! سینا پرونا، پکانا ریندھنا، کیا نہیں آتا۔ پانچ انگلیاں، پانچ چراغ ہیں۔ ٹوپیاں تک کاڑھ لیتی ہے۔ تیپچی تُرپی، پھندا کا کاڑھنا، سب کچھ آتا ہے، بات کرنے میں پھول جھڑتے ہیں۔ تمنے تو دیکھا ہے۔ صورت شکل میں بھی ہزاروں میں ایک ہے، جانگر والی ہے، ہنبک ڈھنبک کے سارا کام کر دیتی ہے۔ چاہتی ہے کہ میرے پیٹ کا پانی نہ ہلے، تنکا نہ توڑوں، گھر میں برابر سے شریک رہتی ہوں کہ بچی ہے، ساری گھرداری کا بوجھ اس پر نہ پڑے۔ جس گھر جائے گی، قدردان ہوں گے تو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔

کامنی بیگم: کہیں سے بات آئی؟

نزکن بیگم: جس گھر میں بیری ہوتی ہے، اس پر ڈھیلے آتے ہی رہتے ہیں۔ پیام تو بہت سے آئے ہیں، مگر باپ راضی نہیں ہوتے۔ کہتے ہیں کہ دو، چار برس شادی نہیں کریں گے۔ کجاوے لاد کے جہیز دیں گے۔ جب خدا چاہے گا تو کنگنا بندھے گا، شادی رچے گی۔ بندے کے سوچے کچھ نہیں ہوتا۔ اب ان کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ جاتی ہوں۔ پھر کسی دن آؤں گی تو جی بھر کے باتیں کروں گی۔ خدا حافظ!

کامنی بیگم: میں بھی کسی دن آؤں گی۔ خدا حافظ!

یہ ہے لکھنؤ کی بیگماتی زبان، جو میں نے اس لیے لکھ دی ہے کہ یہ داستان ناگفتہ نہ رہ جائے۔

افکارِ شمس

غزلیات

مولانا کی غزلوں کے اشعار چودہ برس کے سن سے اکیس برس کے سن تک کے مختلف ذریعوں سے جس قدر اور جس طرح حاصل ہوئے ہیں، اسی طرح ردیف وار مرتب کر کے پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان پر نظر ثانی اس وجہ سے نہیں کی گئی کہ اس زمانہ کا کلام باقی نہ رہتا۔

○

ایک ہی قافیہ میں پوری غزل

کمبخت ہو برا دل خانہ خراب کا!
مجھ پر عذاب کر دیا عالم شباب کا

دیکھا جو میں نے نامۂ اعمال حشر میں
قصہ لکھا تھا میرے اور ان کے شباب کا

ہیں یاد ان کی آج تک دلفریبیاں
کچھ دیر خواب دیکھا تھا ہم نے شباب کا

میرے لیے تو دونوں قیامت سے کم نہ تھے
طفلی کا ان کی عہد، زمانہ شباب کا

دیکھی جو اچھی شکل، طبیعت مچل گئی
کچھ پوچھیے نہ حال ہمارے شباب کا

عالم میں غفلتوں کے وہ دونوں گذر گئے

طفلی کا عہد اور زمانہ شباب کا

ہم نے بھی دل کو تھام لیا سن کے یہ خبر
اب آ گیا ہے ان کا زمانہ شباب کا

گرمی بڑھی ۔ رگوں میں لہو دوڑنے لگا
پیری میں یاد آیا زمانہ شباب کا

ہوتی ہیں دردِ دل میں بھی محسوس لذتیں
ہے حاصلِ حیات زمانہ شباب کا

○

کتنے ہی پائے صنم پر کیے سجدے میں نے
کبھی پورا نہ ہوا شوق جبیں سائی کا

مسکراہٹ لبِ نازک پہ ۔ نگاہیں نیچی
کس سے سیکھا ہے یہ انداز دلآرائی کا

آ گیا ان کا شباب ۔ ان کی نگاہیں بدلی
بڑھ گیا شوق انھیں کچھ ستم آرائی کا

جلوۂ حسن جہاں تاب کے پھیلے ہر سو
جب ہوا شوق انھیں انجمن آرائی کا

دفن کر کے مجھے رخصت ہوئے یار و احباب
طول اب حشر تلک ہے شبِ تنہائی کا

گھر کو بھی کر دیا ویرانہ میں شامل میں نے
ذوقِ وحشت کو میرے وہ بھی تو کافی نہ ہوا

نہ ہوا اس پہ بھی ، وہ شوخ ، وفا کا قائل
ظلم ہنس ہنس کے سہے اور کبھی شاکی نہ ہوا

دوں کس امید پہ اب جاں کہ وہ ظلم شعار
کوچہ میں اپنے میرے دفن پہ راضی نہ ہوا

جس نے ان مست نگاہوں سے ملائیں آنکھیں
پھر وہ منت کشِ پیمانۂ ساقی نہ ہوا

بادہ گر خلد میں ہے سب کے لیے امر مباح
جس نے مسجد میں پیا ، وہ بھی تو عاصی نہ ہوا

دل میں جب ہوک اٹھی ضبط فغاں کر نہ سکا
راز اس گھر جو تھا ، مجھ سے وہ مخفی نہ ہوا

عمر جس دشت میں مجنوں نے گزاری اپنی
وہ میرے ذوقِ جنوں کے لیے کافی نہ ہوا

○

ہے شانہ کش رقیب جو گیسوئے یار میں
رگ رگ ہے میرے دل کی غضب کے فشار میں

آدم بھی آ کے روئے یہاں ہجر یار میں
یہ رسم ہے قدیم اس اجڑے دیار میں

جاگے تھے شب کو ، سوئے ہیں دن کو مزار میں
دنیا ہوئی ادھر سے ادھر ہجر یار میں

جادو بھرا تھا اس نگہ شرمسار میں
ملتے ہی آنکھ ، دل نہ رہا اختیار میں

ہم تنکے چن رہے ہیں نشیمن کے واسطے
بجلی چھپی ہے دامن ابر بہار میں

آئے عدم سے گلشن ہستی کی سیر کو
دامن الجھ گیا ہے یہاں خارزار میں

آنکھیں لگی ہیں در پہ نکلتا نہیں ہے دم
ٹھہری ہوئی ہے روح ترے انتظار میں

جوش جنوں نے دشت کو گلزار کر دیا
ہے خون میرے پاؤں کا ہر نوک خار میں

گیسو کی یاد ہے ، کبھی رخ کا خیال ہے
کٹتی ہے عمر اب اسی لیل و نہار میں

مسجد میں جا کے دیکھیے واعظ کا حال زار
پرہیز ہے زباں پہ ہے ۔ آنکھیں خمار میں

قاتل کو میرے سمجھتے تھے دشمن کوئی مرا
نکلا تلاش سے وہ مرے دوستدار میں

عشقِ بتاں نے کر دیا میرا تباہ حال
کس کو ہے دخل مصلحتِ کردگار میں

یاں جوشِ گریہ اور وہاں حکم ضبط ہے
پڑ جاتی ہے گرہ مرے اشکوں کے تار میں

گردش پہ اپنی ۔ شمس ! ہمیں صبر آ گیا
کس کو ملا سکوں اس اجڑے دیار میں

○

ہوا نے یہ کیا احساں کہ جا کر ان کے ایواں میں
میرا رنگِ پریدہ بھر دیا تصویرِ جاناں میں

بگولے ہیں ، نہ صحرا ہے ، نہ سائیں سائیں آوازیں
لگے گا جی ہمارا کس طرح سے باغِ رضواں میں

انھیں کی یاد جنت میں بھی تڑپانے لگی دل کو
نہ دیکھی جب ادائیں ان کی ایسی حور و غلماں میں

بگولے ہیں فقط اک مونسِ تنہائی صحرا میں
انھیں کے ساتھ میں ہر سمت پھرتا ہوں بیاباں میں

نظر لگنے کا ان کے واسطے گنڈا بنانے کو
بچا رکھے ہیں میں نے تار کچھ اپنے گریباں میں

جنونِ عشق تھا مخصوص مجھ سے بعد مجنوں کے
نہ آیا بعد میرے کوئی دیوانہ بیاباں میں

مہ و معشوق ہو، ابرِ بہاراں ہو، گلستاں ہو
اسی کا نام جنت ہے لگاؤ ہوشمنداں میں

نصیحت کے بہانہ سے جنابِ شیخ آئے ہیں
نظارہ کر رہے ہیں بیٹھ کر بزمِ حسیناں میں

○

رسوا کرے مجھے کہ اسیرِ بلا کرے
جو چاہے وہ میرا دلِ درد آشنا کرے

راضی ہوں میں وہ قتل کرے یا جفا کرے
بس میں کسی کے دل نہ کسی کا خدا کرے!

موسیٰ نہ تاب لائے تبسم کی ایک دن
میں چاہتا ہوں روز یہ بجلی گرا کرے

میری طرح کا دل نہ کسی کو نصیب ہو
ان کی طرح جواں نہ کسی کو خدا کرے!

مقصود امتحاں مری ہمت کا ہے اگر
ہر روز آشیانہ پہ بجلی گرا کرے

بے کھٹکے آؤ حشر میں اُلٹے ہوئے نقاب
کس کی مجال ہے، جو تمھارا گلا کرے

ہاں! مسکرا کے لیجیے ناز سے انگڑائی لیجیے
بجلی کسی کے دل پہ گرے تو گرا کرے

جس دل کی، شمس! کوئی نہ حسرت نکل سکے
مرجائے وہ غریب نہ آخر تو کیا کرے

کس طرح وہ عالم کو نہ دیوانہ بنا دے
یہ حسن، یہ انداز و ادا جس کو خدا دے

دیکھی نہیں جاتی ہے کسی سے مری حالت
اب وہ بھی یہ کہتے ہیں، "خدا اس کو شفا دے!"

پھر ہوش کے عالم میں بھلا آؤں میں کیونکر،
غش میں مجھے دامن سے جو وہ اپنے ہوا دے

جانبازی پروانہ پہ کیجے نہ تعجب
قسمت ہے ، جسے ہمت مردانہ خدا دے

وہ دیکھ کے کہتے ہیں مری نزع میں الجھن
"یوں موت جوانی میں کسی کو نہ خدا دے!"

کیا جانے وہ ، کیا لطف ہے آشفتہ سری میں
جب تک نہ کسی کو دلِ دیوانہ خدا دے

موسیٰ! طلبِ دید پہ اصرار نہ کیجے
کیا ہو ، جو نقابِ رخِ روشن وہ اٹھا دے

خلقت کی زباں کا ہے یہ ادنیٰ سا کرشمہ
تھوڑی سی ہو بات ، اور وہ افسانہ بنا دے

آئے ہیں عیادت کو سرہانے دمِ آخر
اللہ مری نزع کے لمحات بڑھا دے!

کیوں سجدے میں اس کے نہ جھکیں سب کی جبینیں
اک خاک کے پتلے کو جو انسان بنا دے

○

بچپنا گزرا ، آیا عہدِ شباب
اڑ گئی نیند ، دیکھنے لگا خواب

چاندنی پھیلی ہے مرے گھر میں
جاگتا ہوں کہ دیکھتا ہوں خواب

طلبِ دید پر گری بجلی
چاہنے والے کا یہی تھا جواب

کیوں نہ پھر غش پہ غش مجھے آئے
ان کو آغوش میں لیے ہے شباب

زلفیں بکھری ہیں روئے انور پر
جانِ عاشق پہ ہے دوگونہ عذاب

بھیجا مسجد سے میکدہ کی طرف
شیخ کو بھی دکھا دی راہِ ثواب

حسرتیں ساری مر گئیں دل کی
کیسا آباد گھر ہوا ہے خراب !

موسمِ گل ہو ، ساغر مل ہو
بتِ رعنا ہو اور عہدِ شباب

نہ رہے پھر نماز کی حاجت
شیخ گر پی لیں ایک جامِ شراب

آسماں پر جو ماہِ کامل ہے
ہم نے دیکھا زمیں پہ اس کا جواب

کس نے رخ سے نقاب الٹی ہے
ماہِ کامل کو آ رہا ہے حجاب

○

ان کے نزدیک ناخدا کیا ہے
جو سمجھتے ہیں یہ خدا کیا ہے

بیخودی میں ہیں سجدہ ہائے نیاز
یہ نہیں جانتے ، خدا کیا ہے

سجدے پائے صنم پر کرتے ہیں
ہم نہیں جانتے ، خدا کیا ہے

جس نے ان سا حسین خلق کیا
عقل حیراں ہے ، وہ خدا کیا ہے

کر دیا مبتلائے عشقِ بتاں
دیکھیں اب مرضیٔ خدا کیا ہے

○

مجھ سے پوچھو ، وہ دلربا کیا ہے
اور قیامت کا سامنا کیا ہے

حسن کی اک ادا تغافل ہے

وہ نہیں جانتا ، جفا کیا ہے
حسنِ شعلہ فشاں سے خواہشِ دید
اے حکیم ! آپ کو ہوا کیا ہے
مری حالت کو دیکھ کر سمجھو
حسن کیا چیز ہے ، ادا کیا ہے
دل میں رہ رہ کے ٹیس اٹھتی ہے
یا الٰہی ! یہ ماجرا کیا ہے
عشق اور مہوشانِ غمزہ و ناز
تجھ کو ، اے شمس ! یہ ہوا کیا ہے

○

لذتِ درد شیخ کیا جانے
زندگانی کا ہے یہی حاصل
قعر میں ہمت آزمائی کر
ننگ ہے ڈوبنا ، لبِ ساحل

○

قفلِ زنداں آج کھولا جائے گا
لاش قیدی کی نکالی جائے گی

آ رہا ہے ان کا اب عہدِ شباب
ظلم کی بنیاد ڈالی جائے گی

زندگی بھر ہم رہے محرومِ دید
ساتھ تصویرِ خیالی جائے گی

آ رہی ہے زلف ان کی تا قدم
کس کمر سے یہ سنبھالی جائے گی

سجدگاہِ عام ہو گا ان کا در
قیدِ مسجد کی اٹھالی جائے گی

ظلم ڈھانے والے یہ بھی جان لیں
آہِ مظلوماں نہ خالی جائے گی

سجدۂ بت سے اگر روکا گیا
اک نئی مسجد بنا لی جائے گی

فصلِ گل میں دعوتِ پیرِ مغاں
شیخ صاحب سے نہ ٹالی جائے گی

○

دلِ بیتاب اور اہلِ شباب
جانِ عاشق پہ ہے دوگونا عذاب

شیخ قدر ان بتوں کی کیا جانے
ہیں یہی رونقِ جہان خراب

دل دیا ، دل کو دیں تمنائیں
ہو گئے دونوں مبتلائے عذاب

○

فتنہ زا ، وحشتِ فضا ، دامِ قضا ہوتے گئے
جس قدر بڑھتے گئے گیسو ، بلا ہوتے گئے

حسن بھی بڑھتا گیا ، جتنا شباب آتا گیا
دیکھنے کی چیز وہ نامِ خدا ہوتے گئے

جس قدر بڑھتا گیا سوزِ دروں عشاق کا
تیرگی گھٹتی گئی ، دل آئینہ ہوتے گئے

شمس ! کام آئیں نہ کچھ اپنی ضیا افشانیاں
روز گردش میں فلک کی مبتلا ہوتے گئے

○

متفرق اشعار

دیکھا جو مجھ کو ، پھیر کے منہ مسکرا دیے
بجلی گری تڑپ کے دلِ بیقرار پر

خوفِ محشر نہ رہا دل میں ، جو دیکھا میں نے
پشت پر میرے گناہوں کے ہے رحمت اس کی

کوئی ویرانہ میرے ذوق کے قابل نہ ملا
اب کہاں لے کے مجھے جائے گی وحشت میری

دیکھا جو دل کو اس نے سوئے چرخِ بے مدار
سونا اتر گیا ورقِ آفتاب کا

مینوشی حق نے دارِ بقا میں بھی کی حلال
کہتا ہے شیخ ، دارِ فنا میں حرام ہے ۔

قابو میں رکھے ابلق لیل و نہار کو
دیکھا نہ میں نے اپنا کسی شہسوار کو

اے خوشا عہدِ عدم ! فکر سے آزاد تھے ہم
ایک دن بھی نہ یہاں قیدِ محن سے نکلے

بجلی گرائی ، طور جلایا ، اڑائے ہوش
اتنا جلال اک ارنی کے سوال پر !

سب زخم ہیں ہرے ، ہے لہو سے قبا بھی سرخ
لایا ہے رنگ جوش جنوں پھر بہار میں

آ رہی ہے زلف ان کی تا قدم
کس کمر سے یہ سنبھالی جائے گی

فتنہ زا ، وحشتِ فضا ، دامِ قضا ہوتے گئے
جس قدر بڑھتے گئے گیسو ، بلا ہوتے گئے

کچھ نہ پوچھو درازیٔ شبِ ہجر
کٹ گئی عمر اور سحر نہ ہوئی

دیکھا جو میں نے نامۂ اعمال حشر میں
قصہ لکھا تھا میرے اور ان کے شباب کا

ہوک جب دل سے اٹھی ، ضبط فغاں کر نہ سکا
راز اس گھر جو تھا ، مجھ سے وہ مخفی نہ ہوا

کتنے ہی پائے صنم پر کیے سجدے میں نے
کبھی پورا نہ ہوا شوق جبیں سائی کا

مسکراہٹ لبِ نازک پر ، نگاہیں نیچی
کس سے سیکھا ہے یہ انداز دلآرائی کا

نظر لگنے کا ان کے واسطے گنڈا بنانے کو
بچا رکھے ہیں میں نے تار کچھ اپنے گریباں میں

آئے عدم سے گلشن ہستی کی سیر کو
دامن الجھ گیا ہے یہاں خارزار میں

نشانہ تیر کا رقیبِ بدگماں کیوں ہو
اجل آئی ہوئی میری نصیبِ دشمناں کیوں ہو

آنکھیں لگی ہیں در پہ ، نکلتا نہیں ہے دم
ٹھہری ہوئی ہے روح ترے انتظار میں

کبھی دنیا میں پھر نہ ہو گی سحر
ہجر کی شب اگر سحر نہ ہوئی

ملتے ہی آنکھ اس فسوں گر سے
دل گیا اور ہمیں خبر نہ ہوئی

ہوئے آغازِ عشق ہی میں ہلاک
غرق ہم ہو گئے لبِ ساحل

ہے عجب طرح کی یہ کشمکشِ موت و حیات
نہ میں جینے پہ ہوں راضی ، نہ وہ مر جانے پر

شعلۂ عشق اگر دل میں فروزاں ہو جائے
بڑھ کے یہ قطرۂ خوں مہرِ درخشاں ہو جائے

آنکھ ساقی سے ملی جیسے ہی میخانہ میں
کھنچ کے مے آ گئی پیمانہ سے پیمانہ میں

ہے گورِ غریباں میں وہی شمس کا مدفن
تربت جو کوئی دل کے دھڑکنے کی صدا دے

خاک کے ذروں سے " اف ، اف ! " کی صدا آتی ہے
میرا افسانۂ غم قصۂ ماضی نہ ہوا

دم نکلتا ہے تری زلف کے سودائی کا
جھلملاتا ہے ستارہ شبِ تنہائی کا

چارہ گر کیا سمجھ سکیں گے بھلا !
درد کیسا ہے اور دوا کیا ہے

دیکھتے ہی بگڑ گئے تیور
کس سے کہتے کہ مدعا کیا ہے

حشر میں چھوڑ دیا دیکھ کے اترا ہوا منہ
آ چکا تھا مرے ہاتھوں میں گریباں ان کا

سامنا جب ہوا محشر میں تو کچھ نہ کہہ سکا
مجھ سے دیکھا نہ گیا ان کا پریشاں ہونا

لذتِ زندگی وہ کیا جانے
جس کو دردِ جگر نہیں ہوتا

سہرا

خشگی چشم نہ کیونکر ہو یہ پیارا سہرا
رخ نو شاہ ،، دل افروز ، دلآرا سہرا

پردۂ ابر سے ہے نیرِ اعظم تاباں
رخ نوشاہ پہ کیوں ہے نظر آرا سہرا

فرطِ شادی سے کھلی پڑتی ہیں کلیاں ساری
کیوں نہ گلریز و گہر بار ہو سارا سہرا

دل کی دیرینہ امیدوں کا مہکتا گلشن
بحرِ الفت کا مچلتا ہو دھارا سہرا

لہروں سے بحرِ مسرت کی ہیں لڑیاں جنباں
دل کی بیتابیوں سے بن گیا پیارا سہرا

صبحِ نوروزِ مسرت کا منور خورشید
شبِ عشرت کا چمکتا ہو تارا سہرا

بہنوں کا غنچۂ دل ، بھائیوں کا تارِ نگاہ
کس نے گوندھا ہے یہ اس طرح کا پیارا سہرا

ماں کو بےحد ہے خوشی گلشنِ فردوس میں آج
کاش وہ دیکھتیں دنیا میں تمھارا سہرا !

پانچ لڑیاں بنیں ، الفت کی یہ زنجیریں ہیں
شرحِ پیمانِ محبت ہے یہ سارا سہرا

ذمہ داری و فرائض کی نئی زنجیریں
زندگی کی نئی تعمیر کا گارا سہرا

سایۂ پنجتنِ پاک ہے یہ دولھا پہ
پانچوں لڑیوں سے یہ کرتا ہے اشارا سہرا

ملے گلہائے شگفتہ کو بہارِ جاوید
رہے شاداب ہمیشہ یہ دلآرا سہرا !

اشرفِ انبیا و محمود و محمد ، احمد
صدقے میں ان کے مبارک ہو یہ پیارا سہرا !

گود آباد ہو جلدی سے دلہن کی ، یا رب !
بنے تمہید محبت کی یہ پیارا سہرا

لڑیاں موتی کی پروئی ہیں کہ موزوں اشعار
کہہ کے لایا ہے جو شمسِ سخن آرا سہرا

دعائیہ اشعار

چھائی ہے یوں خوشی چمنِ روزگار میں
جیسے گھٹائیں جھوم کے آئیں بہار میں

موج ہوا میں ہے مئے سرجوش کا اثر
مستی سے جھومتے ہیں شجر کوہسار میں

آئے ہیں بور آم میں، کوئل ہوئی ہے مست
آتی ہے "پی کہاں!" کی صدا گوشِ یار میں

طاؤس مستِ رقص ہے قمری خرام میں
شاماں ہے مستِ نغمہ چمن کے کنار میں

پریاں ہیں مست قاف میں، حوریں جناں میں مست
طائر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں

بلبل ہیں شاخ گل پہ نوا سنج باغ میں
جنگل کے شیر گونج رہے ہیں کچھار میں

سرخی بڑھی ہے پھولوں میں، سرخی گیاہ میں
شعلے بھڑک رہے ہیں درختِ چنار میں

روشن نگاہِ نرگسِ بیمار ہو گئی
پھول آ گئے ہیں سرو لبِ جوئے بار میں

سوسن ہوئی یہ فرطِ مسرت سے تر زباں
وجہ طرب یہ ہے چمن روزگار میں
ہر چیز پر ہے بادۂ گلرنگ کا اثر
خوں دوڑنے لگا رگِ ابرِ بہار میں
عشاق آہ و نالہ فراموش کر گئے
باقی رہے نہ داغ دلِ داغدار میں
پھیلی ہوئی ہیں چاروں طرف کیوں مسرتیں
کیوں خندہ زن ہے کبکِ دری کوہسار میں
سرمہ لگایا نرگسِ شہلا نے آنکھ میں
غازہ ملا ہے پھولوں نے کیوں لالہ زار میں
سنبل نے اپنے بال سنوارے ہیں کس لیے
کیوں منہمک عروسِ چمن ہے سنگھار میں
شادی رچی ہے آج نقی کی سمینہ سے
عطر سہاگ کی ہے مہک گل کے ہار میں
سہرا بنا ہے دونوں کے سر پر جو بیاہ کا
یوں ہنس رہے ہیں، جیسے گلِ تر بہار میں
بر آئی ہے مراد ضعیفی میں باپ کی
یہ دن ہوا نصیب بڑے انتظار میں

خالق سے اب دعا ہے کہ یہ دونوں نونہال
پھولیں ، پھلیں صدا چمنِ روزگار میں

تعمیۂ "د" = ۱۹۸۳ء = ۱۹۸۷ء

دعائیہ اشعار

یہ دعا شمس کی دل سے ہے کہ ، اے ربِ عباد !
رکھ تو دنیا میں شمسیہ کو ، نقی کو دلشاد

سایۂ پنجتنِ پاک رہے دونوں پر

ہر گھڑی ان کو زمانے میں مسرت ہو زیاد
ان کے مقصد کا سفینہ لبِ ساحل پہنچے
خضر کی عمر ، سکندر کا اسے دے اقبال
ان کے گھر کو وہ کرے اپنے قدم سے آباد
اس کے دیدار سے ہوں سب کی نگاہیں روشن
صاحبِ فکر و نظر ہو وہ مثالِ اجداد
حذف آباد سے "با" کر کے کہی یہ تاریخ
رہیں دنیا میں نقی اور شمسیہ آباد

تخرجۂ "با" = ۲ × ۱۴۱۰ = ۱۴۰۷

قطعۂ دعائیہ

بمصرعِ

انیس

یارب ! بحقِ سید و سردارِ انبیا
خوش اور تندرست ثمینہ رہے سدا
کشتِ امید اس کی ہمیشہ ہری رہے
صندل سے مانگ ، بچوں سے گودی بھری رہے

بتقریبِ شادی خانہ آبادی سید محمد نقی ، فرزندِ مولانائے محترم

تھا نقی اور ثمینہ کا جو ہمرنگِ مزاج
مل گئے دونوں بحکم شرع و حسبِ رواج
سالِ تاریخ کیا شمسِ سخنور نے رقم
اقتران مہ و خورشید ہوا باہم آج

۱۹۸۷ء

قطعۂ تاریخِ وفات

زوجۂ مرحومہ واحدہ بیگم

واحدہ رفت چوں ز دارِ الم
دِلم از فراقش شدہ پر غم
شمسؔ محزون نوشت تاریخش
منزلِ واحدہ ریاضِ ارم

۱۴۰۲ھ

قطعہ

ان کی یاد میں

وہ دن اب یاد آتے ہیں ، رفاقت میں جو گزرے ہیں
بڑی حسرت سے لب پر واحدہ کا نام آتا ہے
یہی اک فکر اب دن رات دامنگیر رہتی ہے
ہمارے واسطے کب موت کا پیغام آتا ہے

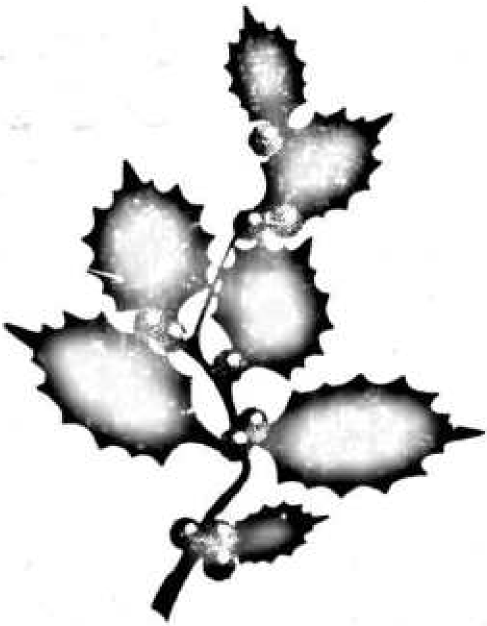
قطعۂ تاریخِ وفات

لختِ دلِ شمسؔ خستہ جاں
سید محمد مرتضیٰ مرحوم

وہ مرتضیٰ کہاں ہے ، رشکِ قمر ہمارا
روشن تھا جس کے دم سے ہر بام و در ہمارا

آغوش سے ہماری اس کو اجل نے چھینا
کڑیل جواں ابھی تھا نورِ نظر ہمارا
تاریک ہو گئی ہے دنیائے دوں نظر میں
تاب و توانِ دل تھا ماہ وش ہمارا
بے درد موت ! تو نے کیسا ستم یہ ڈھایا
پیری میں اس طرح سے دل توڑ کر ہمارا
تاریخ یہ لحد پر لکھ دو سر ولا سے
• مدفوں ہے اس جگہ پر لختِ جگر ہمارا •

بہ تعمیۂ "واؤ" = ۶ + ۱۹۸۶ = ۱۹۹۲ء



نعت

اولیں صفتِ صناع ، رسولِ قرشی
ہے جو مکی ، مدنی ، ہاشمی و مطلبی

جس کا دین پیکرِ ہستی کی حیاتِ نو ہے
جس کے آئیں میں برابر عربی و حبشی

جس پر نازل کیا قرآنِ مبین خالق نے
اس سے انکار جو کرتا ہے ، وہ ہے بولہبی

مثل اس کا نہ سر عرش ، نہ بالائے زمیں
ہے وہی بعدِ خدائے عبدی و ازلی

اے کہ از طٰہٰ و یاسیں بتو حق کرد خطاب
دل و جاں بعد فدایت کہ عجب خوش لقبی

انچہ تو کرد نہ کروند رسولانِ کبار
مرحبا ! سید مکی ، مدنی العربی

تجھ کو خود حق نے بنایا ہے وسیلہ اپنا
تجھ سے اس وجہ سے ہم کرتے ہیں حاجت طلبی

شمس پر بھی نظر لطف و کرم ہو جائے
تیری ہی خاکِ درِ پاک سے ہے وہ نسبی

منقبت

نائب صاحب معراج ، علی اعلا
حجت اللہ علی الخلق ، امام دوسرا
قاسم نار الجناں ، شوہر خاتون جناں
بندۂ خالق کونین ، نصیری کا خدا

الہام غیبی

تیسری جنوری ، ۱۹۹۴ء کی شب کو ایک واقعہ سے متاثر ہو کے بیساختہ منقبت کے یہ اشعار نظم ہو گئے ، اس وجہ سے اس کا نام " الہام غیبی " رکھا ۔ اس منقبت میں یہ صفت پیدا ہو گئی ہے کہ پہلے مصرعے بھی ہم قافیہ ہیں ۔

وعلیٰ مولائے کل ، فخر رسولان کبار
جس نے رکھے دوش پر ختم الرسالت کے قدم

ساقی تسنیم و کوثر قاسم فردوس و نار
شوہر زہرا ، ابوالسبطین و مولود حرم

مفتی ہر چار دفتر ، عابد شب زندہ دار
رزم میں قہر الٰہی ، بزم میں ابر کرم

خاصف النعلین پیغمبر ، جلال کردگار
خسروی کا تاج جس کے زہد کے زیر قدم

مہدی اژدر شکار و جنگ میں مرحب شکار
سامنے سے جس کے شیران وغا کرتے تھے رم

شاہ مرداں . شیر یزداں ، قوتِ پروردگار
ضارب السیفین ، بازوئے رسول محترم

لافتیٰ الا علی لا سیف الا ذو الفقار
جس کے آگے ہر جوان تیغزن تھا سر بخم

کل ایماں . ہل اتیٰ و انما کا تاجدار
سب کمالات انبیاء کے ذات میں جس کے تھے ضم

وہ کلام اس کا ، جو ہے تحتِ کلامِ کردگار
سب فصیحان عرب کو کر دیا جس نے عجم

آج تک دنیا میں زیرِ آسمان بے مدار
کوئی مثل اس کا نہیں پیدا ہوا ، حق کی قسم !

ہے دعا یہ شمس کی ، اے داورِ روزِ شمار !
ہو زباں پر حشر تک ، مست ولائے حیدرم

جنوری ، ۱۹۹۴ء شب جمعہ کو

نظم

حسبِ حال، تصنیفِ حال

اب حال شمس کہنے کے قابل نہیں رہا
جو دل تھا اس کے سینے میں ، وہ دل نہیں رہا

سر سے دماغ ، نور بصر سے نکل گیا
اب وہ غریب ، درخورِ محفل نہیں رہا

رخصت ہوئے قوائے عمل کہہ کے الوداع
اب موت و زیستِ میں کوئی فاصل نہیں رہا

آزاد زندگی سے بقیدِ حیات ہے
اس طرح جینے کا کوئی حاصل نہیں رہا

ہاں ! یہ بھی اک کرشمۂ طولِ حیات ہے
زندہ ہے اور زندوں میں شامل نہیں رہا

رکتا نہیں سفینۂ عمرِ رواں کہیں
کیا اس کے واسطے کوئی ساحل نہیں رہا ؟

اتنا ضعیف کر دیا پیری نے شمس کو
کیا دم بھی توڑنے کے وہ قابل نہیں رہا ؟

قطعاتِ تاریخِ وفات ہائے شمس مرحوم
بقلمِ خود مرقوم

میری عمر بیاسی سال کی ہے۔ زائچہ کی رو سے بانوے سال شمسی ہے۔ اس حساب سے میری عمر کے سات سال ابھی باقی ہیں، لیکن اتنا زندہ رہنے کی امید قطعاً نہیں۔ قویٰ اس درجہ مضمحل ہو چکے ہیں کہ ہر دن انتظارِ موت میں گذرتا ہے۔ مگر احتیاطاً میں نے اب سے ۲۰۰۲ء تک کی تاریخیں کہہ دی ہیں کہ انھیں میں سے کوئی تاریخ میری قبر پر لکھ دی جائے۔

تاریخ ہائے وفات

در سنینِ ہجری

شمس چو رفت ازیں دارِ الم
بزمِ اربابِ ادب شد برہم
گفت تاریخِ وفاتش رضواں
شمس شد واردِ گلزارِ ارم

۱۴۱۴ھ

شمس چو زیرِ زمیں شد پنہاں
خاکِ تاریک بشد نور افشاں
گفت تاریخِ وفاتش ہاتف
شمس رفتہ بسوئے صحنِ جناں

۱۴۱۵ھ

شمس چو رفت بزیر تربت
دور از خاکِ سیہ شد ظلمت
گفت تاریخ رفاتش ہاتف
مسکنِ شمس بقصر جنت ۔

۱۳۱۵ھ

لبریز میری عمر کا پیمانہ ہو گیا
مدت کے بعد ختم یہ افسانہ ہو گیا
تشریف لائے نزع میں حلالِ مشکلات
پیشِ نگاہ جلوۂ جانانہ ہو گیا
رضواں نے دی صدا کہ زہے قسمتِ رسا
دیدارِ شہ نجات کا پروانہ ہو گیا
تاریخ فوت اپنی یہ برجستہ کی رقم
دار الارم میں شمس کا کاشانہ ہو گیا ۔

۱۳۱۷ھ

تاریخ فوت میں نے کہی از سر الم
دار الارم میں شمس کا کاشانہ ہو گیا ۔
یہ تعمیۂ الف = ۱ + ۱۳۱۷ = ۱۳۱۸ھ

تاریخ فوت میں نے کہی از سر بقا
دار الارم میں شمس کا کاشانہ ہو گیا ۔
یہ تعمیۂ با = ۲ + ۱۳۱۷ = ۱۳۱۹ھ

تاریخ فوت میں نے کہی از سر جہاں
• دار الارم میں شمس کا کاشانہ ہو گیا •

بہ تعمیۂ جیم • = ۳ + ۱۳۱۷ = ۱۳۲۰ھ

تاریخ فوت میں نے کہی از سر دوام
• دار الارم میں شمس کا کاشانہ ہو گیا •

بہ تعمیۂ دال • = ۴ + ۱۳۱۷ = ۱۳۲۱ھ

تاریخ فوت میں نے کہی از سر ہدف
• دار الارم میں شمس کا کاشانہ ہو گیا •

بہ تعمیۂ ہا • = ۵ + ۱۳۱۷ = ۱۳۲۲ھ

تاریخ فوت اپنی یہ برجستہ کی رقم
• بیت نعیم شمس کا کاشانہ ہو گیا •

۱۳۲۲ھ

تاریخ فوت میں نے کہی از سر کرم
• فردوس شمس زار کا کاشانہ ہو گیا •

بہ تعمیۂ کاف • = ۲۰ + ۱۳۹۸ = ۱۳۱۸ھ

تاریخ ہائے وفات

در سنین عیسوی

ہوا جو شمس ستر خاکدان ، تیرہ مکیں
بلند ہو گئی رتبہ میں آسماں سے زمیں
کہا یہ مصرع تاریخ اس نے برجستہ
" ہوا جوارِ حبیبِ خدا میں خلد نشیں "

۱۹۹۳ء

لبریز میری عمر کا پیمانہ ہو گیا
مدت کے بعد ختم یہ افسانہ ہو گیا
تشریف لائے نزع میں حلالِ مشکلات
پیشِ نگاہ جلوۂ جانانہ ہو گیا
رضواں نے دی صدا کہ زہے قسمتِ رسا
دیدارِ شہ نجات کا پروانہ ہو گیا
تاریخ فوت میں نے کہی از سر زمیں
" بستانِ خلد شمس کا کاشانہ ہو گیا "

بہ تعمیۂ "زا" = ۷ + ۱۹۸۶ = ۱۹۹۳ء

تاریخ فوت میں نے کہی از سر حزیں
" بستانِ خلد شمس کا کاشانہ ہو گیا "

بہ تعمیۂ "حا" = ۸ + ۱۹۸۶ = ۱۹۹۵ء

تاریخ فوت میں نے کہی از سرِ طریق
" بستانِ خلد شمس کا کاشانہ ہو گیا "

بہ تعمیۂ " طا " = ۹ + ۱۹۸۷ = ۱۹۹۶ء

تاریخ فوت میں نے کہی از سرِ یقیں
" بستانِ خلد شمس کا کاشانہ ہو گیا

بہ تعمیۂ " یا " = ۱۰ + ۱۹۸۷ = ۱۹۹۷ء

شمس چو رفت بزیرِ تربت
دور از خاکِ سیہ شد ظلمت
گفت تاریخ وفاتش ہاتف
" مامنِ شمس ریاضِ جنت "

۱۹۹۵ء

اب تک نہ کھل سکا ، یہ مشیت کا ہے وہ راز
کب بند ہو گا ، زیست کا جو بج رہا ہے ساز
کل تک تھے شمس زینتِ کاشانۂ حیات
آج ان کے واسطے درِ جنت ہوا ہے باز
تاریخ ارتحال یہ شاعر نے کی رقم
" جنت ہے اب سے منزلِ شمس سخن طراز "

۱۹۹۵ء

کہی ہاتف نے یہ تاریخ وفات
منزلِ شمس ہے ارضِ جنت ۔

۱۹۹۷ء

شمس چو رفت بزیرِ تربت
دور از خاکِ سیہ شد ظلمت
گفت تاریخ وفاتش ہاتف
شمس شد داخلِ دارِ جنت ۔

۱۹۹۷ء

کہی ہاتف نے یہ تاریخ وفات
تاریخ ارتحال یہ شاعر نے کی راقم
اب گلشن جناں میں ہیں شمس سخن طراز ۔

۱۹۹۹ء

کہی ہاتف نے یہ تاریخ وفات
مامن شمس ہے ارضِ جنت ۔

۲۰۰۰ء

کہی ہاتف نے یہ تاریخ وفات
مامن شمس ہے باغ جنت ۔

۲۰۰۲ء

منزلِ شمس ہے باغِ جنت

۱۹۹۸ء

اب تک نہ کھل سکا، یہ مشیت کا ہے وہ راز
کب بند ہو گا، زیست کا جو بج رہا ہے ساز
کل تک تھے شمس زینتِ کاشانۂ حیات
آج ان کے واسطے درِ جنت ہوا ہے باز
تاریخ ارتحال یہ شاعر نے کی رقم
"جنت ہے اب سے مامنِ شمس سخن طراز"

۱۹۹۹ء

کل من علیہا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام رضا بہ قضائہ و تسلیماً لامر

انا للہ و انا الیہ راجعون

آپ پر میرا سلام ہو!
میں اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا ہوں
آپ زندہ رہیں ہزار برس!
تاریخ تحریر
بندۂ خطاکار، احقر، محمد باقر شمس

۱۹۹۶ء

حدیثِ دیگراں



علامۂ عصر، عمادالعلما

جناب سید محمد رضی صاحب قبلہ مجتہد

علامۂ عصر

جناب محترم مولانا محمد باقر شمس دام عزہ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ علم و ادب سے ذوق رکھنے والے، اور خاص طور پر موصوف کی تالیفات اور تصنیفات کا مطالعہ کرنے والے، ان کی وسعتِ علمی، کمال فن، ذوق تحقیق، اعتدال تحریر، تنقید میں انصاف پسندی، اعلائے کلمۂ حق میں بے لوثی اور بیباکی سے پوری طرح واقف ہیں۔ خاندانی وجاہت اور موروثی ذہانت تو خداداد ہے، مگر اسی کے ساتھ علمی جستجو کی ہمیشہ انھیں عادت رہی ہے، پھر موصوف کا ابتدا ہی سے ماحول بھی علمی اور تحقیقی رہا، اس لیے جس عظیم باپ، حضرت مجتہد اعظم سرکار مولانا استاذنا السید سبط حسین النجفی طاب ثراہ کی گود میں پرورش پائی، یہی جناب شمس کی علمی ترقی اور تحقیقی بلندی، نیز ارتقائے ذہن کی روشن بنیاد اور تابناک اساس حیات تھی۔

میں نے بھی موصوف کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے۔ لکھنے کا طریقہ انتہائی دلچسپ اور معلومات سے بھرا ہوا۔ ہر قدم پر گہری تحقیق اور بغیر کسی فرقہ وارانہ اور بغیر کسی قسم کے بھی یکطرفہ رجحان اور میلان کے، اپنی معتدل رائے کا اظہار ہے اور اکثر و بیشتر باتیں موصوف کے بیانات میں ایسی بھی نظر آتی رہتی ہیں، جو آج تک کسی دوسرے مقالہ نگار یا مصنف نے نہیں لکھیں اور کسی کی بھی نظر ان کی طرف نہیں گئی۔

مجھے حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ برادر موصوف اپنی پیرانہ سالی میں تصنیف

و تالیف اور ادبی و علمی مسائل کی تحقیق میں اتنا مسلسل اور گہرا شغف رکھتے ہیں، جو دوسروں کو جوانی میں بھی میسر نہیں ہوا کرتا۔ اب تک موصوف کی کئی درجن کتابیں مختلف علمی و ادبی موضوعات پر منظرِ عام پر آچکی ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلاشبہ ممدوح کی ذاتِ گرامی قوم کے لیے ایک انتہائی قابلِ قدر علمی و تحقیقی سرمایہ ہے اور ان کی تالیفات و تصنیفات علم و تحقیق کا ذوق و شوق رکھنے والوں کے لیے ایک قیمتی خزانہ ہیں۔ خدا سے میری دعا ہے کہ وہ جنابِ موصوف کی ان علمی کاوشوں کو قبول فرمائے اور انھیں مقبولیت عام کا شرف عطا فرمائے۔

دارالتصنیف کی چوتھی پیشکش "لکھنؤ کی زبان" کو میں نے اول سے آخر تک پڑھا ہے۔ اس کتاب کے مولف حضرت استاذ المجتہدین، اعلم العلما و المتفقہین الحبر العلام، آیۃ اللہ العظمیٰ مولانا السید سبطِ حسین صاحب قبلہ طاب ثراہ کے فرزندِ ارجمند، فاضلِ یگانہ، ادیبِ دوراں، سخنورِ زماں، استاد الشعرا، مصلح الادبا، علامۂ عصر، فریدِ دہر مولانا السید محمد باقر صاحب شمس ہیں۔ یہ کتاب اپنے موضوع میں اس قدر جامع ہے، جس کے بعد اب کسی دوسرے کے لیے میرے خیال میں کچھ مزید اضافہ کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔

اس میں لفظ لفظ پر مضبوط براہین اور محکم دلائل میں اردو زبان کی ابتدا، ترقی اور انتہا پر انتہائی پر مغز اور قابلِ قدر بحثیں ہیں، دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ و شعرا پر تفصیلی تبصرہ ہے اور اس سلسلہ میں ہر ادبی رخ اور علمی گوشہ پر نظر ڈالی گئی ہے، جس کے نتیجہ میں یہ مختصر کتاب ادبی جواہر پاروں کا ایک بیمثال خزانہ بن گئی ہے۔ میں نے اس بیمثل و لاجواب کتاب کو جب پڑھنا شروع کیا تو مجھے اس کا احساس ہو گیا کہ اب میں اس کو آخر تک پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یقیناً حضرتِ شمس کی ذاتِ گرامی ادبی و علمی دنیا کے لیے قابلِ فخر ہے۔ اللہ انھیں سلامت رکھے اور دنیا والوں کو ان کی معرفت حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور علم و تحقیق کا یہ چراغ ہمیشہ روشن و تاباں رہے! آمین

محسن ملت

جناب علامہ سید محمد محسن صاحب قبلہ مجتہد



آسمانِ ادب کا شمس نصف النہار

جناب مولانا سید محمد باقر شمس صاحب برصغیر کے سب سے بزرگ علمی و ادبی خاندان کے ممتاز فرد ہیں ۔ اس اضافی وصف کے ساتھ وہ خود اپنے ذاتی و علمی و ادبی کمالات کی وجہ سے آسمان ادب کے شمس نصف النہار ہیں ۔ ان کی علمی و ادبی کاوشیں علما و ادبا سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں ۔ وہ ادیب شہیر و ناقد بصیر اور مورخ کبیر ہیں ۔ رسالتماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سے اسلام پر کیا گزری ، اس کا تاریخی مطالعہ جس گہرائی و گیرائی کے ساتھ کیا ہے ۔ وہ اپنی مثال آپ ہے ۔ ان کے ادبی مضامین رنگا رنگ ہیں ۔ وہ ہر طرز کی تحریر پر قدرت رکھتے ہیں اور موصوف نے ایک مضمون شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کے رنگ میں تحریر کیا ہے اگر اس مضمون کے ساتھ حضرت شمس کا نام نہ ہوتا تو آزاد مرحوم کے طرزِ نگارش سے واقف حضرات مرحوم ہی کا مضمون سمجھتے ۔ ان کو فن شاعری میں ایسا درک ہے کہ نقد و تبصرہ کرتے وقت بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے ۔ وہ تاریخ لکھنؤ کے دائرۃ المعارف ہیں ، لکھنؤ کی زبان و تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر ہیں ۔ خدا ان کو سلامت رکھے !



جناب علامہ سید رضی جعفر صاحب قبلہ

ممتاز عالمِ دین

ملتِ جعفریہ کے ممتاز عالم دین، دارالتصنیف کے بانی و سرپرست، خاندان اجتہاد کی عظیم المرتبت شخصیت عالیجناب مولانا محمد باقر شمس صاحب دام مجدہ نہ صرف عظیم الشان خاندانی وجاہت کے مالک ہیں، بلکہ ایک منفرد علمی ہستی اور تخلیقی ذہن رکھنے والی ممتاز شخصیت ہیں۔

آپ خالص، علمی و تحقیقی مضامین کو بھی ایسے دلنشین انداز میں بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں کہ بات دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جائے اور مضمون شروع کرنے کے بعد جب تک اختتام تک نہ پہنچ جائے، کتاب ہاتھ سے رکھنے کو دل نہ چاہے اور بقول حسین انجم صاحب (مدیر "طلوعِ افکار"):

> "زبان کی صفائی، شائستگی اور سلاست، روز مرہ و محاورہ پر قدرت، علم عروض اور معانی و بیان پر مہارت نے ان کی تحریروں میں طنز و مزاح کی بقدرِ ضرورت آمیزش سے چوکھا رنگ اور تیکھا لطف پیدا کر دیا ہے۔"

"نگارشاتِ رنگ رنگ" آپ کے نہایت وقیع مضامین کا مجموعہ اور گلہائے رنگ رنگ کا گنجینہ ہے، جس میں اگر "وجودِ باری اور فطرتِ انسانی" ایسے اہم علمی موضوع پر گرانقدر تحقیقی مقالہ معرفتِ پروردگار سے انسان کو قریب کرتا ہے، تو "حالی کا سرقہ" ایسے تنقیدی مضامین بھی ہیں، جو اہل ادب کے لیے بہت سے مخفی اسرار سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا ہر مضمون ارباب تحقیق کے لیے نہ جانے کس قدر نت نئے گوشوں کو نمایاں کرتا ہے۔ خصوصاً آپ کی تنقید اس قدر موثر ہوتی ہے اور استدلال کا انداز ایسا منفرد ہے، جس کی داد نہ دینا ناانصافی ہے۔ آپ نے اپنے گرانقدر مقالات: "تحقیق زبان کا فلسفہ"، "زبان کے مرکز کا فلسفہ"، "اردو زبان کے مرکز کا مسئلہ"، "مورد الفاظ کا مسئلہ"، "متروکات کا مسئلہ" اور "عطف و اضافت کا مسئلہ" ایسے خالص لسانیاتی مضامین میں بھی تحقیقات کے دریا بہائے ہیں آپ کے مزاج کا اندازہ اس فقرہ سے ہو سکتا ہے:

> "تمسخر، جسے آج کل ظرافت کہا جاتا ہے، ان کی طبیعت میں نہیں تھا۔"

اس فقرہ میں زمانے کی زبوں حالی کا مرثیہ بھی پوشیدہ ہے کہ ہم ابتذال کی اس سطح تک پہنچ چکے ہیں کہ اب تمسخر اور ظرافت میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا۔ جو واقعۂ تہذیب و ثقافت کے حوالہ سے ایک المیہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

آپ ایک باکمال ادیب کے ساتھ ساتھ نہایت قادرالکلام شاعر بھی ہیں اور زیادہ تر اسی صنفِ سخن پر طبع آزمائی فرماتے ہیں، جس کے ماہرین "تلامذۃ الرحمان" کے لقب سے یاد کیے گئے ہیں۔

پروردگارِ عالم کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ آپ کو عمرِ خضر و نوح عطا فرمائے تاکہ آپ اسی طرح گیسوئے ادب کو سنوارتے رہیں اور اپنے علمی شہپاروں سے اہل علم و ادب کو فیضیاب کرتے رہیں! آمین



جناب مولانا ڈاکٹر محمد حسن رضوی

مستند استاد

محترم بزرگ حضرت مولانا سید باقر شمس صاحب دام مجدہ میرے والد بزرگوار کے احباب میں سے ہیں۔ مستند استاد، کہنہ مشق ادیب، انصاف پسند اور بیباک ناقد، عظیم محقق، ذہین اور عمیق نگاہ رکھنے والے مورخ، صاحب اسلوب مصنف، فن شعر کی باریکیوں سے خوب اچھی طرح واقف، مانے ہوئے باکمال چابکدست مبصر، ادب اور معاشرت کی باریکیوں اور پیچیدگیوں پر مکمل طور پر پوری طرح قدرت رکھنے والے ماہر ادب ہیں۔ لکھنے کا انداز اس قدر دلچسپ اور منطقی ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کے لیے سب سے بڑی دشواری یہ ہوتی ہے کہ وہ کتاب کو ختم کیے بغیر کیسے اپنی جان چھڑائے۔

میں نے آپ کی دو کتابیں بڑے شوق سے پڑھی ہیں۔ "اسلام پر کیا گزری" میں تاریخی مباحث و شواہد کو ایسے باکمال منطقی انداز سے پیش فرمایا ہے کہ پڑھنے والا لطف اندوز بھی ہوتا ہے اور اس کی نگاہوں کے سامنے سے حقائق پر ڈالا ہوا پردہ از خود اٹھتا چلا جاتا ہے۔ اس کو اچھی طرح سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کے خلاف کیا کیا سازشیں تیار کی گئیں، کیسی کیسی ریشہ دوانیاں کی گئیں اور اسلامی تعلیمات کو کس کس طرح، کس کس ڈھب اور کس کس نیت سے توڑ مروڑ کر اپنے ذاتی

مفادات کے لحاظ سے پیش کیا گیا ... ذاتی مفادات کو حاصل کرنے کے لیے کیسے کیسے جال پھیلا کر مقاصد حاصل کیے گئے اور اس کے نتائج تاریخ اور معاشرہ پر کیا پڑے۔

آپ کی دوسری کتاب لکھنؤ کی تہذیب پر ہے، جو بڑے دلچسپ، ماہرانہ اور ادیبانہ انداز میں لکھی گئی ہے، جس کو پڑھ کر لکھنؤ کی تہذیب کا پورا نقشہ اور وہاں کی ثقافت کے تمام پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں۔ اہلِ ذوق اور اہلِ ادب کے لیے یہ کتاب معلومات کا بیش بہا ذخیرہ بھی ہے اور تحقیقات کی بنیاد بھی بن سکتی ہے۔ دلچسپی میں تو اپنا جواب ہی نہیں رکھتی۔ اس موضوع پر اتنی دلچسپ اور جامع کتاب میری نگاہ سے نہیں گزری!



جناب ڈاکٹر محمد احسن فاروقی مرحوم

منفرد مفکر

ڈاکٹر صاحب کو مولانا سے بڑی عقیدت تھی ۔ مرحوم اگر زندہ ہوتے تو نہیں معلوم کیا کچھ لکھتے ۔ افسوس کہ وہ جوار رحمت میں جا چکے ہیں جو کچھ وہ مولانا کے بارے میں لکھ چکے ہیں ، اس سب کو یکجا اور ایک مضمون کی صورت میں پیش کر کے ان کی کمی کو پورا کر دیا ہے ۔ سرخی بھی انھیں کے ایک مضمون سے ماخوذ ہے ۔ (مرتب)

سید محمد باقر شمس صاحب ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے ۔ ان کا تعلق خاندان اجتہاد سے ہے ۔ یہ خانوادہ یوں تو ہزاروں برسوں سے علم و دانش کا امین ہے ، لیکن پچھلے دو سو برسوں میں اس خاندان کے افراد نے تقریباً ایک لاکھ اوراق پر مشتمل منطق ، حدیث ، تفسیر ، علم الاخلاق اور کتب ہائے مذہب حقہ کو تحریر کیا ، جو سب کی سب طباعت کے زیور سے آراستہ ہو چکی ہیں ۔ یہ کتابیں اپنے نفس مضمون کے لحاظ سے اپنا ثانی نہیں رکھتی ہیں ، اسی سبب اس خانوادہ کی شہرت نہ صرف برصغیر بلکہ عراق اور ایران کے بھی علمی و ادبی حلقوں میں پھیل گئی ۔ نوابین اودھ کے دور حکومت میں اس خاندان کو اس قدر شرف و عزت حاصل تھی کہ بادشاہ خود اس گھرانے میں آتا تھا اور بادشاہ کی رسم تاجپوشی اس خانوادہ کے عالم کے ہاتھوں انجام پاتی تھی ۔

یہ کتاب اور محمد باقر شمس کی دوسری کتب اپنے افکار اور اچھوتے پن کے لیے قابل ذکر ہیں ۔ ان کے والد مولانا سید سبط حسین مرحوم اپنے دور کے مشہور و معروف عالم دین گزرے ہیں اور ان کا شمار بڑے عالموں میں ہوتا ہے ۔ ان کی شہرت

ہندوستان کی طرح عراق میں بھی علم و فضل کے سلسلہ میں بہت تھی ۔ عراق میں پہلے وہ طالبعلم کی حیثیت سے کئی برس علم حاصل کرتے رہے اور درس خارجہ سے وابسطہ رہے ۔ مارچ ۱۹۵۲ء کے "سرفراز" کے شمارہ میں مولانا کلب حسین صاحب نے ان کی عظمت کا اعتراف ان کی رحلت کے وقت کیا ۔ مولانا سبط حسین مرحوم کا انتقال جونپور میں ۱۹۵۲ء میں ہوا ۔

سید محمد باقر شمس صاحب کو علم وراثت میں ملا ۔ وہ بہت اچھے شاعر بھی ہیں اور ان کی غزلیں و نظمیں اردو ادب کے بہترین جرائد میں شائع ہوئی ہیں ۔ وہ بہت ممتاز نقاد بھی واقع ہوئے ہیں اور اردو ادب کے بہت سے گوشوں میں ان کی تنقید قابل قدر ہے ۔ باوجود اس کے کہ موصوف علم کا سمندر ہیں ، لیکن انکساری کچھ اس قدر ہے کہ وہ اکثر یہ کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ انھیں کچھ بھی نہیں آتا ہے ۔
(ترجمۂ مقدمہ : ٹروفیس آف اسلام)

مولانا سید محمد باقر شمس صاحب کی ہستی سے علمی و ادبی طور پر مستفیض ہونے والوں میں میں اپنا شمار کر کے فخر کرتا ہوں ۔ موصوف نے جو اضافے تاریخ ، علم دینیات اور ادب میں کیے ہیں ، وہ سب کے لیے فیض رساں ہیں ۔ زیر نظر کتاب میں انھوں نے ایک ایسا کام انجام دیا ہے ، جو ہماری تہذیب اور کلچر کی تاریخ میں اہم رہے گا ۔ لکھنؤ کا نام آتے ہی ہمارے سامنے ایک نہایت حسین و دلکش تہذیب کا نقشہ کھنچتا ہے نوابان اودھ کا ، جو بعد میں شاہان کہلائے ۔ اندرونی اور بیرونی جھگڑوں سے بری ہونے کی وجہ سے یہ دور عجیب امن کا دور تھا ، جس میں وہ ساری تہذیب ، جو مسلمانوں کی آمد سے لے کر سلطنت مغلیہ کے زوال تک دہلی میں ارتقا کرتی رہی ،

لکھنؤ میں آکر ایک خاصے نکھار پر پہنچی ۔ سر سید احمد خان اور ان کے پیرووں نے اس تہذیب کو تخریب کا نام دیا، اس لیے اس کی طرف سے ایک تعصب قائم ہو گیا، جس کی بنا پر اس کی خوبیوں کی طرف عام لوگوں اور مورخوں نے دیکھنے سے انکار کیا شمس صاحب اس تہذیب کی زندہ تاریخ ہیں ۔ یہ ان کے خاندان اور ماحول کی چیز ہے اور انھوں نے اس کے حالات اس ہمدردی کے ساتھ لکھے ہیں، جو ہی اس کی خوبیوں کو نمایاں کر سکتی ہے ۔ اس کتاب کو پڑھ کر ہماری آنکھوں کے سامنے سے تعصب کی عینک اتر جاتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ سرزمین اودھ نے ایسے خوبصورت پھول لگائے تھے، جن کی دنیا کی ہر تہذیب خوشہ چیں ہو سکتی ہے ۔

اس کتاب کی تعجب انگیز صفت اس کی وسعت اور گہرائی ہے ۔ یوں تو عام تاریخ کی طرح اس میں بھی بادشاہوں کے ناموں کی سرخیاں ہیں اور حالات انھیں کے ماتحت لائے گئے ہیں، مگر بادشاہوں کے حالات سے زیادہ علمی، ادبی، مذہبی، دستکارانہ، سپاہیانہ سرگرمیوں کے حالات نہایت دلکش طریقہ پر بیان ہوئے ہیں ۔ مصنف موصوف عالم اور علمائے دین کے خاندان سے ہیں، مگر موسیقی اور اس کے سلسلہ کے وہ سب کارنامے جنھوں نے اودھ دربار کو راجا اندر کا اکھاڑا بنا دیا تھا، ان کی نظر میں ہیں اور وہ مختلف راگوں اور راگنیوں کے بیان میں بھی ویسی ہی وضاحت سے کام لیتے ہیں، جیسی ادبی یا علمی امور کے بیان میں ۔ ہم اس کتاب کو لکھنؤ کی انسائکلو پیڈیا کہہ سکتے ہیں اور اسی طرح استعمال کر سکتے ہیں ۔

مولانا عبدالحلیم شرر نے بھی اس موضوع پر کافی لکھا ہے اور ان کے حوالے شمس صاحب نے دیے ہیں، مگر شمس صاحب کی کتاب شرر صاحب کی تمام تصنیفات سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور اسی لیے ہم اسے لکھنوی تہذیب کا آخری نقطہ کہہ سکتے ہیں ۔

کتاب کو پڑھنے سے بڑے بڑے انکشاف ہوتے ہیں اور عام معلومات کی صحت ہوتی ہے ۔ مثلاً واجد علی شاہ اختر کا ہمارے ذہن میں انگریزوں کے پروپیگنڈے

سے جو تصور بنتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ عیش پرستی میں ہر وقت محو تھے، عورتوں کے ساتھ ناچنے کے سوا ان کا کوئی کام نہ تھا۔ شمس صاحب شرر کے حوالہ سے تصدیق کرتے ہیں:

"مٹیا برج کے واجد علی شاہ کو میں نے آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ اتقا، پرہیزگاری، خداترسی، اور خدا پرستی کی مجسم تصویر تھے۔"

راجا درگا پرشاد کے حوالہ سے بتاتے ہیں:

"ان کا سا کوئی بادشاہ علوم و فنون کی ایسی جامعیت کے ساتھ ہند کی سرزمین سے نہیں اٹھا اور اس فضل و کمال کے کسی فرمانروانے ہندوستان کی فضا میں علم بادشاہی بلند نہیں کیا۔"

اس کتاب کی گوناگوں خوبیوں میں سے چند ہی کی طرف اشارہ کافی ہے۔ کتاب آپ کے سامنے ہے۔ سب سے اہم بات، جو علمی کتاب کی حیثیت سے اس کتاب سے ثابت ہوتی ہے، یہ ہے کہ لکھنؤ کی تہذیب کو خواہ مخواہ تخریبی کہا گیا۔ اصل میں وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیب کا عروج تھی۔ اس تہذیب کے حسین ناصر نے لکھنؤ کو بھی ایک شعر بنا دیا تھا اور شاعری کے جو تجربے یہاں ہوئے وہ اردو ادب کے لیے دائمی طور پر اہم رہیں گے۔ (مقدمہ، تاریخ لکھنؤ)

مولانا کی یہ بڑی خصوصیت ہے کہ ان کے مطالب اوریجنل، ترتیب دلنشیں تحریر شگفتہ، زبان مستند و معیاری ہوتی ہے۔ وہ ایک منفرد مفکر اور صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ میں علمی و ادبی حیثیت سے ان سے مستفید ہونے والوں میں اپنا شمار کر کے فخر محسوس کرتا ہوں۔ (ماخوذ از لکھنؤ کی شاعری)

جناب تارا چرن رستوگی



اردو زبان، اسلوب و بیان کے ماہر

اترپردیش ریاست کا سرکاری ماہنامہ "نیا دور"، جو سید امجد حسین کی ادارت میں شائع ہوتا ہے، متعدد خصوصی نمبر (بشمول حالیہ "اودھ نمبر") جملہ مختصات کے ساتھ پیش کر چکا ہے۔ چونکہ علاقہ "اودھ"، جس کا مرکز لکھنؤ رہا ہے اور اس حقیقت کی روشنی میں کہ فروغ اردو ادبیات میں مخصوص روایت و درایت کا حامل ہے، "نیا دور" کا "اودھ نمبر" خاص اہمیت و افادیت کی دستاویز بن کر ابھرا تو ہے اور اردو ادبیات کے مطالعہ میں اس خصوصی نمبر کو کبھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس میں کچھ تشنگی بھی نظر آئی۔ اس میں مولانا شمس پر کوئی مضمون شامل نہیں ہے اور استاذی جعفر علی خاں اثر لکھنوی پر بھی کوئی سیر حاصل تحریر نہیں ملتی۔ اثر مرحوم ہمہ جہتی جینئیس (genius) تھے۔ وہ جموں کشمیر ریاست کے قائم مقام دیوان بھی رہے، جس کا کوئی ذکر "اودھ نمبر" میں نہیں ہے۔

اس مضمون میں مولانا شمس ہی کے اردو زبان نیز اظہار و بیان سے متعلق خیالات، جو ان کی درج ذیل تصانیف سے ابھرتے ہیں، پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی:

۱۔ تاریخ زبان اردو، یعنی اردو کی اصل اور اس کے ارتقا کی تاریخ

۲۔ لکھنؤ کی زبان

۳۔ لکھنؤ کی تہذیب

۴۔ شعور و شاعری

۵۔ نگارشاتِ رنگ رنگ

ان متذکرہ تصانیف میں اس ایک اہم حقیقت کا اظہار بھی غالباً ضروری تھا کہ لکھنؤ کی تہذیب شیعہ اساس ہے اور شیعہ مقتدرات سے متصف حضرات علوم و فنون کی تحصیل و ترویج میں خاص مقام و مرتبہ کے حامل رہے ہیں۔ مذہب تو مذہب لکھنؤ کے سر وزیر حسن (سابق چیف جسٹس) کے صاحبزادہ سجاد ظہیر ہی کو یو۔پی۔میں اشتراکی تحریک کو ترویج دینے اور اس خرد فروزی کو پروان چڑھانے کے تعلق سے خشتِ اول کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی ہی نے انھیں پاکستان میں تحریک کو سرگرمِ کار رکھنے کی غرض سے وہاں بھیجا تھا۔ ان کے معتقدین میں سبطِ حسن کو کون فراموش کر سکتا ہے۔ سبطِ حسن مرحوم کی تصنیف "موسیٰ سے مارکس تک" اشتراکی نقطۂ نظر سے تہذیب و تمدن کے ارتقا پر سنگِ میل تصنیف ہے۔ سجاد ظہیر (عرفِ عام میں بنے بھائی) کی تصنیف "روشنائی" اردو ادبیات میں ناقابلِ فراموش تصنیف ہے اور ان کی تصنیف "انگارے"، جو بتعاون رشید جہاں معرضِ وجود میں آئی، ترقی پسند افسانوی ادب کی نقیب و رہنما تصور کی جانا چاہیے۔

مولانا باقر صاحب نے لکھنؤ کو "کعبۂ عظمت" کہا ہے، جو ہر اعتبار سے اس شہر کے مختصات و متصفاتِ تہذیب کا آئینہ دار ہے۔ صبح سے شام تک کے تمدنی افق و شفق کے مناظر کا دیدہ ورانہ نقشہ پیش کرنا جوئے شیر لانے سے کم مشکل کام نہیں ہے:

لوگ مشتاق تھے، دیدار کے دیوانے تھے
ہفت اقلیم میں اس شہر کے افسانے تھے

(عیش)

طعام، مشروبات کے انواع و اقسام آج تک مثالی تصور کیے جاتے ہیں۔ عوام و خواص کے نشست و برخاست پر بھی مرورِ ایام کا بہت کم اثر پڑا ہے۔ بایں ہمہ

پرانا طرزِ حیات تاریخ میں چلا گیا ہے۔ مولانا موصوف نے اس کی لسانی قلمبندی کر کے قابل تعریف کام انجام دیا ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب نے زبان اردو کی مخصوص حنا بندی و مشاطگی کی ہے۔ یہ وہ موضوع ہے، جس پر ابھی تک سیر حاصل تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔

لکھنؤ کی شائستگی و آراستگی نے اردو زبان کو بھی آراستہ و پیراستہ کیا۔ اگر شمس صاحب کی تصنیف "تاریخ زبان اردو" کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے اور بین السطور پر توجہ مرکوز رہے تو یہی حقیقت ابھرتی ہے کہ سرزمین لکھنؤ ہی میں اردو زبان میں چار چاند لگے۔ لکھنؤ میں یا آپ چاہیں تو اودھ کہہ لیجیے، بات ایک ہی ہے۔ اودھ میں اردو کی آمد سعادت خاں برہان الملک کی صوبہ داری کے ساتھ ہوئی۔ تاریخی حیثیت سے اردو برج بھاشا سے نہیں، بلکہ سورسینی پراکرت کی اس شاخ سے نکلی ہے جو دلی کے آس پاس علاقوں میں بولی جاتی تھی، جس کو بانگڑو بھی کہتے تھے۔ مولانا شمس کا یہ نتیجہ اخذ کرنا فی الواقع تعجب خیز ہے، کیونکہ محققین اس نتیجہ پر خاصے طویل مطالعات کے بعد پہنچے۔ ہندی کے تمام تر شعرا ملک محمد جائسی، تلسی داس، سورداس، بہاری اور رحمان (عبد الرحیم خانخاناں) مختلف علاقوں کے رہنے والے ہونے کے باوجود ایک سی زبان میں شاعری تخلیق کرتے تھے۔

مولانا موصوف نے سورسینی پراکرت کا سیر حاصل جائزہ پیش کیا ہے۔ اس پراکرت کی ضمیروں، حرفِ اشارہ، استفہام، جار و مجرور، نفی و ایجابی، سابقے، لاحقے وغیرہ پر بھی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ پانچویں صدی ہجری سے مسلمانوں نے ہند میں فتوحات حاصل کیں اور پرتھوی راج کے بعد مسلم بادشاہوں نے دہلی کو اپنا مستقر بنایا۔ فوجی چھاؤنی بھی دلی ہی میں قائم کی گئی۔ مسلم افواج میں متعدد مسلم علاقوں کے سپاہی سردار تھے۔ ترکی، دری، پشتو، فارسی وغیرہ ان کی مادری زبانیں تھیں، مگر رابطہ کی زبان کے بطور فارسی ہی مستعمل تھی۔ ملحوظ رہے سپاہ میں زیادہ پڑھے لکھے لوگ نہیں ہوتے، لہٰذا مسلم سپاہ بھی استثنائی نہیں رہی ہوگی۔ دلی میں بولی جانے

والی بانگڑو / ہریانوی / سورسینی پراکرت کے اثرات مسلم سپاہیوں پر بھی مرتب ہونے لگے ۔ انھوں نے مقامی بولی اپنے الفاظ شامل کرتے ہوئے بولنا شروع کی ہو گی اور عوام بھی فاتحوں کی زبانوں سے مستعمل الفاظ سیکھتے ہوئے اپنی زبان میں بولتے وقت شامل کرنے لگے ہوں گے ۔ اس طرح ایک نئی زبان وجود میں آنے لگی ، جو ہندی ، ہندوی ، ریختہ وغیرہ کہلانے لگی ۔ فوجی چھاؤنیوں میں بننے کی وجہ سے اردو کہلانے لگی ۔ غالباً یہاں یہ بتانا صرفِ نظر ہو گیا کہ "ہندی" ، "ہندو" اور "ہندوستان" تینوں لغات فارسی زبان کے ہیں ۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں کے باشندگان خود کو "ہندو" نہیں بتاتے تھے بلکہ متعدد سمپردائے ، یعنی متعدد فرقوں ، جیسے "شیو" ، "بودھ" ، "ناتھ" وغیرہ سے وابستگی کے حامل تھے ، مگر یہ تمامتر فرقہ جات وید ، اپنشد ، سمرتیوں وغیرہ کو عقیدتمندانہ نظر سے دیکھتے تھے اور "آریہ" مستعملات سے باہر ایک لفظ ہی بن کر رہ گیا تھا ۔ مزید وضاحت میری تصنیف

Muslim World : Islam Breaks Fresh Ground

سے رجوع کرنے پر قارئین کرام حاصل کر سکتے ہیں ۔ ہندو ، ہندی ، ہندوستان وغیرہ متعلقاتِ بیانی کو جملۂ معترضہ کے تحت دیکھا جانا چاہیے ، جو برسبیل تذکرہ در آیا ۔ اردو بننے تک زبان کا بھرپور جائزہ "تاریخ زبان اردو" میں پیش کیا گیا ہے ۔ یہ بات قابلِ تعریف ہے کہ مولانا شمس صاحب نے لسانی نتیجات بغیر مواخذ کو سامنے رکھتے ہوئے حاصل کیے ہیں ، کیونکہ موصوف کو کئی زبانوں پر قابلِ توصیف و ستائش عبور حاصل ہے ۔ دہلی میں اردو کا ارتقا ، اردو الفاظ کس طرح معرضِ وجود میں آئے ، فارسی عربی الفاظ کے معنوں میں کیا کیا تصرفات مزاج و آہنگ سے ہوئے ۔ مثلاً "دبنگ" فارسی میں پست فطرت آدمی کو کہتے ہیں ، مگر اردو میں رعبدار آدمی کے معنوں میں بولا جانے لگا ۔ مشاعروں کی ابتدا خان آرزو نے کی ۔ زبان سازی کا دور شروع ہو چکا تھا اور اردو اپنی لفظیات کی جانب رواں دواں ہو گئی ۔ متعدد زبانوں کے الفاظ داخل ہونے لگے ، بیشمار الفاظ کے معنوں میں تبدیلی در آئی ۔ کچھ لفظوں کی نشاندہی مولانا

شمس نے کی ہے، جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ خاصی معلوماتی بھی ہے۔ بطور مشتے نمونہ از خروارے، چند ایک الفاظ ملاحظہ ہوں:

لفظ	اصل معنی	نئے معنی (اردو میں)
مہتر	بزرگ	خاکروب
راشی	رشوت دینے والا	رشوت لینے والا
سیر	جانا	تفریح
رائج	رواج دینے والا	رواج پانے والا
اوقات	وقت کی جمع	حیثیت
وقعت	جنگ و جدل	عزت
قارورہ	شیشہ	پیشاب
غربت	مسافرت	مفلسی
غریب	مسافر	مفلس

ہندوستانی زبانوں کے الفاظ کے ساتھ بھی تصرف کیا جانے لگا۔ نئے الفاظ اور نئے محاورے پیدا ہونے لگے۔ جیسے: الٹے تلے، اُلٹے گیلے، ان بن، انجر پنجر، تابڑ توڑ ... ایسے ہی بیشمار اور کہاوتیں، نئے محاورے بھی پیدا ہوئے اور مروجہ ہندی سے بھی لیے گئے۔ جیسے: پاپڑ بیلنا، اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد، صلواتیں سنانا وغیرہ۔

کچھ محاورے خاص قلعۂ معلیٰ میں پیدا ہوئے اور زبان میں داخل ہو گئے۔ جیسے: مردہا (آدمی کو بادشاہ کے سامنے لانے والا)، خاصہ تراش (بادشاہی حجام)، خاصہ (شاہی کھانا)، نواب ناظر اور عرض بیگی (مہتمم آداب دربار)، خواص (خدمتگار)، فوجدار (فیل بان)، قلاوزؔ (غلام)، سکھ (نیند، خواب)۔

ان سب پر غور کر کے مولانا شمس نے درست نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ایک ایسی زبان بن گئی، جو اس برصغیر میں بسنے والی تمام قوموں کے مذہب، جغرافیہ، رسم و رواج، تہذیب و تمدن اور صدیوں کے تاریخی واقعات کی حامل ہے۔

بہت سے الفاظ میں حرکت کا فرق ہو گیا. جیسے میت (می یت) کا میت ہو جانا۔ زیر زبر کے فرق سے الفاظ کا لہجہ اور لوچ بدل کر اردو مزاج کے موافق بنتے گئے. "ع" اور "ح" کو مخرج سے ادا کرنا غیر فصیح سمجھا جانے لگا۔ موصوف نے پندرہ، سولہ سال کی عمر میں جب اپنے والد (سلطان العلما مولانا سبط حسین صاحب مجتہد) کا کہا ہوا اردو مرثیہ پڑھا تو ان کے والد مرحوم نے تنبیہ فرمائی تھی کہ اردو زبان میں "ح" اور "ع" کو مخرج سے پڑھنا غیر فصیح ہے۔

اردو کو ٹکسالی زبان تک منزل بمنزل لے جانے میں لکھنؤ کا خاصا اہم رول رہا ہے۔ اگر اس کا بھرپور جائزہ لیا ہے تو مولانا شمس ہی نے اپنی تصنیف "تاریخ زبان اردو" میں لیا ہے۔ اگر یہ دعویٰ پیش کیا جائے کہ اردو کو اعلا منصب تک پہنچانے میں لکھنؤ کے زباندانوں اور شاعروں کا مخصوص و ممتاز کردار رہا ہے تو اس دعوے کو درست ہی قرار دیا جائے گا۔ لکھنؤ کی آب و ہوا، یہاں کی عام فضا میں زبان کی لطافت اور لہجہ میں لوچ اور شیریں کیفیت کا سحر وغیرہ پائے جاتے ہیں ... حالانکہ یہ لکھنؤ والے زیادہ تر وہ لوگ تھے، جن کے باپ دادا دہلی اور نواح دہلی مقامات سے آئے تھے، جب ان سب کی زبان اس دور میں دہلی ہی کی زبان سمجھی جاتی تھی۔

سودا، میر، مصحفی، انشا، میر حسن، شاہ نصیر کے الفاظ و محاورات میں استعمالات وغیرہ کو ناسخ ہی نے آراستگی و شستگی عطا کی۔ شیخ امام بخش ناسخ زبان اردو کے مصلح تھے۔ انھوں نے اردو کو تراش خراش کے ایسا درست کیا کہ اس میں فارسی زبان ایسی لطافت و صفائی پیدا ہو گئی۔ ناسخ کی اس کارکردگی کی تعریف بیگ زبان سبھی نے کی ہے۔ ناسخ کے تصرفات آج تک مقبول ہیں۔ داغ دہلوی تک نے لکھنؤ کی، ماسوا چند ایک، تمام تر اصطلاحات اختیار کر لی تھیں۔ ناسخ کے وضع کردہ اصولوں پر ان کے شاگرد بھی کام کرتے رہے۔ رشک، میر عشق (تصنیف: "رسالۂ میر عشق")، منیر، خورشید، بنیاد حسین جاہ اور ان کے پسر کمال، عزیز، محشر، مودب

وغیرہ کی تشریحات کو اختصار سے بیان کرتے ہوئے مولانا شمس نے جو جائزہ لیا ہے۔ وہ قابل توصیف و تحسین ہی نہیں بلکہ زبان کے ارتقائی منازل پر روشنی بھی ڈالی ہے اردو کو ٹکسالی زبان بنانے میں لکھنؤ کے شعرا و ادبا نے اساسی رول ادا کیا ہے۔ عبد الحق کی تردید کرتے ہوئے شمس صاحب نے ثبوت فراہم کرتے ہوئے کہا ہے

"شعرائے لکھنؤ کا کلام ثقیل اور نامانوس عربی، فارسی لفظوں اور ترکیبوں سے پاک ہے۔ وہ سہل، شستہ اور عام فہم زبان میں شعر کہنا ضروری سمجھتے ہیں۔"

"تاریخ زبان اردو" اپنی نوعیت کی واحد تصنیف ہے۔ راقم الحروف کی نظر سے اس افادیت بھرپور تصنیف سے بہتر کتاب ہنوز نہیں گزری ہے۔ "لکھنؤ کی زبان" کلاسیکی تصنیف ہے، جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۸ء میں نکلا تھا۔ لکھنؤ کی زبان پر جا و بیجا اعتراضات کرنا دہلی والوں کی عادت میں داخل ہو گیا تھا، لہٰذا معترضین کو راہ راست پر لانے کی کوشش کوئی مجتہد ہی کر سکتا تھا۔ جناب شمس صاحب نے اردو زبان کے مسائل کو فلسفۂ لسان اور تاریخ کی روشنی میں دیکھنے پر توجہ صرف کی۔ انھوں نے انشا اللہ خاں انشا کا تمامتر مطالعہ کرتے ہوئے چار شرطوں کو پیش کیا ہے۔ جو اہل زبان بننے کے لیے ضروری ہیں۔

۱۔ ماں باپ اہل زبان ہوں
۲۔ اہل زبان کی صحبت میں رہے
۳۔ تحقیق و تحصیل زبان میں مشغول رہے
۴۔ آدمی پرکھنے والا اور ذہین ہو

انشا نے لکھنؤ کی زبان کو دہلی کی زبان پر ترجیح دی ہے، کیونکہ لکھنؤ کے لوگ اپنے لہجے کے اعتبار سے فصیح و بلیغ، زبان شناس ہیں۔ مولانا امداد اثر نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ دہلی شہنشاہی کا آفتاب لب بام آ چکا تھا، لہٰذا اردو شاعری کے آغاز ہی سے دلی میں بدامنی کا دور دورہ تھا اور نگزیبی عہد کی شام ہوتے ہی

انتشار اور افراتفری سے دلی میں سکونت دشوار ہو گئی تھی ۔ مرہٹے ، سکھ ، افغان ، جاٹ وغیرہ نے تباہ حالی کے زمانہ کا آغاز کر دیا تھا ۔ ہوتے ہوتے انگریز چھا گئے اور آخری مغل شہنشاہ ظفر قیدی بنائے جانے کے بعد جلا وطن کر کے رنگون منتقل کر دیے گئے تھے ۔ مگر سعادت خاں برہان الملک بہادر جنگ کو اودھ کا صوبہ ملتے ہی وہاں امن و امان قائم ہو چکا تھا ۔ دلی کی حالت یہاں تک بگڑی کے اہل کمال لکھنؤ پہنچنے لگے ۔ میر، سودا، میر حسن ، انشا وغیرہ نے لکھنؤ میں پناہ لی ۔ شجاع الدولہ نے فیض آباد کو دلی سے بھاگ کر آنے والے عوام و خواص کے لیے سکون و اطمینان کا مرکز فراہم کر دیا تھا ۔ آصف الدولہ نے فیض آباد کو خیر باد کہہ کے لکھنؤ کو دارالسلطنت بنایا اور اس طرح فیض آباد میں آراستہ محفل شعرو سخن ، ذوق و شوق فنون لطیفہ ، نیز دیگر علوم میں مہارت کی کاوشیں لکھنؤ تک فروغ پذیر ہونے لگیں ۔ اگر ناسخ سے لے کر مولانا شمس تک کے شعرا کے کلام کو پیش نظر رکھا جائے تو بلا خوف تردید یہی حقیقت ابھرتی ہے کہ موجودہ اردو دبستان لکھنؤ ہی کی مرہون منت ہے ۔ "لکھنؤ کی زبان" ایسی کلاسیکی تصنیف ہے کہ اس کا بغور مطالعہ زباندانی کے جملہ کوائف فراہم کرتا ہے ۔

تصنیفات محمد باقر شمس میں "شعور و شاعری" بڑی آن بان کی تصنیف ہے ۔ اس سے مخاطب ہونا بھی خود تعلیمی کے ذرائع فراہم کر سکتا ہے ۔ کتاب مقدمہ سے شروع ہوتی ہے ۔ معیار شعرو شاعر کا دارو مدار صحیح افہام و تفہیم کے جملہ اجزائے ترکیبی پر ہوتا ہے ، جو معنی و مفہوم کو مجروح ہونے سے بچاتے ہیں ۔ غلطی کی چار صورتیں ہیں : (۱) صرفی (۲) نحوی (۳) روز مرہ اور محاورہ اور (۴) بے محل صرف ، جو بلاغت کے منافی ہو ۔ بحث خاصی دلچسپ بھی ہے اور افادیت سے معمور بھی ، مگر ہر نشاندہی سقم پر شمس صاحب سے اتفاق کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے ، جیسے سرور جہاں آبادی کی نظم "بیر بہوٹی" کے پہلے شعر پر

آہ اے ننھے سے کیڑے ! نازش صحرا ہے تو

باغ عالم میں شگفتہ اک گل رعنا ہے تو

شمس صاحب کی رائے میں یہاں "آہ!" بے محل ہے۔ "واہ!" ہونا چاہیے۔ میری ناقص رائے میں لفظ "واہ" فصاحت کا خون کرتا معلوم ہوتا ہے۔ دراصل روز مرہ میں "آہ" کا استعمال استعجابی کیفیت سے تڑپ اٹھنے کے مفہوم میں جائز قرار پاتا ہے۔ اگر سرور کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ایک بھی نظم ایسی نہیں ملے گی، جس میں لفظ "آہ" کا استعمال نہ ملے۔ سرور نقیبی قوم پرست شاعر تھے۔ بڑے شاعر تھے۔ ہر بڑا شاعر اجتہادی بھی ہوتا ہے۔ راقم الحروف کی انگریزی تصنیف

Avant - Garde Poets of Nationalism Suroor Jahanabadi & Chakbast

جو بھارت سرکار سے فیلو شپ ملنے پر سپردِ قلم کی گئی، اشاعت کے لیے تیار کی جا رہی ہے، جس میں منجملہ دیگر موضوعات، سرور کے یہاں لفظ "آہ" کی تشریح بھی شامل ہے۔ لفظ "آہ" اور "ہائے" کبھی کبھی شدتِ جذبات کے تحت "واہ" سے بہتر ہو جاتے ہیں۔ شمس صاحب اس نکتے کو اگر توجہ کے قابل بھی سمجھیں گے تو مجھے دلی مسرت ہوگی۔ شمس صاحب ہی کی یہ رائے کہ "ناسخ و آتش" میں جو روانی ہے، وہ "داغ و اسیر" میں نہیں، قابلِ داد ہے۔

انیس کے مشہور شعر:

انیس! دم کا بھروسا نہیں، ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے؟

پر تین مشاہیر کی آرا پیش کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں انیس کے اس مقطع میں "ٹھہر جاؤ" کی جگہ "ذرا ٹھہرو" ہے، یعنی:

انیس! دم کا بھروسا نہیں، ذرا ٹھہرو
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے؟

" دم " کو سانس، پھونک اور طاقت کے معنی و مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ " ذرا ٹھہرو "، یعنی " ذرا رکو تو " کے مترادف ہے۔ شعر کا مطلب صاف و شفاف ہے۔ انیس سانس، طاقت، پھونک وغیرہ پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ چراغ زندگی کو ہمیشہ باد مخالف کا خوف رہنا چاہیے۔ جلد بازی اور افراتفری میں کوئی کام کرنا بے سود ہو سکتا ہے، سوچ سمجھ کر آگے بڑھو۔ چراغ زندگی کبھی بھی بجھ سکتا ہے۔ شعر بے معنی نہیں ہے، معنی خیز ہے، معنی انگیز ہے۔ چراغ ہی اندھیروں میں ساتھ دیتا ہے۔ اس کو روشن رکھنا ہی چاہیے۔ مجھے آغا سروش کی رائے میں وزن معلوم ہوتا ہے اور وژن (vision) بھی نظر آتا ہے۔ جناب مکرم لکھنوی کی رائے بالکل " بے دم " معلوم ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ اردو کے سب سے بڑے شاعر انیس و دبیر ہی ہیں، غالب و اقبال نہیں۔

غالب کے شعر:

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

پر نیاز فتحپوری کی اصلاح پر بڑی عالمانہ بحث پیش کی گئی ہے۔ شمس صاحب شکریہ کے مستحق ہیں۔ یہی بات " مہتاب داغ " کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ شمس صاحب کی ایک ایک رائے شعری میزان فراہم کرتی ہے۔ امثال دینا طوالت کا موجب ہو گا۔ فرمودۂ شمس پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہے اور ان کی یہ رائے کہ داغ کو تصرف الفاظ کا سلیقہ نہ تھا، دقیق نکتہ شناسی پر مبنی ہے۔ مثال کے طور پر داغ کا یہ شعر پیش کیا گیا ہے:

غش کھا کے داغ یار کے قدموں پر گر پڑا
بیہوش نے بھی کام کیا ہوشیار کا

جب یہ غیر ارادی طور پر ہوا تو قدموں پر گرانے کی بجائے " آغوش " میں گرانا بہتر

ہوتا، یعنی یوں

غش کھا کے داغ یار کی آغوش میں گرا

بہت خوب اصلاح ہے۔ اسی نوعیت کی اصلاحات اور بھی ملتی ہیں اور شمس صاحب کے شعری شعور کی واضح آئینہ دار ہیں۔

شمس صاحب نے اقبال پر بھی قلم اٹھانے کی جرأت کی ہے۔ ہندوستان میں تو تعریف و توصیف اقبال میں رطب اللساں ادیبوں کو ماہرین اقبال کہا جاتا ہے۔ "بال جبریل" سے جتنی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ یعنی اغلاط اقبال کی نشاندہی کی گئی ہے، سبھی درخور اعتنا ہیں۔ "اقبال کی خامیاں" کتاب لکھ کر جوش ملسیانی نے بھی جرأتمندانہ کام کیا تھا۔ اقبال کا اردو کلام پنجابیت سے مجروح و معذور ہے۔ اگر منصور سلیم چشتی نے میری تصنیف

Iqbal in Final Countdown (New Delhi)

ملاحظہ فرمائی ہوتی تو غالباً وہ نہ لکھا جاتا، جو انھوں نے شمس صاحب کے اقبال پر اعتراضات کے بارے میں لکھا۔ اقبال کو بالعموم ذہنی تحفظات نے وہ مقام بخشا ہے جس کے اقبال مستحق نہ تھے۔ اقبال کے کلام میں فلسفیانہ نکات ملتے ہیں، مگر ان کو فلسفی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں باوجوہ ناکام رہے۔ امین زبیری کی تصنیف "خد و خال اقبال"، "شاعر بمبئی اقبال" (خصوصی نمبر ۱۹۸۸ء) اور میری متذکرہ بالا کتاب، تینوں کا مطالعہ ہی اقبال کو صحیح روشنی میں پیش کرتا ہے۔ شعر اقبال کو اتنا اُٹھاؤ دے دیا گیا ہے کہ وہ قریب قریب معدوم نظر ہی ہو جاتا ہے، لہذا ضمنی باتوں پر لب کشائی دشوار ہو جاتی ہے۔

"کلام فانی"، "کلیات جگر" میں مشمولہ شعلۂ طور، "غزلیات اصغر" ماہر القادری کے مجموعۂ نعت "ذکر جمیل" اور ان کی کہی ایک حمد، فیض کے مجموعۂ کلام "نقش فریادی"، "ابن انشا اور ہم"، میراجی کی نظم "جوئبار" وغیرہ موضوعات پر زبان و بیان، محاورہ و روزمرہ محاسن شعریہ کو مد نظر رکھتے ہوئے شمس صاحب نے

گرانقدر ادبیاتی و انتقادیاتی خدمت انجام دی ہے ۔ آجکل کے بیشتر شعرا خودرو شعرا ہیں ، یعنی انھوں نے اصلاح لینے کو تضیع اوقات ہی سمجھ لیا ہے ۔ شمس صاحب کی شعری صلاحیت و شعور اس زمانہ کے پروردہ ہیں ، جب فصاحت و بلاغت پر زیادہ زور دیا جاتا تھا ۔ شعری شریعت و طریقت میں اس کی آج بھی اشد ضرورت ہے ۔

شمس صاحب کے چیدہ چیدہ مقالات و مضامین ، جو " طلوع افکار " کراچی کے شماروں میں شامل اشاعت ہوئے ، " نگارشاتِ رنگ رنگ " میں حسین انجم (مدیر " طلوع افکار ") نے حسن ترتیب سے شائع کیے ہیں ۔ اردو و فارسی ادبیات میں قابل رشک مہارت کے حامل جناب حسین انجم ایک ممتاز نام ہے ۔ اچھے صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی کے نغز گو شاعر بھی ہیں ۔ متذکرہ مرتبہ کتاب میں تعارف انھوں ہی نے قلمبند کیا ہے ۔ تعارف نہایت بلند پایہ تحریر ہے ۔ شمس صاحب کے جملہ کوائف ادبیات اور ان کے حسب و نسب پر ارتکازانہ روشنی ڈالی ہے ۔ دوسرے الفاظ میں حسین انجم نے مولانا محمد باقر شمس کی جملہ تصانیف پر ایک سیر حاصل نکاتیاتی و انتقادیاوی تخلیص فراہم کر دی ہے ۔ سپردِ قلم کیا ہوا تعارف کیا ہے ، بحر در کوزہ ہے ۔ شمس صاحب خاندانِ اجتہاد کے شجرہ میں مشمول ہیں ۔ خاندانِ اجتہاد کے مورثِ اعلا مولانا دلدار علی غفرانمآب ہندوستان کے پہلے شیعہ تھے ، جو ۱۲۳۵ھ یعنی قریب ساڑھے چار سو سال پہلے واصل بحق ہوئے ۔ یہاں بطورِ جملہ معترضہ ہی سہی ، ایک بات کہنے کو جی کرتا ہے ۔ میں نے ڈاکٹر شریعتی کے حوالہ سے اپنی تصنیف

Muslim World: Islam Breaks Fresh Ground

(Ashioh . New Delhi)

میں لکھا ہے کہ اسلام میں شیعہ تحریک تاریخی و ثقافتی تعامل مرجعی و اجتہادی تحریک تھی ۔ مجتہد بدلتے زمانہ پر بھی نظر رکھتا ہے ، مطالباتِ زمانہ کے لحاظ سے مذہب کو اس طرح ہم آہنگ رکھتا ہے کہ قران و حدیث کی روح مجروح نہ ہو ۔ سر سید جیسے کٹر سنی نے بھی اپنے ایک مضمون مشمولہ " تہذیب الاخلاق " میں منصب مجتہد کی تعریف کی

ہے، جس کا بطورِ خاص حوالہ مظہر حسین نے اپنی حالیہ تصنیف "علی گڑھ تحریک ... سماجی و سیاسی پس منظر" (انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی - ۲) میں ذکر کیا ہے۔ شمس صاحب بھی ادبیاتی مجتہد ہیں، کیونکہ ان کی دانشوری روایت سے درایت کو محیط ہے اپنے مقالات و مضامین (جو "نگارشاتِ رنگ رنگ" میں شامل ہیں) میں تخلیق زبان کا مسئلہ، اردو کے مرکز کا مسئلہ، مورد الفاظ کا مسئلہ، اردو میں عطف و اضافت، جوش کا شاعرانہ مرتبہ، اردو شاعری پر آزاد کا اعتراض، جنسیات میں فحاشی وغیرہ بطورِ خاص افادیت و اہمیت سے بھرپور ہیں۔

غرض، مولانا موصوف دبستانِ لکھنؤ کے نمائندہ ہیں اور لکھنؤ کی روایت، زبان و اسلوب کو پاکستان میں بھی فروغ پذیر کیے ہوں، درآں حالیکہ ان کی ہر ایک بات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا، مگر ان سے اختلاف بھی بے اہمیت قرار نہیں پاتا۔ موجودہ دور تکنیکی دور ہے اور آج دنیا عالمی گاؤں (global village) میں تبدیل ہو رہی ہے، جس کے اثرات زبان و بیان، روز مرہ و محاورات وغیرہ پر بھی مرتب ہو رہے ہیں، لہذا ترسیمات کے شعبہ ہائے زباندانی وغیرہ بھی اچھوتے نہیں رہ سکتے، مگر دہلی کی زباندانی بری طرح متاثر ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ پاکستان کے ایک معروف ادیب و شاعر، جو دہلی زباندانی کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں، عجیب اردو لکھتے ہیں۔ مثلاً ترجمہ گیتا میں ارجن کی بابت کہا ہے

"کھڑے سے ہو گیا بیٹھا ..."

کیا اردو ہے! مولانا موصوف پر ایسی گرفت نہیں کی جا سکتی، اچھے شاعر اور بڑے ادیب ہیں۔ استاذی اثر لکھنوی، صفی لکھنوی سرتیج بہادر سپرو، مسعود حسن رضوی ایسے پائے کے ادیبوں نے مولانا موصوف کے کام و نام کو سراہا ہے۔ ان مکتوبات پر مشتمل ایک تصنیف بھی شائع کی جانا چاہیے۔



جناب سید محمد تقی

محترم مذہبی عالم

معاشروں کی پسماندگی کتنے دردناک تہذیبی المیوں کو جنم دیتی ہے ۔ اس کا احساس مجھے ہر اس بار ہوا جب میں نے مولانا محمد باقر شمس صاحب سے ملاقات کی ۔ جب ان کی کوئی کتاب ، کوئی مضمون پڑھا ۔ کسی شخص کا تبحر ، دقت نظر اور متعدد جہتی مطالعہ بھی وہ اعتراف حاصل نہیں کرتا ، جس کا وہ مستحق ہے ، تاآینکہ وہ ایک ترقی یافتہ سماج میں پیدا ہونے کی خوش قسمتی کا حامل نہ ہو ۔ مولانا محمد باقر شمس اس ثقافتی المیہ کی زندہ مثال کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے ۔ وہ ایک مذہبی مورخ کے طور پر ایک مستند انشاپرداز کی حیثیت کے مالک تو ہیں ہی ، چند نئے نظریوں کو پیش کرنے والے اور ایک غیر جانبدار ادبی نقاد کا درجہ بھی رکھتے ہیں ۔ اتنا ہی نہیں ، کتنے اور مختلف شعبے ہیں ، جہاں ان کے غیر جانبدار قلم نے اپنی محاکمانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے ۔ ان پر عرب کلچر کے دانشوروں کا یہ قول صادق آتا ہے کہ اچھا مورخ وہ ہے ، جس کے سر کی قسم کھائی جا سکے ۔

لیکن شمس صاحب کا بڑا فکری کارنامہ ان کی وہ بحث ہے ، جو انھوں نے آغاز لسان کے سلسلہ میں کی ہے ۔ افلاطون ، میر باقر داماد اور ابن عباد کے اس نظریہ کو ، جسے فطری نظریہ کہا جا سکتا ہے ، اساس بنا کر انھوں نے جانوروں کی آوازوں کے بارے میں چند بڑی اہم اور دلچسپ باتیں کہی ہیں ۔ جہاں تک پرندوں کا تعلق ہے ،

ان کے بارے میں تو اب یہ طے ہو گیا ہے کہ وہ مخصوص بولیاں استعمال کرتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ تمام جانور شعور کی ابتدائی سیڑھی پر ہوتے ہیں جبکہ ان میں سے بعض اس سیڑھی سے بھی آگے تک پہنچ جاتے ہیں۔ شعور کی ابتدائی منزل کا مطلب یہ کہ وہ تجربات سے ایک کلیہ بنانے کی اہلیت رکھتے ہیں، لیکن کسی کلیہ کو دوسرے کلیہ سے جوڑ دے کر دانست کا نیا زاویہ دریافت کرنے کی اہلیت سے محروم رہتے ہیں اور یہی فرق ہے، جو ہومو سے پینس، حیوان ناطق کو غیر حیوان ناطق سے ممتاز کرتا ہے۔

لسانیات کے سلسلہ میں باقر صاحب نے جس نئی سطح سے قاری کو متعارف کرایا ہے، کتنا اچھا ہوتا کہ کوئی اس کی روشنی میں بات کو مزید آگے بڑھاتا مگر پسماندہ معاشرہ کا ایک المیہ یہ بھی تو ہے کہ وہ ذہن کی نئی تخلیق کو مزید آگے بڑھانے کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے، بلکہ کسی ذہن کی عمق نظر کی داد دینے یا اس کا اعتراف کرنے کی اہلیت کا بھی بمشکل ہی مظاہرہ کر پاتا ہے۔

جناب باقر شمس صاحب کے تبحر کا ایک اہم مظاہرہ .... مگر ذرا رکیے! .... ان کی علمی شخصیت کے تو کئی اہم پہلو ہیں۔ کثیر الجہتی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر لکھنا تو باقاعدہ کتاب .... چلیے! کتاب نہ سہی، ایک بڑا کتابچہ لکھنے کا تقاضا کرتا ہے۔ پلو تارک یونانی نے، جو تاریخ کے مشہور سوانح نگاروں کا سرخیل اور اخلاقی اقدار کی اساس پر بحث کرنے والوں میں نمایاں مقام رکھتا ہے، مشاہیر یونان و روم کے نام سے ایک تقابلی مطالعہ لکھا ہے، جو کلاسکس یا امہات کتب میں شامل ہے۔ اس سوانحی مجموعہ میں یونان اور روم کے متعدد اکابر کی زندگیوں کے کئی پہلوؤں اور جہتوں کو اخلاقی اقدار کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے۔ واضح طور پر شمس صاحب کی زندگی مصنفوں کے حلقہ سے تعلق رکھتی ہے جبکہ پلو تارک کا موضوع سیاسی شخصیتیں ہیں، تاہم کثیر الجہتی کے اعتبار سے وہ کسی ایسے انشا پرداز کا موزوں تر موضوع بن سکتے ہیں، جو جم کر ان کی گوناگوں شخصیتوں کا جائزہ لے سکے۔

جی تو چاہتا تھا کہ تنقید اور زبان و ادب کے دوسرے شعبوں میں ان کے قلم

کی جولانی، تاریخ عرب پر ان کی گہری بصیرت، علم کلام میں ان کی استدلالی قوت اور خاص طور پر لکھنؤ کی ثقافتی زندگی پر ان کی دلچسپ تحریروں کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے، مگر کرے کیا اے بسا آرزو کہ خاک شدہ - بہر حال یہ ایسی خدمات ہیں، جن کی توصیف میں بمشکل ہی مبالغہ سے کام لیا جا سکتا ہے - پاکستان کے موجودہ دور میں جب ثقافتی سرگرمیوں کو کچل ڈالنے کی خواہشیں بہت سے دلوں میں مچلتی رہتی ہیں، ان کے اس مضمون کا ذکر ضروری ہے، جس کا اشاعت پذیر نہ ہونا ایک المناک سانحہ ہے - یہ مقالہ انھوں نے موسیقی کے بارے میں لکھا تھا، مگر وہ منصۂ شہود پر اس لیے نہ آسکا کہ کچھ لوگ سچائیوں کو عوام تک پہنچنے کی راہ میں رکاوٹ بنے کھڑے ہیں - ہر چند مصنف کا خیال یہ ہے کہ مضمون کی عدمِ اشاعت کا سبب وہ ٹیڑھے میڑھے الفاظ تھے، جو بوڑھی انگلیوں نے لکھے تھے اور اخبار کے سب ایڈیٹر کے لیے ناقابلِ فہم بن گئے، مگر وجہ کچھ بھی ہو، ایک محترم عالم کے قلم سے اس بات کا اعلان کہ موسیقی یا غنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ عبادت کا درجہ بھی رکھتا ہے، بلاشبہ ایک اہم ثقافتی خدمت ہوتی، جو افسوس کہ حلیۂ وجود نہ پہن سکی -

اس ضمن میں یہ بات خاص طور پر پیش نظر رہے کہ باقر شمس صاحب لکھنؤ کے ایک ایسے محترم مجتہد کے فرزند ہیں، جنھیں یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ عراق میں عرصہ تک درسِ خارج لیتے رہے، جبکہ برصغیر میں مقیم کسی مجتہد نے آج تک درسِ خارج نہیں لیا اور لیا تو عراق یا ایران جا کر - درسِ خارج کے سلسلہ میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وہ سیمینار کی ایک شکل ہے - "سیمینار" کی اصطلاح کا "مذاکرہ" کے مفہوم میں استعمال صحیح نہیں ہے - "مذاکرہ" سمپوزیم کا ترجمہ ہے، "سیمینار" کا نہیں - قدیم تہذیبوں میں درسِ خارج کا طریقہ مقبول تھا - ہندِ قدیم کے رشی اور منی عموماً اسی طرزِ تعلیم کو اپناتے تھے - افلاطون کا اکیڈمی میں بھی درسِ خارج کا سا انداز تھا -

یہاں اس بات کا بھی ذکر کرنا مناسب ہو گا کہ افلاطون موسیقی کی تعلیم کو

لازمی مضمون کی حیثیت دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ موسیقی ذہنِ انسانی کو متوازن اور موزوں بنانے کا موثر تر ذریعہ ہے۔ مجھے احساس ہے کہ میں اپنے موضوع سے بہت دور چلا گیا ہوں، لیکن یہ بات تو آپ سنتے چلیں کہ افلاطون آجکل کئی اکابر، فلسفیوں اور صفِ اول کے سائنسدانوں کا سب سے بڑا فکری گرو مانا جاتا ہے۔ "ٹائمز" ویکلی نے، جسے مغربی صحافت میں محترم درجہ دیا جاتا ہے، خاص طور پر اصرار کیا ہے کہ امام خمینی نے امارتِ فقیہ کا نظریہ افلاطون کی ریپبلک سے لیا ہے، جسے پروفیسر برٹرنڈرسل فکرِ مغربی کا سب سے بڑا شاہکار خیال کرتے ہیں۔

بات دور چلی گئی جبکہ اتنی دور نہیں جانی چاہیے تھی۔ تو کہنا یہ تھا کہ باقر شمس صاحب نے، جو خود ایک محترم مذہبی عالم کا مقام رکھتے ہیں، ایک ایسا موقف اختیار کیا ہے، جو فنکاروں میں عمومی طور پر اور اسلام کے گہرے فکری مزاج سے آگہی رکھنے والوں میں خصوصی طور پر بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔۔۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شمس صاحب نے اپنی ثقافتی تحریروں میں جس حریتِ فکر کا مظاہرہ کیا ہے اور فنکاروں کی سرگرمیوں کو جس توجہ اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ خود ان کی شخصیت کی قدآوری کا ہمیشہ ایک زندہ ثبوت بنا رہے گا۔

جوش صاحب کے ادبی رتبہ پر نہایت دلچسپ بحث کرنے والے بلکہ تنقیدی ادب کے محققانہ نمونوں کا کافی بڑا مجموعہ ادبی سرمایہ میں شامل کرنے والے مولانا شمس صاحب کے قلم نے علمِ کلام میں بھی اپنی وقتِ نظر کے ثبوت فراہم کیے ہیں۔ انھوں نے آرگومنٹ بائی ڈیزائن، استدلال بمقصدیت، کے ذریعہ ذاتِ باری تعالیٰ کے وجود کو ثابت کیا ہے۔ استدلال بمقصدیت جدید مغربی علمِ کلام میں بھی خاصا مقبول رہا ہے اور گذشتہ تین عشروں میں سائنسی علمِ ہیئت نے بھی اس کی صحت کو بہت زیادہ مضبوط بنیادیں مہیا کر دی ہیں۔ استدلال بمقصدیت کا مفہوم یہ ہے کہ اس کائنات میں بڑے پیمانے پر ایسے مظاہر موجود ہیں، جن سے یہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ ایک متعین مقصد اور ڈیزائن کے تحت اس عالم کا وجود ممکن ہوا ہے

جس کا واضح نتیجہ یہی ہے کہ کائنات کو ایک باشعور ہستی نے تخلیق کیا ہے۔

مولانا محمد باقر شمس صاحب طبقۂ علما سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن انھوں نے کاپر نیکی علم ہیئت، یعنی جدید دریافتوں کی روشنی میں مذکورہ استدلال کی اساسیں قائم کی ہیں اور واضح طور پر یہی طریقہ حقیقت پر مبنی ہے، اس لیے کہ عہدِ نو نے ایک ایسی کائنات سے ہمیں متعارف کر دیا ہے، جس سے قدیم معاشرے محض ناواقف تھے، لیکن یہ آخری جملہ سنیے، ذرا زیادہ ایقان کے ساتھ لکھ دیا ہے، ورنہ ایسے کئی مضبوط شواہد بھی سامنے آگئے ہیں، جن کو مذکورہ نقطۂ نظر کی تردید میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ تو ضرور مانا جا سکتا ہے کہ معلوم تاریخ کی حد تک جو دو متقابل ہیئتی نظریے رہے ہیں، یعنی بطلموسی نظامِ کائنات اور کاپر نیکی یا زیادہ صحیح لفظوں میں فیثا غورثی نظامِ کائنات ... ان میں اول الذکر تو صرف لگ بھگ بیس کروڑ میل کا فاصلہ رکھنے والا نظام تھا، جبکہ ثانی الذکر (یعنی جدید ہیئت) نے جس کائنات سے ہمیں متعارف کر دیا ہے، وہ کم از کم پندرہ ارب سال شعاعی کا فاصلہ تو رکھتی ہے ہی اور یہ تو سائنسدانوں کا بیان ہے جبکہ متعدد وجوہ کی بنا پر، جن کا یہاں تذکرہ ممکن نہیں، اس فاصلے کو کئی گناہ بڑھانا بھی محض ناگزیر نظر آتا ہے۔

یوں آپ کہہ سکتے ہیں کہ کاپر نیکی نظامِ کائنات حقائقِ کائنات کی زیادہ صحیح نمائندگی کرتا ہے، لیکن بات کو ذرا زیادہ گہرائی میں اتر کر ٹٹولا جائے تو صورتحال بالکل ہی مختلف نظر آتی ہے۔

کاپر نیکی نظامِ عالم بنیادی طور پر حرکتِ ارض کے مفروضہ پر قائم ہے۔ حرکتِ ارض کا تصور قدیم مصر میں بھی بعض حلقوں میں موجود تھا، لیکن اس نے زیادہ منظم شکل فیثا غورث کے مقلدین میں حاصل کی اور اسی لیے عرب حرکتِ ارض کے تصورِ کائنات کو فیثا غورث سے منسوب کرتے ہیں۔ اس کے برعکس بابلیوں نے سکونِ ارض کے نظریہ کو اپنایا، جو تمام دوسری قدیم تہذیبوں کا بھی پسندیدہ نظریہ رہا اور اس وقت یہ عجیب صورتحال سامنے ہے کہ زمین کی حرکت کا یہ

نظریہ تمام سائنسی ثبوتوں سے محروم ہو چکا ہے۔

" کائنات کا نیا تصور " (A New Concept of the Univerrse) میری انگریزی کتاب کا نام ہے۔ جو مراحل تکمیل سے گذر کر اب منزل طباعت میں داخل ہو رہی ہے۔ اس کتاب کے ایک خاصے بڑے حصہ میں اس موضوع پر بھی بحث کی گئی ہے اور، اگر آپ مجھے اس جملہ کو لکھنے کی اجازت دیں تو، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مذکورہ بحث کے مطالعہ کے بعد حرکت ارض پر اصرار محض مکابرہ ہی قرار پائے گا، سنجیدہ سوچ نہیں۔

باقر شمس صاحب نے حرکت ارض کے تصور کو اپنایا ہے بلکہ ایک وہی کیا، جدید عہد کے کئی مجتہدین عظام، علامہ خوئی جو مجمرۂ معقولات کہے جاتے تھے، امام خمینی اور مولانا سید علی نقی صاحب، یعنی وہ حضرات جن کو اجتہاد کے سب سے بلند درجہ یعنی آیۃ اللہ پر پہنچنے کا اعزاز حاصل تھا، تعین وقت سے متعلق مسائل فقہی کا فیصلہ حرکت ارض کے فرضیہ کے تحت کرتے تھے اور یہ تو بہرحال واضح ہے کہ تعین وقت میں حرکت یا سکون ارض کا کوئی سا نظریہ بھی ہو، اپنایا جا سکتا ہے، جس سے مظاہر کائنات کی توضیح و تشریح میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔ البیرونی، جو مسلم کلچر کے ماہر ہیئت دانوں اور استادان فن نجوم میں شامل تھا، اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ حرکت و سکون ارض کا مسئلہ کبھی طے نہ ہو سکے گا، تاہم یہ بھی ہے کہ اس کے حل پر کائناتی مظاہر کی وضاحت موقوف نہیں ہے، اس لیے کہ صرف حوالہ کے مرکز ہی میں تو فرق پیدا ہو گا، جس سے کسی آسمانی مظہر کی تشریح میں رکاوٹ پیدا نہ ہو گی۔ البیرونی کی اس رائے پر تعجب نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ مستقبل میں ایسے حساس، باریک بین اور دور رس وسائل اور آلات بجانے کا اندازہ کرنے کا امکان موجود نہ تھا جو ابعاد کی پہنائیوں اور دقیقوں کے ارب ویں جزو کا بھی تعین کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور اس لیے حرکت ارض کے پیدا کردہ فرق کو ناپ سکیں، اسی وجہ سے حرکت اور سکون ارض کے اختلاف کو البیرونی کا لاینحل کہنا بالکل صحیح تھا۔

گذشتہ سطور میں "استدلال بمقصدیت" کا ذکر آیا تھا۔ نامناسب نہ ہو گا، اگر اس ضمن میں چند اور باتوں کا ذکر بھی کر دیا جائے ... گو مجھے بہرحال اختصار سے کام لینا پڑے گا قلت وقت کے پیش نظر کہ کتاب کی اشاعت اس مضمون کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔ استدلال بمقصدیت کو ارسطو نے دوسرے پہلو سے لیا ہے۔ ارسطو کا کہنا یہ ہے کہ کائنات میں ضبط و تنظیم پائی جاتی ہے۔ انواع کی تقسیم ... مثلاً یہ تدریجی سلسلہ کہ پہلے مرحلہ پر معادن، پھر نباتات اور حیوانات و انسان کی جدا جدا نوعیتیں پائی جاتی ہیں اور ان سب کی کثیر تحتی تقسیمیں بھی ہیں، جو سب کی سب جدا جدا دائرے رکھتی ہیں. گلاب کا بیج گلاب ہی پیدا کرے گا اور گیندے کا بیج گیندا وغیرہ خصوصاً یہ حیرت انگیز پہلو بھی سامنے رکھیے کہ ارسطو نے معادن سے انسان تک کی جو تدریج لکھی ہے، وہ جدید تصور سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

ارسطو کا کہنا یہ ہے کہ کائنات کے تمام اجزا ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، جن سے ایک کل وجود میں آتا ہے۔ یہ ترتیب مقصدیت اور منصوبہ جوئی کی نمائندگی کرتی ہے، لیکن مقصدیت کے اس استدلال کو جس انداز پر خانوادۂ اہلبیت کے چھٹے امام، امام جعفر صادقؑ نے استعمال کیا ہے، وہ حیرت انگیز بھی ہے اور نادر بھی، "بحار الانوار" کے "باب التوحید" میں امام جعفر صادقؑ اور ایک ہندو فلسفی کے درمیان وجود باری کی بحث کو بیان کیا گیا ہے۔ امام کا ارشاد یہ ہے کہ ہر چیز ایک مقصد کے لیے وجود میں آئی ہے۔ "ہڑ" ہی کو لیجیے۔ اس کے کس قدر فوائد ہیں بلکہ انسان کی جنسی سرگرمیوں کو لیجیے کہ اس کو مدد پہنچانے کے لیے کیا کیا اقدامات کیے گئے ہیں۔ ایک تفصیلی گفتگو کے بعد امام نے نتیجہ نکالا کہ اگر "نیچر" ان فوائد پر مشتمل ہے تو کیوں نہ "نیچر" کو خدا مان لیا جائے۔ "نیچر" کو خدا ماننے کی رخصت دے دینا، اور وہ بھی مذہبی دنیا کی محترم ترین شخصیتوں کے ایک محترم ترین رکن کی طرف سے، ایک ایسا انقلابی اور غیر معمولی تصور ہے، جو ایک بے حد طاقتور ذہن کی طرف سے ہی دیا جا سکتا ہے۔ پھر ضمناً اس متعلقہ نتیجہ کو بھی نظر انداز نہ کیجیے

کہ "نیچر" کو خدا مان لینے کا مشورہ وحدت الوجود کے تصور کو پیش کرنے کا حسین ترین انداز بیان بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ یاد رہے! محقق طوسی نے بھی اپنی فکری سرگرمیوں کے آخر میں کہا تھا کہ "ازوست" صحیح نہیں ہے "ہم اوست" ہی صحیح ہے۔

آقائے خوئی کا اوپر ذکر آیا ہے۔ خوئی صاحب، جن کا ماضی قریب میں انتقال ہوا ہے، "آیۃ اللہ" ہونے کے علاوہ "اعلم" کے درجہ پر بھی فائز تھے۔ "اعلم" (سب سے بڑا عالم) کا خطاب مسلم معاشرہ میں علم کی اہمیت کے اظہار کی حیثیت رکھتا ہے، جبکہ مثلاً عیسائی حضرات کے کیتھولک فرقہ کے سب سے بڑے مذہبی رہنما کا نام "پوپ" ہے، یعنی سب سے بڑا باپ۔ ایران اور عراق کے باخبر مذہبی حلقوں کا بیان ہے کہ اعلم ہونے کی وجہ سے وہ مسلم امت کی کل آبادی کے چالیس فیصد حصہ کے مذہبی قائد تھے۔ ان کا قیام نجف میں تھا، جہاں ایک ہزار سال سے عموماً اعلم حضرات قیام کرتے تھے، مگر موجودہ وحشی حکومت کی وجہ سے اب موجودہ اعلم، جناب رضا پانگانی، قم میں قیام فرما ہیں۔



جناب وحشی محمود آبادی (امریکا)

علم و ادب کا سنگم

مولانا محمد باقر شمس کی شخصیت کے دو پہلو ہیں اور علم و فن چہار پہل ۔

شخصیت کے بارے میں بلا کسی تامل کے کہا جا سکتا ہے کہ اہل سیف کی اولاد ہیں ۔ دراز قد ، لانبے ہاتھ پاؤں ، چھریرا جسم ، ناک نقشہ میں عرب و عجم کی آمیزش بلکہ کسی حد تک یونانیت جھلکتی ہوئی ۔ یہ تو ایک دیکھنے والے کا تاثر ہے ، ورنہ حقیقت تو شجرۂ نسب ہی سے معلوم ہو سکتی ہے ۔ مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ وہ ادیب ہیں تو میں یہی سمجھتا کہ نواب سعادت خاں برہان الملک کے ساتھ فیض آباد آئے ہوں گے ، جہاں سے لکھنؤ منتقل ہو گئے ، لیکن ماضی کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ سیف و قلم کا ہمیشہ ایک رشتہ رہا ۔ اسلاف دونوں کے حامل تھے ۔ امتدادِ زمانہ سے تلوار کند ہو کر ٹوٹ گئی اور صرف قلم ہی رہ گیا ، مگر اس قلم کی لاج شمس صاحب کے اسلاف نے اس طرح رکھی کہ دامن اسلام کے قطب بن گئے ۔

حدیث و فقہ شمس صاحب کی میراث تھی ، لسانیات میں عربی و فارسی اوڑھنا بچھونا اور اردو مادری زبان ۔ وقت کی ضرورت کے لحاظ سے تھوڑی انگریزی پڑھ لی اور سب کا جو آمیزہ تیار ہوا ، وہ مولانا باقر شمس لکھنوی بن گیا ۔

شمس صاحب عربی درسگاہ کے متعلم تھے ، لیکن مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا اردو ادب کا مشن ، جو لکھنؤ کے شرفا کا طرۂ امتیاز رہا : غزل کہنا ، ناولیں یا افسانے پڑھنا بزرگوں کی طرف سے ممنوع تھا ، لیکن میرا اندازہ ہے کہ شمس صاحب نے یہ سب کچھ چوری چھپے کیا اور شعور کی منزل پر پہنچے تو ان میں شعر کی پرکھ اور ادب کی جانچ

پڑتال کا پورا سلیقہ پیدا ہو چکا تھا۔ ایسے میں زمانہ کے فنکاروں کی صحبت نصیب ہوئی: صفی، عزیز، محشر، فاخر، مودب لکھنوی وغیرہ۔ نتیجہ میں شمس صاحب کا ذوق ادب لکھنویت میں پوری طرح ڈھل کر رہ گیا اور ہونا بھی چاہیے، کیونکہ ان کا خمیر وہیں کی مٹی سے تیار ہوا تھا۔ لکھنوی ادب میں کیا خامیاں تھیں اور کیا خوبیاں، یہ ایک علاحدہ موضوع ہے، لیکن یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ لکھنؤ کے ادیبوں نے زبان و بیان کو آبِ گومتی سے غسل دے کر پاک و طاہر بنا دیا۔

"شعور و شاعری" شمس صاحب کے ادبی و تنقیدی زاویۂ نگاہ کا عکاس ہے۔ بعض دوسری تصانیف بھی ہیں، جو ترجمانی کرتی ہیں شمس صاحب کے مخصوص اندازِ نظر کی۔ کسی کو اس سے اتفاق نہ ہو تو نہ ہو، لیکن اس جذبۂ خلوص کو سراہنا ہی پڑے گا کہ نگار خانۂ اردو ادب میں زبان و بیان کے بتوں کو اہلِ لکھنؤ نے جس طرح تراشا و خراشا تھا اور نوک پلک درست کر کے انھیں جس انداز سے سجایا تھا، اس میں کوئی دراندازی شمس صاحب برداشت نہ کرتے اور ایسے کسی عمل کو مستوجبِ تعزیر قرار دیتے اور یہ ابال ان کی تحریروں میں نمایاں ہو جاتا، جس سے ان کا اقتصادی سرمایہ محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

مشاہیرِ لکھنؤ کے کلام کی تدوین بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ "دیوان جاوید" جس کی ایک نظیر ہے۔ یہ کتاب شمس صاحب کے شعری ذوق اور خوش سلیقگی پر دلالت کرتی ہے۔

یہ سرمایہ ایک مخصوص علاقہ سے تعلق رکھتا ہے اور شمس صاحب کو وطنیت کی قید و بند میں جکڑ دیتا ہے، لیکن دنیا یہ کیوں بھلا دیتی ہے کہ اس سرزمین کے اردو ادب پر کس قدر احسانات ہیں۔ اودھ کی مسلم حکومت اگر وجود میں نہ آتی یا شاہانِ اودھ اردو کی سرپرستی نہ کرتے، تو دلی کے بعد اردو کدھر جاتی؟ جواب یہ ہے کہ خدا کوئی راستہ اور پیدا کر دیتا، یعنی خدا ہی نے یہ راستہ پیدا کیا تھا اور شمس صاحب اسی راستہ کے راہی ہیں اور شاید یہی جذبہ ہے، جس نے شمس صاحب سے تاریخ لکھوائی

بالفاظ دیگر اردو کے سودائی نے اردو کے سرپرستوں کا حق بھی ادا کر دیا۔

اس کتاب کو دیکھا جائے تو شمس صاحب کی مورخانہ باریک بینی کی داد دینا پڑتی ہے۔ انگریزی نے اپنے اثر سے شاہان اودھ کے کرداروں کو جس طرح تھاڑا تھا، شمس صاحب نے اپنے قلم سے اس کی طہارت کی ہے اور ہر کردار کے اصلی خال و خد کو اس طرح نکھارا ہے کہ آدمی ورطۂ حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ کتنے ضمیر فروش تھے وہ قلمکار، جنھوں نے رحمان پر شیطان کی سیرت کا ملمع چڑھا دیا۔

لکھنؤ ہی کے تسلسل کی دوسری کتاب ہے "لکھنؤ کی تہذیب" - یہ کتاب تمدنی معلومات کی انسائکلو پیڈیا ہے۔ لوگ "پہلے آپ، پہلے آپ!" کہہ کر لکھنوی تہذیب کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں گاڑی چھوٹ گئی اور دونوں میں سے کوئی سوار نہ ہو سکا، لیکن دیکھا یہ بھی گیا ہے کہ "پہلے میں، پہلے میں!" کہے بغیر ریل کی کھڑکی سے ایک دوسرے کو باہر کی طرف کھینچا جاتا رہا اور اس دھینگا مشتی میں گاڑی چھوٹ گئی۔ گاڑی دونوں کی چھوٹی۔ ایک کی تہذیب میں اور دوسرے کی بد تہذیبی میں۔

"لکھنؤ کی تہذیب" میں ایثار، پاس وضع، رواداری اور دوسری اخلاقی اقدار کے نمونے شمس صاحب نے پیش کیے ہیں۔ چونکہ خود خاندان اجتہاد کے آدمی ہیں، لہٰذا کھانوں اور دوسری چیزوں میں لکھنؤ والوں نے جو اجتہادات کیے ہیں، ان کو بیان کیا ہے، جو شمس صاحب کے گہرے مشاہدہ اور عمیق نکتہ رسی کی بات ہے۔

دوسری تصانیف کی خصوصیات بھی ایسی ہی کچھ ہیں، البتہ ایک کتاب ان کے سجادۂ وارثت سے تعلق رکھتی ہے: "اسلام پر کیا گزری" - شمس صاحب کی یہ تصنیف یقیناً وقیع ہے، مگر وہ ادبی حیثیت سے ہٹ کر عالمانہ بصیرت پر روشنی ڈالتی ہے۔

اس طرح مولانا محمد باقر شمس صاحب کی حیثیت کا تعین کیا جائے تو ایک عالم، ایک مورخ، ایک ادیب اور ایک نقاد کے امتزاج سے جو پیکر تیار ہوتا ہے، وہ

شمس لکھنوی کہلاتا ہے اور اس میں چھپے ہوئے انسان کا جائزہ لیا جائے تو لکھنوی ذکاوت ، خاندانی شرافت ، نسلی نجابت و فطانت اور شخصی متانت سے جو انسان تشکیل پاتا ہے، اس کا نام محمد باقر شمس ہے اور ہم اسی کو جانتے ہیں ۔

شمس صاحب کی صلاحیتیں یقیناً فریادی ہوں گی کہ وقت نے انھیں پہچانا نہیں اور زمانہ میں ان کی قدر نہیں ہوئی ، لیکن اہل علم و فن کا یہ شکوہ نیا نہ ہو گا ۔ کوئی مانے یا نہ مانے ، مگر ان کے نقوش قلم اتنے روشن ہیں کہ وقت کی تدریجی ترقی کے ساتھ ان لوگوں کو بھی نظر آئیں گے ، جو آج اپنی آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں ۔





جناب پروفیسر ڈاکٹر نعیم تقوی

شخصیتِ گرانمایہ

یہ زمانۂ قحط الرجال ہے۔ اس لیے عصرِ حاضر میں اگر کوئی صاحب کمال ہے تو اس کا وجود نعمت ذوالجلال ہے۔

مولانا محمد باقر شمس صاحب خاندان اجتہاد کی روشن یادگار ہیں۔ ان کی ذات اسلاف کی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ جس سے تبحر علمی آشکار ہے۔ وضعداری اور انکساری ان کا شعار ہے۔ وہ یادگار اساتذۂ کہن ہیں اور اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں تحقیق کے حوالے سے بڑے بڑے صاحبان علم نے ان کا لوہا مانا ہے اور تنقید نگار کی حیثیت سے سمجھا جاتا ہے۔ تنقید میں ان کا مشرقی انداز ہے۔ جو ان کے کلاسیکی مذاق کا غماز ہے۔ اگرچہ عصر حاضر میں تنقیدی رجحانات میں بھی انقلاب آیا ہے، لیکن تنقیدی شعور کے تاثراتی اور جمالیاتی دبستان میں مولانا موصوف کی شخصیت گرانمایہ ہے۔ صحت لفظی اور الفاظ کے دروبست پر چونکہ ان کی گہری نظر ہے، لہٰذا ان کی تنقید جاذب اثر ہے۔ جمالیاتی لطافت اور تحسین شاعری کے متعلق ان کے مضامین میں حسن کاری کا ایسا معیار ہے کہ زبان و بیان کا لطف آشکار ہے۔ مغربی حاسۂ انتقاد اور جدید تنقید نگاری کا ان کے ہاں فقدان ضرور ہے، لیکن امداد اثر، حامد حسن قادری جعفر علی خاں اثر لکھنوی، پروفیسر محمود شیرازی اور عندلیب شادانی کی طرح انھوں نے اپنی سطح پر جو خدمات انجام دی ہیں، ان کا اعتراف ضروری ہے۔

لکھنؤ کی تاریخ، لکھنؤ کی تہذیب، لکھنؤ کی شاعری، لکھنؤ کی زبان اور شعور و شاعری ایسی معرکتہ الآرا کتابیں ہیں، جن کے سبب مولانا کو ہر عہد میں یاد کیا جاتا رہے گا۔ مذکورہ کتابیں اس قدر جامع اور وقیع ہیں کہ ریسرچ اسکالرز کو ان کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے تاکہ انھیں ایسی معلومات یکجا فراہم ہو سکیں، جو بلا مبالغہ درجنوں

کتابوں سے استفادہ کے بعد بھی ممکن نہیں۔

"تاریخ لکھنؤ" اپنی جامعیت کے اعتبار سے اس دور کی سب سے زیادہ معتبر و مستند اور معلومات افزا کتاب ہے۔ مولانا عبدالحلیم شرر کی شہرۂ آفاق کتاب "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" کے بعد یہ تخلیق بیمثال ہے۔

"لکھنؤ کی تہذیب" ایک ایسا مرقع دلنشیں ہے، جس میں جا بجا تاریخی حوالہ جات سے موضوع کو مستحکم انداز سے پیش کیا ہے۔ علوم عقلیہ و نقلیہ اور جملہ فنون لطیفہ کے علاوہ بھی مختلف موضوعات پر اس کتاب میں جو مواد پیش کیا گیا ہے، اس سے مصنف کی جگر کاوی ظاہر ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب کا ہر گوشہ بے نقاب کیا گیا ہے۔

"لکھنؤ کی شاعری" میں شعرائے لکھنؤ کے فنی ارتفاع پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے اور لکھنؤ اور دہلی کی شاعری کا حقیقت پسندانہ موازنہ بھی کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے اس کتاب کے متعلق بیباکانہ خامہ فرسائی کی ہے اور مقدمہ نگاری میں غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

> "شمس صاحب کی زیر نظر کتاب کی جدید دور میں سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ اس اہم راہ کے نشانات واضح طور پر بتاتی ہے، جن پر چل کر جدید شعرا اپنا مقصد مستحکم طور پر حاصل کر سکتے ہیں۔ ساتھ یہ کتاب صاحبان ذوق کے لیے بصیرت افروز ہے اور ذوق ادب کے اسی توازن کو برقرار رکھنے کے سلسلہ میں اہم قدم ہے جو حالی اور شبلی نے اپنی کم علمی کی وجہ سے اور جدت کے غلط جوش میں بگاڑ دیا تھا۔"

"لکھنؤ کی شاعری" کی طرح "لکھنؤ کی زبان" اور "شعور و شاعری" میں جو مواد پیش کیا گیا ہے، یقیناً بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ شاعری میں تغازلی رجحان کے فروغ کے حوالہ سے بھی یہ دونوں کتابیں بحد مفید ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ کی

ضرورت اس لیے بھی ہے کہ جدید تنقید نگاروں میں سے خاصے افراد نے احساس کمتری اور عصبیت کے سبب لکھنوی شاعری کے محاسن بیان کرنے سے گریز کیا ہے اور معائب تلاش کرنے کی زیادہ سے زیادہ شعوری کوشش کی ہے۔

"نگارشات رنگ رنگ" مولانا محمد باقر شمس صاحب کے پر مغز اور علمی مقالات و مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین زیادہ تر زبان و بیان اور لسانیات سے متعلق ہیں۔ مثلاً: تخلیق زبان کا فلسفہ، زبان کے مرکز کا فلسفہ، متروکات کا مسئلہ، عطف و اضافت کا مسئلہ وغیرہ۔ اس کتاب کا مقدمہ مدیر "طلوع افکار" جناب حسین انجم نے لکھا ہے اور اس کی ترتیب و تدوین بھی انھوں نے ہی کی ہے۔ مقدمہ "تعارف" کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ "تعارف" میرے نزدیک اس لیے اہم ہے کہ اس میں مولانا موصوف کی شخصیت پر زیادہ سے زیادہ مواد نہایت شائستہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مولانا کی ہمہ گیر شخصیت اور حسین انجم صاحب کے جاذب اثر اسلوب نگارش کے سبب "تعارف" کو میں ایک قابل ذکر ادب پارہ قرار دیتا ہوں۔

شکست آئینہ، فلسفۂ خیام، در منظوم بھی ایسی تخلیقات ہیں، جن سے حضرت شمس کے اجتہادی ذہن اور اعلا علمی و ادبی مذاق کا پتا چلتا ہے۔ "انتخاب دیوان جادید" اگرچہ کوئی تخلیقی کام نہیں ہے، لیکن اس کی تالیف کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کتاب پر علامہ نیاز فتحپوری نے مقدمہ لکھا ہے۔

"اسلام پر کیا گزری" مولانا کی ایک ایسی کتاب ہے، جو انھوں نے قران و احادیث اور تاریخ کے حوالہ سے لکھی ہے۔ چونکہ مولانا کو اسلامیات، فلسفہ، منطق اور مشرقی ادبیات پر دسترس ہے، اس لیے ان کی ہر تخلیق قابل ذکر ہے۔

میں نے انتہائی اختصار سے حضرت شمس کی شخصیت اور تخلیقات پر تبصرہ کیا ہے، ورنہ ان کے افکار پر باقاعدہ صراحت سے لکھا جائے تو کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ مولانا کا دم اس دور میں غنیمت ہے۔ خداوند تعالیٰ انھیں صحت کاملہ عطا فرمائے اور شاداں رکھے! آمین



جناب وحید الحسن ہاشمی
(مدیر "پیامِ عمل"، لاہور)

نابغۂ روزگار

غالب اپنے دور کا جدت پسند، ذکی الحس، بلند خیال اور جینیس (genius) شاعر تھا۔ اس کا دل پارہ صفت اور اس کی نظر جستجو خیز تھی۔ پہلے اس کی خصوصیتِ طبع کے متعلق دو واقعے سن لیجیے:

(۱) مرزا عبدالقادر غمگین بہادر شاہ ظفر کے درباری شاعر اور قاضی القضات تھے۔ ان کی کتاب "وقائع عبدالقادر خانی" بہت مشہور ہے۔ ایک دن ازراہِ ظرافت کسی موقع پر غالب سے کہا،

"آپ کا ایک شعر میری سمجھ میں نہیں آتا۔" اسی وقت دو مصرعے خود موزوں کر کے غالب کے سامنے پڑھے:

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل، بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا غالب یہ سن کر سخت حیران ہوئے اور کہا،

"حاشا! یہ میرا شعر نہیں۔" بڑی بحث و تمحیص کے بعد مرزا کو معلوم ہوا کہ عبدالقادر گویا جتاتے ہیں کہ ان کے دیوان میں اسی قسم کے اشعار ہوتے ہیں۔

غالب کو اس بات پر تو غصہ تھا ہی کہ یہ ان کا شعر نہیں، لیکن باعثِ کبیدہ خاطری یہ امر تھا کہ ایسا مہمل شعر ان سے منسوب کر دیا گیا۔

(۲) غالب کے ایک شاگرد دہلی سے لکھنؤ گئے۔ ایک مجلس مرثیہ خوانی

میں انیس کی زبان سے ان کا مرثیہ سنا۔ بہت متاثر ہوئے ۔ دہلی واپس آکر استاد کو دو چار بند سنائے اور جو رگ دہلویت پھڑکی تو اصرار کر بیٹھے ۔

" استاد! آپ بھی ایسا ہی مرثیہ کہیں ۔" کتابوں میں تحریر ہے کہ غالب نے صرف تین بند کہے اور کہا ۔

" مرثیہ کہنا انیس ہی کا حصہ ہے ۔"

اس واقعہ سے بھی یہ اشارہ ملتا ہے کہ جب شعر گوئی سے خود شاعر ہی مطمئن نہ ہو تو شعر کہنے کا کوئی فائدہ نہیں ۔

مولانا باقر شمس اس دور میں ایک بہت بڑے سخن شناس ، سخن سنج ، سخنداں اور سخن پرور انسان ہیں ۔ ان کی طبیعت کا یہ عجیب خاصہ ہے کہ جب بھی ان کے سامنے کوئی مہمل لفظ ، شعر یا عبارت آتی ہے تو ان کے وجدان کو زبردست ٹھیس لگتی ہے ۔ اس کا اظہار ان کے ماتھے کی شکنوں یا مجبوراً ان کی تحریروں سے بخوبی ہو جاتا ہے ۔ ان کی مکمل تصنیف " شعور و شاعری " اسی جذبہ کی عکاسی کرتی ہے ۔

انھوں نے اس کتاب میں دس ، گیارہ اردو کے اہم شاعروں کے کلام میں ناقابل تردید خامیاں بیان کی ہیں تاکہ آنے والے شعرا ان خامیوں سے گریز کریں اور اردو کو لولا لنگڑا کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں ، ان کا سدباب ہو جائے ۔ ذرا اندازہ کیجیے کہ سو برس کے بعد غالب کی اس ادا کی جھلک کہاں نظر آ رہی ہے ۔

اب سوال یہ ہے کہ جب مولانا کی نظر اتنی دقیق اور ژرف بین ہے تو وہ خود شعر کہہ کر ایک عظیم شاعر کیوں نہ بن گئے ۔ اس کا جواب خود مولانا کی زبان سے سنیے :

" بڑے بڑے اساتذہ کی خدمت میں برسوں حضوری کا شرف حاصل رہا ، ان کی قدرت بیان ، تازگی مضمون ، محاسن شعریہ اور مصرع لگانے میں فنکاری اور کمال کو سمجھا ... اس کے بعد اپنے کلام کا جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ میرے اشعار کی بندش چست و درست

ہے ، ادائے مطلب پر قادر ہوں ، عروض و قافیہ ، معانی بیان اور
زبان و محاورہ کی کوئی غلطی نہیں ، مگر پامال مضامین کو فرسودہ طریقہ
پر نظم کرتا ہوں ـــ کوئی تازگی نہیں ، کوئی انفرادیت نہیں ۔ اپنے
کو شاعر سمجھنا خود کو دھوکا دینا ہے اور شعر کہنا وقت ضائع کرنا ہے ۔
میں نے فوراً شعر کہنا چھوڑ دیا ۔" (شعور و شاعری)

دیکھیے! غالب نے مرثیہ نہ کہنے کی یہی وجوہ خیال کی ہوں گی ، فرق صرف یہ ہے کہ غالب نے اس کا کہیں اظہار نہیں کیا ، مولانا نے باقاعدہ تحریر لکھ دی ۔

مولانا کا تعلق خاندان اجتہاد سے ہے ۔ معقولات و منقولات کے علاوہ اس خاندان کی زیرکی اور ذکی حسی ضرب المثل ہے ، یہی سبب ہے کہ تاریخ ہو یا تمدن ، نظم ہو یا نثر ، مذہب ہو یا سیاست ، چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی مولانا کی طبیعت پر اثر انداز ہو جاتا ہے اور جب تک وہ اس واقعہ کی اصلیت اور حقیقت معلوم نہیں کر لیتے ان کا دل مطمئن نہیں ہوتا ۔

کوئی بھی تحریک ہو ، اس کے کارکن اور اس کے وارث میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ تحریک کا کارکن بددل ہو کر ماند پڑ جاتا ہے ، لیکن اس کا وارث تحریک پر گزند نہیں آنے دیتا ، خواہ اسے اپنی جان کا نذرانہ ہی پیش کرنا کیوں نہ پڑے ۔ ہندوستان کے دوسرے خاندانوں نے علم و عمل کے چراغ روشن کیے ، لیکن خاندان اجتہاد نے کشت خاک تار سے شمس و قمر اگائے ، کیونکہ وہ اپنے کو تحریک کا کارکن نہیں بلکہ وارث سمجھتا تھا ۔ تحریک زبان اردو میں اس خاندان کی کوششیں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں ۔

مولانا باقر شمس اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں ۔ عربی و فارسی اور اردو سے انھیں فقط ربط نہیں بلکہ عشق ہے ۔ شاعری ترک کرنے کا مقصد اردو زبان سے لاتعلقی اور بے توجہی نہیں ۔ وہ اپنے کو اہل زبان نہیں آل زبان سمجھتے ہیں ، یہی سبب ہے کہ انھوں نے اردو کی ترویج کے لیے اپنے دل و دماغ کے تمام دریچے کھول

دیے ہیں۔

اردو کی اصل اور اس کے ارتقا کے متعلق متعدد نقادوں نے اپنا اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ مولانا آزاد نے "آب حیات" میں کہا ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی۔ سید سلیمان ندوی نے تحریر کیا ہے کہ مسلمان اول اول سندھ میں آئے، اس لیے سندھی مسلمانوں کے ملاپ سے جو زبان پروان چڑھی، اس کا نام اردو ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے یہ دلیل پیش کی کہ جب مسلمان خیبر کی راہ سے واردِ پنجاب ہوئے تو یہاں کی زبان کے زیرِ اثر ایک نئی زبان معرضِ وجود میں آئی، جس کے اسم فعل اور حرف پنجابی زبان سے موانست رکھتے ہیں، اس لیے اردو پنجابی سے بنی ہے۔ ڈاکٹر محمود حسین (علی گڑھ یونیورسٹی) نے اپنے مقالہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ اردو دراصل بجنور اور اس کے نواحی علاقوں میں پیدا ہوئی .... لیکن مولانا نے اپنی کتاب "تاریخ زبانِ اردو" میں متعدد حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ موجودہ اردو قدیم سورسینی زبان ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ مولانا ہی کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں

"میں بہت غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ سورسینی پراکرت ہے، جو ہندوستان کے بڑے بڑے علاقوں میں بولی جاتی تھی اور ہر علاقہ کی نسبت سے اس کا الگ الگ نام تھا۔ دہلی کی زبان بانگڑو، متھرا کی برج بھاشا، بندیل کھنڈ کی بندیلی، اودھ کی اودھی اور بہار کی مگدھی کہی جاتی تھی۔ ان مقامات کی بولیوں میں کچھ مقامی محاورے داخل ہو گئے اور کچھ کا لہجہ کے تغیر سے الفاظ کا تلفظ بدل گیا۔ اصلی زبان ایک ہی تھی، جس کے بنیادی الفاظ ان تمام زبانوں میں آج بھی موجود ہیں۔ آپ بھرنش بھی سورسینی پراکرت ہی کی کچھ متغیر شکل تھی، جس میں سورسینی پراکرت کے تمام بنیادی الفاظ موجود ہیں۔" (تاریخ زبانِ اردو)

مولانا نے فیلالوجی کے مسائل پر جتنے مضامین سپرد قلم کیے ہیں، انھیں دیکھتے ہوئے مولانا کو ایک ماہر لسانیات کہنا پڑتا ہے۔

یہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ مولانا کا دل اردو زبان کے دل کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ مولانا کی عمر کا بڑا حصہ ضلع جونپور میں گزرا، لیکن جب انھیں محسوس ہوا کہ لکھنؤ کی اردو زبان پر مسلسل مخالفت کے تیروں کی بارش ہو رہی ہے تو انھوں نے لکھنوی تہذیب اور لکھنؤ کی شاعری پر قلم اٹھایا اور کم علم ناقدوں کو بتایا کہ لکھنوی شاعری محض خارجی نہیں، بلکہ اس میں داخلیت کے عناصر بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں ان کے قول کے مطابق ذوق اور داغ دہلوی شعرا ہیں، لیکن ان کا مزاج خارجی ہے۔ ان کے مقابلہ میں آتش اور امیر مینائی داخلیت پسند ہیں۔

اس کے علاوہ لکھنوی شعرا نے لفظوں کی تراش خراش اور شعر گوئی کا جو اسلوب اردو کو عطا کیا، وہ ارتقائے زبان پر ایک احسان عظیم ہے۔ جو لوگ لکھنویت اور دہلویت کو جدا جدا کر کے ایک کو مرغوب اور دوسری کو مذموم قرار دیتے ہیں، ان کے متعلق مولانا کے دلائل کس قدر وزنی ہیں:

> "غزل میں بازاریت کی ابتدا جرأت" اور رنگین سے ہوئی اور داغ تک وہ رنگ باقی رہا۔ اسے لکھنؤ کے سر تھوپنا درست نہیں۔
>
> جرأت اور میر میں تو کوئی فرق ہی نہیں۔ دونوں ایک ہی زمانہ میں لکھنؤ آئے اور ایک ہی سال دونوں کا انتقال ہوا۔ اگر جرأت کی شاعری لکھنوی ہے تو میر کی شاعری دہلوی کیوں؟
>
> اور ستم ظریفی دیکھیے! میر تیس برس، سودا بارہ برس، مصحفی بیالیس برس لکھنؤ میں رہے اور لکھنوی نہیں کہے جاتے اور رنگین نو برس لکھنؤ میں رہنے سے لکھنوی ہو گئے۔
>
> اس سے زیادہ مزہ کی بات یہ ہے کہ جب دہلویت کا ذکر آتا

ہے تو میر، سودا، درد اور غالب کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔ یہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا خاص اسلوب اور ان کی انفرادیت ہے۔ اگر یہ دہلویت ہے تو ہر شاعر کا کلام ایسا ہی ہونا چاہیے۔ کیا وجہ ہے کہ میر، سودا، درد، شاہ نصیر، ذوق، غالب اور مومن، سب کا رنگ الگ الگ ہے "دہلویت وہی ہے، جو سب میں مشترک ہوتہ

مولانا نے صاف الفاظ میں تحریر کیا ہے:

"انشا، جرأت اور رنگین کی بیہودگیاں لکھنوی تہذیب کے بالکل خلاف تھیں۔ اس کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ ان کا رنگ کسی نے اختیار نہیں کیا بلکہ اسے مردود قرار دیا۔" (لکھنؤ کی شاعری)

بعض حضرات کا خیال ہے کہ مولانا منفی نقد تحریر کے تو ماہر ہیں، لیکن مثبت اندازِ تحریر ان کے مزاج کے خلاف ہے۔ یہ رائے مولانا کی تحریروں کو پڑھے بغیر قائم کی گئی ہے۔ مولانا نے اگر شعرا کے کلام میں نقائص تلاش کیے ہیں تو متعدد شعرا اور نثرنگاروں کے اسلوب کی تعریف بھی کی ہے۔ مثلاً:

"امید صاحب غزل تو کہتے تھے، مگر اپنے خاندانی اثرات اور کچھ استاد کے اثر سے غزل میں معشوقِ مجازی اور اس کے حسنِ ظاہری اور سامان آرائش کا ذکر نہیں کرتے تھے۔" (سید محمد جعفر امید ... نگارشاتِ رنگ رنگ)

"اردو میں صرف دو شاعر ایسے ہیں، جن کی طبیعت کہیں نہیں رکتی، ذہن کسی منزل پر نہیں تھکتا، نئی تشبیہیں، اچھوتے استعارے اور ایک ایک بات کی سیکڑوں تعبیریں ان کے سامنے صف بستہ کھڑی رہتی ہیں۔ الفاظ پر انھیں وہ قدرت ہے کہ ان کی ترکیب سے وہ شعر نہیں کہتے، سحر کرتے ہیں ... وہ انیس اور ان کے

بعد جوش ہیں ۔" (جوش ملیح آبادی ... نگارشاتِ رنگ رنگ)

"شیخ ممتاز حسین (ایڈیٹر "اودھ پنچ") کو جن لوگوں نے دیکھا تھا، وہ ان کے مقابلہ میں بڑے بڑے مدعیانِ علم کی حقیقت نہیں سمجھتے تھے ۔ وہ منطق، فلسفہ، ریاضی، تاریخ، طب اور فنِ اخلاق میں ایسا درجہ رکھتے تھے، جو ان علوم کے جاننے والے کے شایانِ شان سمجھا جاسکے ۔" (نگارشاتِ رنگ رنگ)

مولانا کی طرزِ تحریر کی درج ذیل چار خصوصیات ہیں :

(۱) تحقیق

(۲) استدلال

(۳) طنز

(۴) سادگی

مندرجہ بالا عناصرِ اربعہ کی تفصیلی بحث میں دوسرے احباب کی اصابتِ رائے پر چھوڑتے ہوئے صرف چند مثالیں دے کر یہ دعا کرتا ہوں کہ خداوندِ کریم اس نابغۂ روزگار اور یگانۂ زمانہ کی زندگی قلیل کو حیاتِ طولانی میں تبدیل کر دے تاکہ تشنگانِ علم و ادب اس بحرِ بیکراں سے اپنی پیاس بجھا سکیں!

(۱) **تحقیق کی مثال** : "دنیا کی کسی زبان میں مستند زبان کو ٹکسالی نہیں کہا جاتا ۔ ٹکسال میں تو سکے ڈھلتے ہیں ۔ زبان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۔ یہ صرف اردو میں ناسخ کی زبان کے لیے کہا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محلہ ٹکسالی میں رہتے تھے ۔ ان کی زبان میں جو شعر کہتا تھا، اس کی تعریف میں کہا جاتا تھا کہ یہ ٹکسالی زبان ہے، یعنی ناسخ کی زبان ہے ۔ باہر والوں نے اس کا مطلب نہیں سمجھا ۔ وہ اسے مستند زبان کے معنوں میں بولنے لگے ۔" (لکھنؤ کی شاعری)

(۲) **استدلال کی مثال** : "اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس عالمِ وجود کے پیچھے کوئی اسکیم اور کوئی کارفرما قوت موجود نہیں تو لامحالہ یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ یہ عالم

رنگ و بو محض ایک اتفاق کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہو گیا۔" (نگارشات رنگ رنگ)

(۳) **طنز کی مثال** : "غالب نے 'طپیدن' کو غلط کہا ہے۔ اس کو صحیح کس نے کہا ہے؟ ہم نے تو کسی کتاب میں تپ، تپاں اور تپش 'ط' سے لکھا نہیں دیکھا۔ غالب نہ معلوم کس ترنگ میں تھے۔ شاید ان کے زمانہ میں کسی جاہل نے 'تپیدن' کو 'ط' سے لکھ دیا ہو گا۔" (نگارشات رنگ رنگ)

(۴) **سادگی کی مثال** : "اس کتاب میں شعر کی فنی غلطیاں بتا کے ان کی اصلاح کی گئی ہے۔ اس میں ادنیٰ اور اعلا، ہر درجہ کے شاعر کا کلام ہے۔ ایسے بھی ہیں جو شعر کہتے کہتے بوڑھے ہو گئے، مگر کہنا نہ آیا۔ اس سے کسی کی تخفیف منظور نہیں، نہ کسی کے شعر کی اصلاح سے اس کے مرتبہ میں فرق آسکتا ہے۔ جو جس درجہ کا ہے، اسی درجہ کا رہے گا۔ اس کی غرض یہ بتانا ہے کہ فنی نقص سے شعر کا حسن خاک میں مل جاتا ہے اور اس کو دور کر دینے سے وہ چمک اٹھتا ہے۔ اس سے فن کی اہمیت ظاہر اور ذوق سلیم کی رہنمائی ہوتی ہے۔" (شعور و شاعری)





جناب پروفیسر سردار نقوی

عظمتِ زبان و بیان کا علمبردار

مولانا حالی نے اپنے ایک شعر میں خود اپنا تعارف اس طرح کرایا ہے۔

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

کم و بیش یہی مضمون حضرتِ جوش ملیح آبادی نے اس طرح نظم کیا ہے:

بہت جی خوش ہوا، اے ہمنشیں! کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

جناب مولانا باقر شمس کا شمار بھی اس محترم صف میں ہوتا ہے، جس پر جوش صاحب کا یہ شعر اپنی پوری معنویت کے ساتھ صادق آتا ہے۔ ان کی شرافت کا سرچشمہ وہ تہذیب و ثقافت ہے، جس کے متعلق انھوں نے اپنی کتاب "لکھنؤ کی تہذیب" میں نہایت محققانہ گفتگو فرمائی ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں انھوں نے لکھنؤ کی تہذیب کی جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے، ان میں نفاستِ طبع، نزاکتِ مزاج، پاکیزگیِ ذوق، شاعرانہ صلاحیت، ذہنی جودت، حاضر جوابی، جرأتمندی اور بانکپن جیسی خوبیاں شامل ہیں۔ یہ تمام خوبیاں جناب باقر شمس کی شخصیت کا حصہ ہیں۔ ان کا تعلق لکھنؤ کے اس خاندان اجتہاد سے ہے، جو اپنی مذہبی اور علمی فضیلت کے اعتبار سے نہایت معروف اور محترم حیثیت رکھتا ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب کے

فروغ اور استحکام میں اس خاندان کے مذہبی، علمی اور ادبی کارناموں نے بڑا وقیع کردار ادا کیا ہے۔ مولانا محمد باقر شمس خاندان اجتہاد کی اس علمی روایت کے امین ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی شخصیت نہ صرف یہ کہ لکھنؤ کی تہذیب کی مظہر ہے، بلکہ اس تہذیب کا ایک ایسا حصہ ہے، جس نے اپنے کل کے فروغ کے لیے قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔

ہمارا موجودہ معاشرہ تہذیبی قدروں کے اضمحلال اور انتشار کی وجہ سے بے جہتی کا شکار ہے۔ ایک ایسے معاشرہ میں جہاں زندگی کی واحد قدر کسب زر اور طلب منفعت قرار پائے، انسانوں کے درمیان باہمی رشتے محبت اور اخوت کی بجائے افادیت کی ترازو میں تولے جاتے ہیں۔ افادیت کا حد سے بڑھا ہوا رجحان انسانوں کو انسانیت کی سطح سے گرا کر پھاڑ کھانے والا درندہ بنا دیتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ ظلم و استحصال، لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارتگری کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ دراصل دولت کی محبت ایک ایسا عقیدہ ہے، جس کی قربانگاہ پر انسان سب سے پہلے جس چیز کو قربان کرتا ہے، وہ اس کی اپنی انسانیت ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے دور کے انسان انسانوں کے بھیس میں غرانے والے بھیڑیے اور پھاڑ کھانے والے درندے ہیں، جن کی ہوس زر نے پورے کرۂ ارض کو انسانوں کی قتل گاہ بنا دیا ہے۔

ایسے انسانیت کش اور اقدار دشمن دور میں ایسی شخصیتیں جنھیں اگلی شرافت کا نمونہ کہا جاسکے، تعداد کے اعتبار سے کم (بلکہ بہت ہی کم) ہیں۔ مولانا محمد باقر شمس کا شمار بھی انھی معدودے چند ہستیوں میں ہوتا ہے۔ وہ بربریت کے مقابلہ میں ان تہذیبی اقدار کے علمبردار ہیں، جو انسانوں کو حیوانیت کی سطح سے بلند ہو کر انسانیت کے اعلا مدارج تک ترقی کی دعوت دیتی ہیں۔

انسانیت کی تمام علمی اور تہذیبی ترقی کا سرچشمہ وہ صلاحیت و استعداد ہے، جسے حکمائے قدیم نفس ناطقہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان حکما کے نزدیک انسان کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ حیوان ناطق ہے، یعنی انسانوں اور حیوانوں کے درمیان ما۔

الامتیاز وہ صفت ہے، جسے صلاحیتِ نطق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ صلاحیتِ نطق کا اظہار زبان کے ذریعہ ہوتا ہے۔ زبان کی تخلیق صلاحیتوں کے اظہار کا سب سے پہلا اور سب سے اہم مظہر ہے اور یہی وہ امتیازی صلاحیت ہے، جو ایک طرف انسانوں کو دوسرے حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے اور دوسری طرف انسانیت کی علمی اور تہذیبی ترقی کے لیے اسباب و وسائل مہیا کرتی ہے۔ مولانا محمد باقر شمس نے اپنے مقالہ میں جس کا عنوان "تخلیقِ زبان کا فلسفہ" ہے، اس موضوع پر نہایت اہم اور گرانقدر خیالات پیش فرمائے ہیں۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے اپنے ایک خط میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے نام تحریر کیے گئے اس مضمون پر اس طرح تبصرہ کیا ہے:

> "اس مضمون کو میں نے بڑے غور سے اور بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ میں سمجھا تھا کہ اس میں کچھ باتیں وہ ہوں گی، جو لسانیات کے سلسلہ میں عام طور سے کہی جاتی ہیں، مگر میں نے یہ دیکھا کہ اس میں شروع سے آخر تک سب نئی باتیں ہیں۔ لسانیات کے مسئلہ پر یہاں بالکل نئی اور اچھوتی نظر ملتی ہے، جو بہت ہی زیادہ قابلِ قدر ہے۔"

سیاسی اور ثقافتی میدانوں میں مغرب سے مغلوب اور مرعوب ہونے کے نتیجہ میں ہماری فکر و نظر میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں، ان میں ایک بڑی خرابی زبان و بیان کی عظمت اور اہمیت سے اعراض و انکار ہے، حالانکہ ہر اہلِ نظر اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ انسانیت کی تمام علمی اور تہذیبی ترقی کا سرچشمہ زبان و بیان کی خوبی ہے۔ یہ زبان ہی ہے، جو اظہار و ابلاغ کا واحد وسیلہ ہے۔ ہم دوسروں تک اپنا مافی الضمیر زبان کے وسیلہ ہی سے پہنچا سکتے ہیں۔ یہ زبان ہی ہے، جس کے ذریعہ علم ایک فرد سے دوسرے فرد تک، ایک گروہ سے دوسرے گروہ تک اور ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا ہے۔ اس وسیلہ و ابلاغ کے بغیر علم کی ترقی اور فروغ کسی طرح ممکن ہو ہی نہیں سکتا۔ انسان کی اسی صلاحیت کا سورۂ رحمان میں

خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ الرحمٰن O علم القرآن O خلق الانسان O علمہ البیان O یہی بیان کی خوبی ہے، جیسے دوام و استقلال قلم کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ قلم علم کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرنے اور علمی ورثہ کو محفوظ رکھنے کا وسیلہ ہے۔ اس زوال آمادہ اور فنا پذیر دنیا میں قلم علم کے بقا اور تحفظ کی علامت ہے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنے ایک مرثیہ کے چہرہ میں قلم کی عظمت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اس مرثیہ کے ایک بند میں وہ فرماتے ہیں

اے قلم ! صورتِ میزان و معارف مقیاس
علم بنیاد و ہنر محور و ادراک اساس

فکر پیما و نظر ناقد و فرہنگ شناس
مشعلِ قصرِ ادب ، مشرقِ صبحِ قرطاس

نام تیرا سببِ جنبشِ لب ہائے رسولؐ
اے قلم ! آخری لمحہ کی تمنائے رسولؐ

قلم کی عظمت سے انکار دراصل انسان کی عظمت سے انکار ہے۔ دوسرے لفظوں میں قلم کا احترام انسانیت کا احترام ہے اور زبان کی صحت و حسن کا لحاظ قلم کے احترام کی لازمی شرط ہے۔

ہمارے خیالات و افکار کے اظہار و ابلاغ کا وسیلہ الفاظ ہیں۔ الفاظ و خیالات میں بڑا گہرا اور بامعنی رشتہ ہوتا ہے۔ یونان کے عظیم فلسفی سقراط نے اپنے آخری لمحات میں اپنے شاگرد کریٹو (Crito) سے جو مکالمہ کیا ہے، اس میں ایک موقع پر لفظوں کے استعمال پر گفتگو کرتے ہوئے اس نے کہا کہ لفظوں کا غلط استعمال اپنی جگہ خرابی ہونے کے ساتھ ہی انسانی نفس میں خرابی پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ سقراط کے اس قول پر جس قدر غور کیا جائے، لفظ کی عظمت و حرمت کا احساس اسی قدر زیادہ شدید ہوتا جاتا ہے۔ لفظوں کا غلط استعمال نفس میں خرابی پیدا کرتا ہے۔

گویا اخلاق صحت کا تعلق الفاظ کی صحت سے ہے۔

مولانا محمد باقر شمس اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں، جو الفاظ کی صحت اور حرمت کا علمبردار ہے اور یہ بجائے خود ان کے نفس کی صحت اور ان کی شخصیت کے استحکام کی دلیل ہے اور اس معاملہ میں شدت تہذیبی اور اخلاقی اقدار پر ان کے یقین و اعتماد کی دلیل ہے۔ وہ ایک ایسے ماحول میں جہاں صحت زبان و حسن بیان کو غیر اہم (بلکہ غیر ضروری) سمجھا جاتا ہے، پوری قوت اور شدت کے ساتھ حسن زبان و بیان کی اہمیت اور ضرورت کا علم بلند کیے ہوئے ہیں۔ ان کی تحریریں زبان کی نفاست و لطافت کا ایسا مرقع ہیں، جس کی داد وہی لوگ دے سکتے ہیں، جن کا ادبی ذوق پاکیزہ اور تربیت یافتہ ہو اور یہ مولانا کی شخصیت کا ایک رخ ہے، جس پر اختصار سے گفتگو کی گئی ہے۔ ان کی شخصیت کے کئی اور تابناک پہلو ہیں۔ ادب، مذہب، فلسفہ، تاریخ اور تہذیب کے مختلف موضوعات پر ان کی تحریریں ان کی محققانہ بصیرت کی آئینہ دار ہیں، جن کا مطالعہ عالمانہ سنجیدگی کی سطح سے کیا جانا چاہیے۔

مولانا محمد باقر شمس اپنی ذات میں شرافت کا ادارہ اور ثقافت کا ایسا روشن مینارہ ہیں، جو ماضی کی انسانیت افروز اور تہذیب آموز اقدار کے اجالے بکھیر رہا ہے، اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ ان کے اجالوں کے قدردان اب کم (بلکہ بہت کم) رہ گئے ہیں۔ ادارۂ "طلوع افکار" نے مولانا کی شخصیت کو خراج تحسین پیش کرنے کا فیصلہ کر کے دراصل ایک فرض کفائی ادا کیا ہے۔



جناب پروفیسر حسن عسکری فاطمی
(صدر شعبۂ ابلاغ عامہ، اردو کالج، کراچی)

مولانا سید محمد باقر شمس لکھنوی

ایک لائق استاد، شاعر، ادیب، نقاد، مورخ اور عالمِ دین

حضرت مولانا سید محمد باقر شمس لکھنوی ایک لائق استاد، صاحبِ نظر ادیب و نقاد، شاعر و مورخ اور ممتاز عالمِ دین ہیں۔ اگر ہمارے معاشرہ میں علما و دانشوروں کی قدر دوانی اور پذیرائی کا رواج ہوتا تو وہ ہمارے یہاں کے چند گنے چنے اہل علم کی فہرست میں آج سب سے زیادہ محترم اور لائقِ احترام بزرگ قرار پاتے۔ مگر چونکہ ہمارا تہذیبی اور معاشرتی شعور مادیت کے دباؤ میں انحطاط کا شکار ہے، اس لیے وہ ستاسی سال کی مسلسل مخلصانہ خدمات انجام دینے کے باوجود ادبی رسائل و جرائد اور ذرائع ابلاغ عامہ کی فراموش کردہ شخصیت قرار پائے ہیں ـــ اگرچہ شہرت و ناموری کے جدید ہتھکنڈوں سے ناواقف ہونے اور اپنی علمی و ادبی کاوشوں کو بنا سجا کر پیش کرنے کے فن سے ان کی بے نیازی بھی بڑی حد تک اس کی ذمہ دار ہے۔

انھوں نے اپنی طویل، بامقصد و بابرکت زندگی میں چودہ سے زیادہ کتب تصنیف کی ہیں، جن میں "تاریخِ لکھنؤ" ان کی شاہکار تخلیق ہے، اسی حوالہ سے یہاں ان کا ذکر مقصود ہے۔ یوں تو ان کے علمی کارنامے، تبحرِ علمی اور منفرد شخصیت، بالاستیعاب مطالعہ کا تقاضا کرتی ہے، مگر میری پیشہ ورانہ تدریسی مصروفیات، کمزور بینائی اور کم علمی مانع ہے۔ میری کیا مجال کہ میں ان کی شخصیت اور کمالات پر تبصرہ کروں، لیکن میرے لیے باعثِ فخر ہے کہ جیسا بھی مجھ سے بن پڑے، لکھ کر

سعادتمندوں میں خود کو داخل کروں۔

وہ خاندان اجتہاد کے چشم و چراغ ہیں، جس نے لکھنؤ اور وسعتِ خطۂ اودھ میں اسلامی فرقۂ امامیہ اثنا عشریہ کی بہترین اصلاحی و تریجی خدمات انجام دیں۔ اس حوالہ سے ان کے مورثِ اعلا آیۃ اللہ سید دلدار علی غفرانمآب شیعہ مسلمانوں میں محض لکھنؤ کے نہیں، پورے برصغیر کے شیعوں کے مجدد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف شیعوں کے عقائد و اعمال میں اصلاح کی کامیاب تحریک چلائی، بلکہ موجودہ مروج عزاداری کے حقیقی مقاصد کی معدوم بنیادوں کو بھی از سرِ نو تعمیر کیا تھا اور اپنے عہد کے شاہان اودھ کو اپنی قلمرو میں اسلامی طرزِ حکمرانی کے احیا پر آمادہ کیا تھا۔ اس وقت سے اب تک ان کا خاندان پاکستان و ہند میں دینی و علمی خدمات انجام دینے پر کمر بستہ ہے۔ پاکستان میں علامہ سید محمد رضی مجتہد قبلہ، علامہ سید نصیر الاجتہادی مرحوم، آیۃ اللہ سید محمد محسن نقوی قبلہ ان کے خاندان سے ہیں، جبکہ بھارت میں مولانا پروفیسر ڈاکٹر کلبِ صادق قبلہ فخرِ خاندان اجتہاد ہیں۔

مولانا باقر شمس کی شخصیت یوں تو ہمہ پہلو کمالات کی حامل ہے اور تدریس و طباعت سمیت انھوں نے متعدد شعبوں میں اعلا صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا، لیکن تنقید اور تاریخ نویسی میں وہ اپنا جواب آپ ہیں۔ اس میدان میں ان کا کوئی حریف ان سے قدآور نہیں، لیکن ان کی کتب جدید فنِ تزئین و ادارت سے بے نیاز ہونے کی بنا پر زیادہ مقبول نہیں ہو سکیں، مگر جو جی کڑا کر کے ایک مرتبہ انھیں پڑھ لے تو وہ ان کے طرزِ نگارش کا پرستار ہو جاتا ہے۔ ان کی کتب نہ صرف متن و مواد کی فصاحت و بلاغت کی بنا پر اعلا درجہ پر فائز ہیں، بلکہ اسلوبِ بیان کے اعتبار سے بھی قدیم طرزِ نگارش کے برعکس ہمارے آج کے محاورہ میں ہیں۔ مولانا باقر شمس بلاشبہ ہماری گذشتہ تہذیب و شائستگی کا آئینہ اور لکھنوی آداب و روایات و اخلاق کا آئینہ ہیں، جس میں ہم غیر منقسم ہند و پاکستان کے تہذیبی اور ثقافتی اقدار کی مجسم جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ اپنی علمی و تنقیدی نگارشات میں وہ ایک صاف گو اور بیباک، مصلحت

ناندیش اور غیر متعصب اسکالر نظر آتے ہیں، جو ہمارے بزرگوں کا شعار رہا ہے۔ وہ ایسے عالم و بزرگ ہیں، جنھیں انکساری، سادگی، شکر گزاری اور قناعت نے دنیاوی عیش و آسودگی سے بے نیاز کر دیا ہے اور وہ اپنی زندگی مذہبی خدمات اور تصنیف و تالیف کی مصروفیت میں گزار رہے ہیں۔ اگرچہ ان کی ہمت جواب دے چکی، بینائی موتیا سے بند ہو چکی ہے اور ثقلِ سماعت طاری ہو گیا ہے، مگر ان کا حافظہ اب بھی خوب ہے اور آواز ماشاءاللہ ایسی پاندار ہے کہ انھیں لاؤڈ اسپیکر کی ضرورت نہیں۔ وہ ہزاروں کے مجمع کو اس کے بغیر بھی خطاب کر سکتے ہیں، مگر ضعف نے انھیں ایسا کرنے سے معذور کر دیا ہے۔

ان کی صاف گوئی اور بیباکی محض علمی و تحقیقی دائروں تک محدود نہیں، بلکہ وہ اپنی نجی زندگی میں بھی غیر جانبدارانہ تجزیہ کر کے بے تکلف اظہارِ خیال کر سکتے ہیں اس سلسلہ میں وہ اپنی آل اولاد کی پردہ پوشی کے بھی قائل نہیں۔ جو کہنا ہے بے روک ٹوک کہہ دیتے ہیں، یہی سبب ہے کہ اپنے شخصی کردار کے مطابق جب وہ علمی و تنقیدی گرفت کرتے ہیں تو پھر چھوٹا بڑا نہیں دیکھتے۔ ان کا جوش و خروشِ تنقید جب موج میں آتا ہے تو انھیں اقلیمِ سخن میں میر کی خدائی اور غالب کی پیغمبری کوئی باز نہیں رکھتی۔ وہ میر انیس ایسے عظیم مرثیہ گو کو للکارتے ہیں، علامہ اقبال کے کلام پر اصلاح دیتے ہیں اور خواجہ الطاف حسین حالی پر سرقہ کرنے کی فردِ جرم عائد کرتے ہیں اور ذرہ برابر رعایت نہیں کرتے، نہ مروت دکھاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھیں نہ علامہ اقبال کی طرح نفسِ جبرائیل درکار ہوتا ہے:

وہ حرفِ راز، جو مجھ کو سکھا گیا ہے خودی
خدا مجھے نفسِ جبرائیل دے تو کہوں

نہ مرزا اسداللہ خاں غالب کی طرح ناگفتنی کہنے میں فسادِ خلق کا کوئی خوف دامنگیر ہوتا ہے:

وا حسرتا کہ لاکھ تمنائے گفتنی
خوف فسادِ خلق سے نہ گفتہ رہ گئے

وہ تو بس کلک عقاب اساس کو لے کر جھپٹ پڑتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں قلم شمشیر برہنہ کی طرح ہوتا ہے اور کوچۂ قرطاس میں کشتوں کے پشتے لگ جاتے ہیں، مگر بڑی آہستگی اور شائستگی کے ساتھ، لکھنوی انداز میں۔ بقول:

دامن پہ کوئی چھینٹ، نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

ادبی تنقید و مباحث میں ان کا انداز کچھ ایسا ہوتا ہے، جیسے وہ آواز لگا رہے ہوں:

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

شاید ان کی اسی مار دھاڑ اور صنمکدۂ آذری میں بتوں کی توڑ پھوڑ اور ادبی گروہ بندی کی غرودیت نے انھیں بالآخر آتشِ مغائرت میں ڈلوایا۔ وہ بلاشبہ ہماری بیباکانہ ادبی تنقید کے ماہِ کنعاں ہیں، جبھی تو مدت سے ہماری ناسپاسی کے کنوئیں میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ خود ہی ہاتھ پاؤں مار کر اس کنوئیں سے باہر آئے، مگر زلیخائے حیات نے ان کے دام نہ لگائے کہ اقلیمِ شہرت میں پذیرائی کے تخت پر بیٹھتے اور ادب پروروں کے عزیز بنتے، مگر ہم اس وقت اس قصہ میں پڑنا نہیں چاہتے کہ ادب و تنقید میں کیوں مولانا عمومی اور نصابی حوالہ نہ بن سکے۔ ہمیں تو اس آن ان کی تاریخ نگاری سے سروکار ہے۔

مولانا باقر شمس نے تاریخ نویسی میں ایسا بیانیہ طرز اختیار کیا ہوا ہے، جو دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ وہ حقائق و عبر سے ایک ایسی طلسمِ ہوشربا رقم کرتے ہیں، جس کو پڑھتے ہوئے قاری اس ماحول میں کھو جاتا ہے۔ لگتا ہے جیسے مولانا پڑھنے

والے کو کسی گائڈ کی طرح تفصیلات بتا رہے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ ہوں۔
"تاریخ لکھنو" پڑھتے ہوئے کم از کم مجھے جہاں اپنی تہذیب کے ماضی پر تفاخر ہوا، وہاں احساس زیاں بھی ہوا کہ ہمارے ماضی کے حکمرانوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بخشی ہوئی دولت و طاقت اور اقتدار کو اس شعور اور ذمہ داری کے ساتھ استعمال نہیں کیا، جس کی وہ مستحق تھی۔ بار بار ذہن اس حقیقت کی طرف گیا کہ انسان جس نعمت و صلاحیت کی قدر نہیں کرتا، وہ اس کے پاس نہیں رہتی، چھن جایا کرتی ہے۔ پھر تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی کارنامے انجام دیتے ہوئے توازن و اعتدال کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے، جس کا شاہان اودھ نے کوئی خیال نہیں رکھا۔ یہی بات مغل بادشاہوں پر بھی صادق آتی ہے، جن کی بدولت شاہان اودھ کو حکمرانی حاصل ہوئی تھی۔

مغل بادشاہوں کی بنائی ہوئی عالیشان عمارات، قلعے، مقابر اور مساجد، کتنے ہی لازوال اور بیمثال ہوں اور کسی نہ کسی حد تک راج مزدوروں اور اہل فن کے لیے فراہمی روزگار کا بھی ذریعہ رہے ہوں، مگر اس بات کا ثبوت ہیں کہ مغل بادشاہوں کی توجہ تعلیم و ہنر عام کرنے کی طرف نہیں تھی۔ وہ اگر اس طرف توجہ دیتے تو آج ہند و پاکستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جب ان بادشاہوں کے معاصر انگلستان کے بادشاہ جمہوریت، علم و ادب، زبان و کتب، صنعت و حرفت، جدتوں اور ایجادات، نئی نئی دنیاؤں کی دریافت اور اطراف کے معاشروں کی بازیافت میں معروف تھے تو ہمارے بادشاہ طاؤس و رباب سے محفلیں سجا رہے ہیں، مگر یہ بھی حیرت انگیز بات ہے کہ اس دورِ انحطاط میں بھی اودھ ہی کے نواب عمادالملک صفدر جنگ نے دہلی کالج قائم کیا، جو برصغیر میں علوم جدید و قدیم کے احیا کا منبع ثابت ہوا۔ بعد میں قابض انگریزوں نے اس کے نصاب میں انگریزی کی تدریس کا بھی سلسلہ جاری کیا۔ مولانا باقر شمس نے اپنی تاریخ کے اس رخ کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور تقریباً ساڑھے آٹھ سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب

لکھنؤ کی سیاسی ، علمی ، تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی ایک مکمل دستاویز بن گئی ہے ۔ یہ پوری کتاب اولاً مولانا کے مضامین کا مجموعہ ہے ، جو " نگار " پاکستان ، " طلوع افکار " " عکس لطیف " اور رسالہ " سرفراز " لکھنؤ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں ، پھر مصنف نے ان میں ترمیم و اضافہ کر کے باقاعدہ کتاب کی شکل دے دی ۔ اس کی تاریخ اشاعت واضح نہیں ، البتہ دیباچۂ طبع دوم میں مصنف نے ۱۹۹۱ء سن درج کیا ہے اور " دیباچۂ طبع اول ادارۂ عکس لطیف کی پیشکش " کے عنوان کے تحت ۲۲ مارچ ۱۹۷۱ء کی تاریخ درج ہے اور دیباچہ اول و دوم کے بعد شامل کتاب کیا گیا ہے ۔ تعارف ڈاکٹر محمد احسن فاروقی (ڈین آف فیکلٹی آف آرٹس ، بلوچستان یونیورسٹی) نے لکھا ہے ، جس پر یکم جنوری ، ۱۹۷۲ء لکھا ہوا ہے ۔ فاضل استاد عرصہ ہوا اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں ۔ کتاب کے آخر میں مولانا شمس نے خاندان اجتہاد کے ان علما کا ذکر کیا ہے ، جو پاکستان ہجرت کر آئے تھے اور ان کے اپنے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ۸۰۵ صفحہ سے ۸۳۲ صفحہ تک فہرست مضامین کا اندراج ہے ، جس پر کتاب ختم ہو جاتی ہے ، حالانکہ فہرست کو آغاز کتاب میں ہونا چاہیے تھا ۔ کتاب کا انتساب ان الفاظ میں ہے :

" نذر عقیدت ، علوم و فنون کے مربی ، تہذیب و تمدن کے معمار ، فرمانروایان اودھ کی بارگاہ میں ۔ ذرۂ ناچیز ، شمس ۔

انتساب شاہان اودھ کے لیے ان کے دل میں احترام کا مظہر ہے ۔ یہ اظہار تشکر بھی ہے ، کیونکہ شاہان اودھ کی سرپرستی میں خاندان اجتہاد پروان چڑھا اور اسے اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا ۔ " تاریخ لکھنؤ " کا اولین حصہ " ابتدائیہ " پر مشتمل ہے جو صفحہ نمبر ۱۲ سے صفحہ نمبر ۴۴ تک ایک طویل مقالہ پر مبنی ہے ، جس میں مولانا شمس نے اپنی وطن مالوف لکھنؤ کی تاریخ کو مختصراً بیان کیا ہے ، پھر مقدمہ ۴۵ صفحہ سے ۴۸ صفحہ تک درج ہے ، جس پر ۱۲ اگست ، ۱۹۹۱ء کی تاریخ درج ہے ۔ کتاب حصہ اول اور حصہ دوم پر مشتمل ایک ہی پختہ جلد نیوز پرنٹ کاغذ پر کتابت کے ساتھ

شائع ہوئی ہے ، جس میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی موجود ہیں اور اس پر مصنف نے معذرت کی ہے اور اپنی کمزور بصارت کا عذر کرتے ہوئے خوشنویس کو ان غلطیوں کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے ، جنھوں نے بقول ان کے اس میں املا کی غلطیوں کے علاوہ انشا کی بھی غلطیاں کی ہیں اور خود کو بری الذمہ قرار دیا ہے ۔ کتاب میں شاہان اودھ کی تصاویر خاکوں کی شکل میں شامل کی گئی ہیں اور اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ شاہان اودھ تصویر کھنچوانے کے خلاف تھے ، اس لیے غالباً خیالی خاکوں کی مدد سے تصاویر بنائی گئی ہیں ۔ ان تفاصیل کے اندراج کا مقصد اس صورتحال کو اجاگر کرنا ہے کہ مولانا باقر شمس کی توجہ اپنی کتاب (بلکہ کتابوں کی تدوین وتزئین اور اس کے تدوینی اہتمام) پر کبھی نہ گئی بلکہ یہ کام اس انداز میں ہوا ، جیسے کوئی بے نیازی سے الٹا سیدھا سلا ہوا ملبوس پہن لے اور دیکھنے والے کو کوفت ہو یا کوئی اعلا درجہ کا باورچی اعلا درجہ کا کھانا پکا کر نفیس اور عمدہ کراکری کی بجائے ، کھانا مٹی کے ڈھویریوں میں رکھ کر پیش کر دے اور نازک طبع مہمانوں کی دیکھتے ہی بھوک ختم ہو جائے ۔ ان کے علم میں کوئی کمی نہیں ، طرزِ نگارش بھی دلآویز ہے ، مگر کوئی ان کتابوں کو دیکھ کر مائل مطالعہ ہو تب ہی تو اس پر مولانا کے تخلیق کردہ ادب کا ذائقہ اپنی تعریف کرائے گا ۔

مولانا باقر شمس محض شوق شوق میں مصنف نہیں بنے ہیں ۔ انھوں نے برسوں تصنیف و تالیف کا ریاض کیا ہے ۔ آجکل تو نہیں ، لیکن ماضی بعید میں وہی لوگ کوچۂ مضمون نگاری اور صحافت میں آتے تھے ، جو پہلے باضابطہ تحصیل علم کرتے تھے ۔ مولانا نے بھی اپنی خاندانی روایت کے مطابق پہلے گھر میں عربی ، فارسی اور دینیات کی تعلیم حاصل کی ، پھر لکھنؤ یونیورسٹی میں السنۂ شرقیہ کے مروجہ درجوں کی تکمیل کر کے دبیر کامل کی اعلا سند حاصل کی ، ساتھ ہی علم طب بھی حاصل کیا ..... پھر پیشۂ تدریس میں آئے ، ہیڈ مولوی بنے ، غیر منقسم ہند کے متعدد مدارس میں پڑھایا اور نصاب کی کتابیں لکھیں ، جو لکھنؤ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کی

گئیں - اس زمانہ میں وہ کسی حد تک سیاست سے بھی دلچسپی رکھتے تھے - اس کا ثبوت قائداعظم محمد علی جناح ، سرتیج بہادر سپرو ، سروجنی نائڈو اور ایسے ہی رہنماؤں سے ان کی خط و کتابت اور ملاقاتیں ہیں ، مگر شاید ان کی صاف گوئی ، مصلحت ناشناسی اس میدان محتاط گوئی و چالاک روی کے لیے موزوں نہ تھی -

پاکستان آنے کے بعد وہ کراچی کے مختلف اسکولوں میں استاد رہے اور مدتِ ملازمت کی تکمیل کے بعد ریٹائر ہو گئے - جب سے اب تک وہ مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں ، اگرچہ پچھلے چند برسوں سے بینائی ختم ہو جانے کی بنا پر اس کام میں ٹھہراؤ آگیا ہے اور انھیں املا کرانا پڑتا ہے -

مولانا باقر شمس رضویہ کالونی کے کثیر المنزلہ مکان میں قیام پذیر ہیں - ان کی خبر گیری و نگہداشت ان کے چھوٹے صاحبزادہ کی ذمہ داری ہے ، جو طویل عرصہ سے علیل اور معذور ہیں - مولانا کے پوتے پوتیاں اور بہو ان کی خدمت پر مامور ہیں ان کی بینائی موتیا میں بند ہو گئی ہے ، مگر حافظہ ابھی تک خوب کام کرتا ہے - آواز بھی ماشا اللہ پائدار ہے ، مگر اونچا سنتے ہیں - کبر سنی ان کے وجود ہی سے ظاہر ہوتی ہے ان کے کمرے کی صورتحال بھی حسب حال ہے ، شاید اس لیے کہ وہ اپنی کتابوں ، الماری ، ٹیلیفون ، میز ، بستر اور اس کے ماحول میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طویل عرصہ سے جو چیز جہاں رکھی ہے ، اسے ہلایا جلایا نہیں گیا ہے اور جوں کی توں پڑی ہے - کمرے کی دیواریں ان کے آبا و اجداد کی تصاویر سے مزین ہیں اور فرش پر جگہ جگہ پڑے ہوئے سگریٹ اور کاغذ کے ٹکڑے ان سے ملنے کے لیے آنے والوں کی آمد و رفت کا پتا دیتے ہیں کہ عرصہ سے صفائی نہیں ہوئی - اگرچہ ضلع وسطی میں بجلی اور پانی کی آنکھ مچولی ایک معمول ہے ، اس لیے ممکن ہے اہل خانہ مولانا کو کسی چیز کے استعمال کرنے میں زحمت سے بچانے کے لیے اس ڈھنگ میں دانستہ رد و بدل کرتے ہوں - مولانا ہر حال میں خوش رہنے والے بزرگ ہیں - وہ کسی بات کا شکوہ نہیں کرتے ، کیونکہ انھوں نے اپنی ضروریات

زندگی کو کبھی حد سے تجاوز نہیں ہونے دیا۔ ان کی اولاد انھیں جو کچھ دیتی ہے، وہ اس سے اپنی کتابیں چھپواتے ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلا!

"تاریخ لکھنؤ" کے تعارف میں مصنف مولانا باقر شمس کے بارے میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی لکھتے ہیں :

"مولانا سید محمد باقر شمس صاحب کی ہستی سے اور ادبی طور پر مستفیض ہونے والوں میں، میں اپنا شمار کر کے فخر کرتا ہوں۔ موصوف نے جو اضافے تاریخ، علم دینیات اور ادب میں کیے ہیں، وہ سب کے لیے فیض رساں ہیں۔ سرسید احمد خاں اور ان کے پیرووں نے اس (لکھنؤ کی) تہذیب کو تخریب کا نام دیا اور اس لیے اس کی طرف سے ایک تعصب قائم ہو گیا، جس کی بنا پر اس کی خوبیوں کی طرف عام لوگوں اور مورخوں نے دیکھنے سے انکار کیا۔ شمس صاحب اس تہذیب کی زندہ تاریخ ہیں۔ یہ ان کے خاندان اور ماحول کی چیز ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر ہماری آنکھوں کے سامنے تعصب کی عینک اتر جاتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ سرزمین اودھ نے ایسے خوبصورت پھول لگائے تھے، جن کی دنیا کی ہر تہذیب خوشہ چین ہو سکتی ہے۔ مولوی عبدالحلیم شرر نے بھی اس موضوع پر کافی لکھا ہے اور ان کے حوالے شمس صاحب نے دیے ہیں، مگر شمس صاحب کی کتاب شرر صاحب کی تمام تصانیف سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور اسی لیے ہم اسے لکھنوی تہذیب کا آخری نقطہ کہہ سکتے ہیں۔"

مولانا باقر شمس کے علم و فضل اور وسیع مطالعہ کا ثبوت علامہ نیاز فتحپوری کی تحریر سے بھی ملتا ہے۔ یہ تحریر "نگار" پاکستان کے نومبر ۱۹۹۳ء کے شمارہ میں موجود ہے، جس کا پس منظر یہ ہے کہ مولانا علامہ نیاز فتحپوری سے ملنے گئے اور افتخار حسین

(سیکریٹری سنٹرل پبلک کمیشن) کے اس استفسار کا جواب لکھ رہے تھے کہ کتاب "برق لامع" کس کی تصنیف ہے۔ وہ نامکمل تفصیلات ضبط تحریر کر پائے تھے کہ اس وقت مولانا محمد باقر شمس پہنچ گئے۔ علامہ نیاز فتحپوری نے یہی سوال مولانا سے کیا، جنھوں نے اس کی تفصیل بتا دی۔ علامہ نیاز فتحپوری نے ان تفصیلات کو مولانا محمد باقر شمس کے حوالہ سے قلمبند کرتے ہوئے لکھا:

"میرے محترم دوست مولانا محمد باقر شمس تشریف لائے اور انھوں نے اس میں یہ معلومات بہم پہنچائیں۔"

علامہ نیاز فتحپوری نے مولانا کا ذکر جس عزت و احترام سے کیا ہے، اس سے ڈاکٹر نعیم تقوی کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ بڑے بڑوں نے ان کا لوہا مانا ہے۔

(پروفیسر صاحب نے مولانا کی شخصیت و فن کو نمایاں کرنے کے لیے جو کچھ لکھا ہے، وہ لاجواب ہے، لیکن کتاب میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے اس تحریر کا کچھ حصہ حذف کرنا پڑا، جس کے لیے ہم طالب معذرت ہیں۔)

جناب ساحر لکھنوی



محقق یگانہ

خاندان اجتہاد برصغیر کا وہ مشہور و معروف علمی خانوادہ ہے، جس نے اتنی بڑی تعداد میں جید علما اور اعلا پایہ کے ادبا و شعرا پیدا کیے جتنے شاید برصغیر کے تمام علمی اور ادبی خانوادوں نے مل کے بھی پیدا نہیں کیے ہوں گے۔ ان میں علما ایسے کہ علمائے عراق و ایران ان کو احترام کی نظر سے دیکھتے اور ادبا و شعرا ایسے جو شعر و ادب کا اعتبار بنے۔ مرثیہ گوئی میں لکھنؤ کے جن چار خاندانوں کی اہمیت تسلیم کی گئی، ان میں خاندان انیس، خاندان دبیر اور خاندان تعشق کے ساتھ خاندان اجتہاد بھی شامل ہے۔ اگر صرف خاندان اجتہاد کی خدمات اور علمی و ادبی کارناموں کا تذکرہ لکھا جائے تو ایک ضخیم کتاب وجود میں آجائے گی۔

خاندان اجتہاد کی ان علمی اور ادبی خدمات کا سلسلہ بارھویں صدی ہجری کے آخر سے اب تک جاری ہے۔ انقلاباتِ وقت اور امتدادِ زمانہ سے اس خاندان کے بہت سے مقتدر حضرات وقتاً فوقتاً لکھنؤ سے ہجرت کر کے برصغیر کے مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے۔ چند حضرات نے عراق و ایران میں بھی سکونت اختیار کی، خاص طور پر پاکستان بننے کے بعد ہجرت کا یہ عمل ایک عمومی سیلاب کی صورت میں سامنے آیا، جس میں اس خاندان کے بھی بہت سے بزرگ اور نوجوان شامل تھے۔ انھوں نے پاکستان آکر یہاں بھی علمی اور ادبی خدمات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صاحبانِ کمال ہونے کے باوجود ان حضرات کا یہاں کی علمی اور ادبی دنیا میں کوئی خاص چرچا نہیں ہوا اور نہ عوام کی اکثریت ان سے واقف ہے۔ اس کی وجہ

بہت واضح ہے اور وہ یہ کہ یہ حضرات عام روش کے خلاف کسی قسم کے نام و نمود کے خواہشمند نہ تھے ۔ نہ انھوں نے اپنے نام کے جھنڈے اپنے ہاتھوں سے بلند کرنے کی رسم کو پسند کیا، نہ اپنے گلے میں ڈھول لٹکا کر اپنے نام کا ڈنکا پیٹنے کی کوشش کی ۔ وہ گوشہ نشین رہ کر خاموشی سے ٹھوس کام کرنے کو ترجیح دیتے رہے ۔ بد قسمتی سے آجکل جو نمودِ ذات (self - projection) کے لیے باقاعدہ lobbying (اپنے ہواخواہوں کے ذریعہ لوگوں پر اثرانداز ہونا) ، گروہ بندیاں ، تحسین باہمی کی امدادی انجمنیں اور اپنے آپ کو خود "استاد" تسلیم کرنے اور تسلیم کروانے کے دوسرے طریقے اختیار کرنے کی روایت میں شدت آگئی ہے ، اس کو وہ حضرات اخلاقی اور تہذیبی اقدار کے خلاف سمجھتے تھے اور خاکساری اور انکساری کو اپنا طرۂ امتیاز جانتے تھے ۔ نہ ان کی کوئی lobby تھی ، نہ انھوں نے کوئی گروہ بنائے تھے ، نہ ذاتی پروپیگنڈا ان کے مزاج سے لگا کھاتا تھا اور نہ بیجا ذاتی افتخار سے ان کو کوئی کام تھا ... خصوصاً وہ حضرات جو عالم دین ہوئے ، عام ادبی محفلوں ، مشاعروں وغیرہ میں شرکت کو اپنے وقار کے منافی سمجھتے تھے ، حالانکہ وہ اگر ایسی محفلوں میں شریک ہوتے تو نہ جانے کتنے ہی بزعم خود (جید) اور استاد قسم کے ادیبوں اور شاعروں کے چراغ گل ہو جاتے ۔

ایسی ہی مقتدر ہستیوں میں محقق یگانہ جناب مولانا سید محمد باقر شمس کی ذاتِ گرامی بھی شامل ہے ۔ وہ ایک بہت بڑے عالم دین کے فرزند ہیں اور خود علم دین کے ایک معتبر عالم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان کے والدِ گرامی اعلم العلما جناب سید سبطِ حسین وہ عالم تھے ، جنھوں نے دس ، پندرہ سال تک عراق کے دینی مرکز میں درس خارج دیا اور سرزمین دجلہ و فرات پر اپنے علم کے دریا بہاتے رہے ۔ برصغیر میں ان کو ایک اعلم کا درجہ دیا جاتا تھا اور بعض علمائے عراق و ایران بھی ان کی اس حیثیت کے معترف تھے ۔

مولانا محمد باقر شمس صاحب خود نہ صرف ایک عالم دین ہیں ، بلکہ نہایت

بلند پایہ ادیب اور نہایت خوش فکر شاعر بھی ہیں ۔ وہ ان اہل قلم میں سے ہیں ، جن کے قلم سے علم و ادب کے ایسے غنچے پھوٹے ہیں ، جنھوں نے ایک بہارستان سجا دیا ہے ۔ وہ کئی نہایت اہم کتابوں کے مصنف ہیں ، جن کے مختلف النوع موضوعات میں تحقیق ، تاریخ ، تہذیب ، تنقید ، زبان و لسانیات ، شعر و ادب وغیرہ ، سبھی کچھ شامل ہیں ۔ وہ عمر کے مختلف ادوار میں بڑے بڑے علمائے ادب کے ہم جلیس وہم بزم رہے ہیں ۔ بعض جہتوں سے وہ ان میں امتیاز خاص بھی رکھتے ہیں ۔ ان حضرات میں " امراؤ جان ادا " کے شہرۂ آفاق مصنف مرزا محمد ہادی رسوا ، اردو کے ممتاز ترین قصیدہ نگار اور جوش ملیح آبادی کے استاد مرزا محمد ہادی عزیز ، خود حضرتِ جوش ملیح آبادی ، ممتاز علمی شخصیت اور مرثیہ پر اپنے وقت کی سب سے بڑی سند ، یعنی پروفیسر مسعود الحسن ادیب ، بلند پایہ ادیب و صحافی شیخ ممتاز حسین ، " فرہنگِ اثر " کے مصنف ، ممتاز شاعر اور مستند اہلِ زبان مرزا جعفر علی خاں اثر ، اپنے وقت کے نہایت خوش فکر شاعر اور بلند پایہ قصیدہ نگار مرزا کاظم حسین محشر ، موقر شاعر و عظیم نظم نگار ، لسان العصر صفی لکھنوی ، نہایت وقیع تنقید نگار اور دانشور ڈاکٹر احسن فاروقی ، اردو کو ایک نئے رنگِ نگارش سے آشنا کرنے والے اور اس میں ایک نئی روح پھونک دینے والے نہایت مقتدر ادیب و نقاد نیاز فتحپوری اور ان کے علاوہ بھی متعدد قد آور علمی و ادبی شخصیات شامل ہیں ۔ ان حضرات کی صحبت میں جناب محمد باقر شمس صاحب نے علم و ادب کی بہت سی کلیاں چنیں اور بہت سے پھول لٹائے بھی ۔

جناب محمد باقر شمس صاحب مدظلہ کی شخصیت بہت پہلودار ہے ۔ ان کے فضل و کمال کا اظہار کئی جہتوں سے ہوتا ہے ۔ ان کے اشہبِ قلم کی جولانیاں کسی ایک میدان تک محدود نہیں ہیں ۔ ان کے طائرِ فکر کی اڑان کے لیے فضا بہت وسیع و بسیط ہے ۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے وہ عالمِ دین بھی ہیں ، ادیب بھی ، شاعر بھی ، نقاد بھی ، مورخ بھی ، محقق بھی ، ان کے علاوہ بھی ان کی شخصیت کے اور پہلو ہیں ۔ اگر ان سب پر گفتگو کی جائے تو نہ صرف ۔ کہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا ، بلکہ

لکھنے والے کا بھرم بھی کھل جائے گا۔ ظاہر ہے کہ کسی کے علمی و ادبی قد کو ناپنے والا اگر خود اتنی قامت نہیں رکھتا کہ اونچی ایڑیاں کر کے اور پنجوں کے بل کھڑے ہو کر بھی اس بلندی تک نہ پہنچ سکے تو اس کا بھرم تو کھلنا ہی ہے۔ اس لیے میں نہایت مختصر طور پر مولانائے موصوف کی علمی و ادبی شخصیت کے محض چند پہلوؤں پر طالبعلمانہ نظر ڈالوں گا اور اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کروں گا۔

جناب شمس صاحب قبلہ کو جس سب سے اہم شخصیت سے فیض اٹھانے کا موقع ملا، وہ برصغیر میں اس دور کے سب سے بڑے مجتہد اور عظیم عالم دین سید العلما جناب مولانا سید علی نقوی النقوی عرف مولوی نقن صاحب کی ذاتِ گرامی تھی۔ سید العلما سے جناب شمس صاحب کی محض خاندانی قرابت ہی نہیں تھی، بلکہ بچپن ہی سے دوستی کا بہت مضبوط رشتہ قائم تھا، اسی لیے جب تک دونوں لکھنؤ میں رہے، ان کا ہمہ وقت کا ساتھ تھا۔ سید العلما ان لوگوں میں سے نہیں تھے، جو ذاتی قرابت یا دوستی کی بنا پر بغیر استحقاق کے کسی کے علمی مرتبہ کی تعریف کرتے۔ وہ علم کے مرتبہ کو پہچاننے والے اور جوہر شناس نظر رکھنے والے تھے۔ دوستی یا قرابت کے پاس و لحاظ سے کسی معمولی استعداد کے شخص کو عالم کہہ دینا یا عام معیار کے ادیب کو بلند مرتبہ عطا کر دینا، ان کی شان کے خلاف تھا۔ ان کے پایہ کے عالم سے یہ توقع رکھنا سوءِ ظن ہے۔ اس پس منظر میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ جناب سید العلما نے شمس صاحب کو "محقق یگانہ" کا لقب دیا تو اس کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔ جناب شمس صاحب نے تاریخ تہذیب اور زبان پر اتنا تحقیقی کام کیا، جس سے متاثر ہو کر جناب سید العلما طاب ثراہ نے ان کو "محقق یگانہ" کے لقب سے نوازا۔ "نگارشاتِ رنگ رنگ" کے پیش لفظ میں حسین انجم صاحب نے سید العلما کی اس تحریر کا عکس شائع کیا ہے، جس میں انھوں نے شمس صاحب کو "محقق یگانہ" سید محمد باقر شمس لکھا ہے اس سے تحقیق کے میدان میں ان کے مرتبہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان کے تحقیقی کام کے سلسلہ میں ان کی تصنیف "تاریخ لکھنؤ" کا مطالعہ دلچسپ اور اہم ہو گا۔

مولانائے موصوف بحیثیتِ ماہر زبان اپنا جواب نہیں رکھتے اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ زبان کی صحت ، محاوروں کا صحیح استعمال ، تذکیر و تانیث کا مسئلہ ، لفظوں کا صحیح تلفظ ، متروکاتِ زبان ، لفظوں کے معانی و مفاہیم میں نازک سے فرق ، ان کے مزاج اور محل استعمال کے اعتبار سے لفظوں کا فصیح و غیر فصیح ہونا اور اسی طرح صنائع و بدائع کا مکمل علم ، یہ سب اور زبان سے متعلق جو بھی رموز و نکات ہیں ، ان پر مولانا کی بڑی گہری نظر ہے ۔ ان کو زبان کی کسوٹی کہا جائے تو غلط نہ ہو گا ۔ انھوں نے "لکھنؤ کی زبان" کے موضوع پر اسی نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے ، جو ایک نہایت اہم تصنیف ہے ۔

خود احتسابی ایسی اعلا انسانی صفت ہے ، جو انسان کو اس کی سیرت و کردار کے نکھارنے اور سنوارنے میں ہر قسم کی تعلیم و تربیت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے ۔ جناب شمس میں خود احتسابی کا جذبہ شدت سے کارفرما ہے ۔ شاعری کے میدان میں خصوصاً ایک سے ایک بے شعور شاعری کے گلے پر چھری چلاتے ہوئے بزعم خود اپنے آپ کو صرف استاد ہی نہیں سمجھتا ، بلکہ خود کو میر و غالب کے ہم پلہ سمجھتا ہے ۔ ایک غزل کا ایک شعر سننے میں آیا ۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے :

کہہ دو میر و غالب سے ، ہم بھی شعر کہتے ہیں
وہ صدی تمھاری تھی ، یہ صدی ہماری ہے

غزل اچھی تھی ۔ ایک آدھ شعر تو رنگِ جدید میں واقعی بہت اچھا تھا ۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس شعر میں "سخن گسترانہ" بات آپڑی ہے ۔ "ہم سخن فہم ہیں ، غالب کے طرفدار نہیں" ۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس طرح کبھی کبھی ایک نوزائیدہ سیاستداں اس میدان میں قدم رکھتے ہی اپنے آپ کو ایک بڑا قومی لیڈر اور منبر کے زینے پر پہلا قدم رکھتے ہی کوئی مقرر "علامہ" بن جاتا ہے ، اسی طرح مشقِ سخن کا آغاز کرتے ہی بعض شعرائے کرام خود کو رشک عرفی ، فخر طالب ، اسداللہ خان

غالب سمجھنے لگتے ہیں۔

مولانا محمد باقر شمس شعر گوئی کا نہایت قوی ملکہ اور شعر فہمی کا نہایت اعلا ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں بہت سے زندہ رہنے والے اشعار مل جائیں گے۔ ان کی شاعری فکر و فن (دونوں) کا دلکش مرقع ہے۔ مگر انھوں نے شاعری کو ایک مستقل مشغلہ کے طور پر اختیار نہیں کیا، بلکہ ایک طرح شاعری سے دست کش ہو گئے۔ حسین انجم صاحب نے مولانا کی کتاب "نگارشاتِ رنگ رنگ" کے تعارف میں اس کا سبب انھیں کے لفظوں میں اس طرح لکھا ہے:

"بڑے بڑے اساتذہ کی خدمت میں برسوں حضوری کا شرف حاصل رہا، ان کی قدرتِ بیانی، تازگیِ مضمون، محاسنِ شعریہ اور مصرع لگانے میں فنکاری اور کمال کو سمجھا، اس کے بعد اپنے کلام کا جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ میرے اشعار کی بندش چست اور درست ہے، ادائے مطلب پر قادر ہوں، عروض و قافیہ، معانی و بیان اور زبان و محاورہ کی کوئی غلطی نہیں، مگر پامال مضامین کو فرسودہ طریقہ پر نظم کرتا ہوں ـــ کوئی تازگی نہیں، کوئی انفرادیت نہیں۔ اپنے کو شاعر سمجھنا خود کو دھوکا دینا ہے اور شعر کہنا وقت ضائع کرنا ہے۔ میں نے فوراً شعر کہنا چھوڑ دیا۔"

(کچھ اپنے بارے میں از شعور و شاعری، صفحہ ۱۵۷)

مندرجہ بالا اقتباس درج کرنے کے بعد حسین انجم صاحب نے کیا خوب لکھا ہے:

"اگر اس جذبۂ خود احتسابی اور حقیقت پسندی کی ذرا سی رمق دوسرے حضرات میں بھی پیدا ہو جائے تو دنیائے شعر ان جملہ مزخرفات سے محفوظ ہو جائے گی، جو آئے دن شعر کے نام پر کہے، پڑھے اور چھاپے جاتے ہیں۔" (نگارشاتِ رنگ رنگ ـــ فٹ نوٹ

صفحہ ۶) جدید تنقید نے شعر کے فکری عنصر کو اپنا مرکز نظر بنایا اور فنی عنصر کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ فکری اعتبار سے شاعری نے ترقی کی ہے یا نہیں، اس سے فی الحال بحث نہیں، مگر فنی اعتبار سے شاعری یقیناً تباہ ہو گئی ہے۔ اس بات سے کوئی صاحب نظر اور فن شناس انکار نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ایسے اعلا پایہ کے ادیب و نقاد نے فنی تنقید، جس کو بعض حضرات لفظی تنقید بھی کہتے ہیں، کو نظر انداز کر دینے کے نتائج کی پیشگوئی کرتے ہوئے مولانا محمد باقر شمس صاحب قبلہ کی تصنیف "شعور و شاعری" کے پیش لفظ میں یہ لکھا تھا:

"شعور و شاعری میں فن کے ان اٹل، دائمی اور بنیادی اصولوں کے تحت مختلف قسم کی شاعری کو پرکھا گیا ہے، جن سے اختلاف تو ہو سکتا ہے، بغاوت بھی کی جا سکتی ہے، مگر جنھیں فراموش کر دینے سے شاعری کا اپنی راہ سے ہٹ کر برباد ہو جانا لازمی ہے۔"

ڈاکٹر احسن فاروقی کا مندرجہ بالا پیش لفظ ۱۵ دسمبر، ۱۹۷۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس کو سترہ برس گذر گئے۔ اس عرصہ میں فنی اعتبار سے شاعری کا جو حال ہوا ہے، اس کو بربادی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

آجکل بڑے بڑے، سکہ بند اور ملک گیر شہرت رکھنے والے شاعر "ہمارا" اور "تمھارا" کے ساتھ "نعرہ" اور "فائدہ" کے ساتھ "قاعدہ" کو قافیہ بناتے ہیں اور دھڑلے سے پڑھتے ہیں۔ زبان کا تو ذکر ہی کیا، یہ غریب تو اب ہر ایک کے گھر کی لونڈی بن گئی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ زبان سے اف نہیں کر سکتے، ورنہ قدامت پرستی دقیانوسیت اور لکیر کے فقیر ہونے کے طعنوں سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دے گی۔

ہر طرح کی فنی بے راہروی کو فن کی معراج سمجھ لیا گیا ہے ۔ بعض بزعم خود "مجتہدین سخن" یہ کہہ کے زبان بند کر دیتے ہیں کہ انھوں نے یوں کہا ہے اور اس میں کیا شک کہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا کہ "اس"، "ہم" اور "میں" کے پس پردہ "ادعائے اجتہاد ہے .... گویا میدان تقریر کی "علائیت" بزم سخن میں بھی داخل ہو گئی ہے ۔

انھیں حقائق کو دیکھتے ہوئے چند برس پیشتر پی ۔ ٹی ۔ وی ۔ کے ایک مذاکرہ میں اردو کے معروف اور نہایت محترم ادیب و نقاد پروفیسر مجتبیٰ حسین مرحوم (سابق صدر شعبۂ اردو ، بلوچستان یونیورسٹی) نے بھی اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ فنی اور لفظی تنقید پر دوبارہ توجہ دینا چاہیے ۔

جناب مولانا محمد باقر شمس صاحب مدظلہ کی گرانقدر تصنیف "شعور و شاعری" تنقید کی اسی شاخ پر کھلا ہوا ایسا پھول ہے ، جس کی خوشبو ہر اس شاعر ، نقاد اور اہل نظر کے مشام جاں کو معطر کرتی رہے گی ، جو خود پسندی کے زکام میں مبتلا نہ ہو ۔ اس کتاب کا مطالعہ کیجیے ۔ اس کے ایک ایک جملہ سے ان کے شعور و شاعری ، ژرف نگاہی ، نکتہ رسی ، وسعت نظر اور فن پر مضبوط گرفت کا اندازہ ہو جائے گا ۔

شعر پر اصلاح دینے والے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو فن کا ٹھوس علم ہو ، شعر فہمی کا اعلا مذاق اور فکر کا بھرپور شعور رکھتا ہو ۔ ان خوبیوں کے بغیر شعر پر اصلاح دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اگر فن کا علم نہ ہو تو عروض و قافیہ ، بندش اور نشست الفاظ اور اسی طرح دوسری خامیوں کو سمجھ ہی نہیں سکتا ۔ شعر فہمی کا اعلا مذاق نہ ہو یا فکر کا بھرپور شعور نہ ہو تو شعر کو سمجھنا اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کو پرکھنا ممکن ہی نہیں ۔ پھر اگر لفظی اور معنوی خامیوں کو سمجھ بھی لے اور خود اعلا پایہ کا شاعر نہ ہو تو ان خامیوں کو دور کر کے اس طرح اصلاح دینا کہ شعر اصل سے بلند ہو جائے ، یہ ہو ہی نہیں سکتا ۔ وہ اصلاح کیا ، جس کے بعد شعر لفظی اور معنوی طور پر اصل سے بہتر نہ ہو جائے ۔

"شعور و شاعری" میں شعر و شاعری کے متعلق صرف فنی بحثیں ہی نہیں ہیں ،

بلکہ مولانا نے مشہور شعرا کے کلام پر اصلاحیں بھی دی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ کسی بڑے نام سے مرعوب ہوئے بغیر جس طرح انھوں نے انیس، غالب اور فیض ایسے شعرا کے کلام کا جائزہ لیا ہے اور ان پر اصلاحات دی ہیں، وہ کسی معمولی صلاحیتوں کے شاعر، نقاد اور استاد کے بس کی بات نہیں۔ اصلاح دینا تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ جس کا جی چاہے، جس کے کلام پر چاہے، اصلاح دے۔ (یہاں "اصلاح" سے میری مراد لفظی ردو بدل ہے)۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ اصلاح کے بعد شعر کا حشر کیا ہوا۔ کیا شعر اصلاح کے بعد بلند یا بلند تر ہو گیا یا اصلاح دینے والے نے اس کی مٹی پلید کر دی۔

جناب شمس صاحب قبلہ پہلے ہر شعر کے اسقام پر بحث کرتے ہیں، پھر اس کو اصلاح دے کر فنی اور معنوی (دونوں) اعتبار سے اتنا بلند کر دیتے ہیں کہ اگر شاعر خود دیکھے تو اپنے عجز کا اعتراف کیے بغیر اور ان کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثال کے طور پر میراجی کی نظم "جوئبار" کو لیجیے۔ اس کے ہر ہر مصرع پر ان کی بحث، اس کا تجزیہ اور پھر اس پر اصلاح، دیکھنے کی چیز ہے۔ اسی طرح ماہر القادری کی نظم، غالب کے شعر پر نیاز فتحپوری کی دی ہوئی اصلاح پر اصلاح اور جگر کے اشعار کا تجزیہ اور ان پر اصلاح ... غرض یہ کہ "شعور و شاعری" کا جو مضمون بھی آپ ملاحظہ فرمائیں گے، اس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ شعر کیسے کہا جاتا ہے، کیسے اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور کیسے اس کو اصلاح دے کر بلند کر دیا جاتا ہے۔ اس فن میں مولانائے موصوف کی مہارت حیرت انگیز ہے۔

میں اسے اپنی بدنصیبی کہوں یا اپنی زندگی کا المیہ کہ مولانا محمد باقر شمس صاحب کی اس صفت، یعنی اصلاح شعر میں ان کی مہارت، کا علم مجھ کو اب ہوا، جب وقت تقریباً گذر چکا ہے۔ کاش میں نے پاکستان آنے کے بعد ہی ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہوتا اور ان کے فیوض شعری سے فیضیاب ہوتا تو شاعری میں آج میں جس مقام پر ہوں، اس سے یقیناً کہیں بلند مقام پر کھڑا ہوتا!



جناب اختیار حسین دل شمس آبادی (ایڈوکیٹ)

حضرتِ شمس کی اصلاحیں

مولانا محمد باقر شمس کی ذات اپنے صفات کے ساتھ مجموعۂ کمالات ہے۔ ان کی عمر پچاسی سال کی ہے، مگر دماغ حاضر، حافظہ قوی اور فکر جوان ہے۔ وہ مختلف زبانوں کے ماہر اور علم دین کے خاندانی وارث اور علم تاریخ کے بحرِ زخار ہیں۔ بصارت کے ضعف کی وجہ سے لکھنے پڑھنے سے معذور ہیں، مگر بڑے بڑے مضامین املا کروا دیتے ہیں۔

ادب میں علم لسانیات کے نئے قاعدوں کے واضع اور پرانے قاعدوں کے ناسخ ہیں۔ نقدِ سخن میں اپنا مثل نہیں رکھتے۔ شعر سنتے ہی اس کے عیب پر نظر جاتی ہے اور لفظی تبدیلی سے اس کو صحیح و بلند کر دیتے ہیں۔

قدیم اساتذہ اور اپنے عہد تک کا کوئی شاعر ان کا ہدف بننے سے محفوظ نہیں رہا۔ ان کا نقد و تبصرہ اہل فن پر سخن فہمی کا دروازہ کھول دیتا ہے اور ادبِ اردو کا گرانقدر سرمایہ ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

میر کے شعر پر نقد و اصلاح ملاحظہ فرمائیے:

سرہانے میر کے ذرا آہستہ بولو
ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

یہ ایک مشفق ماں کی زبان ہے جو اپنے ننھے منے بچے کے لیے کہہ رہی ہے۔ اس کو سن کے سودا نے کہا تھا کہ ان کی ماں نے کہا ہوگا۔ اس شعر کو یوں درست کیا

ہے:

سرہانے میر کے آہستہ بولو
شب فرقت کا جاگا سو گیا ہے

یا

لحد پر میر کی آہستہ چلیے
شب فرقت کا جاگا سو گیا ہے

سودا کا مشہور شعر ہے:

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے، سودا!
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اس پر اعتراض یہ کیا ہے کہ "کیفیت چشم یاد ہے" کے معنی ہیں کہ جب سے دیکھی ہے، اس وقت سے اب تک یاد ہے تو اب کیا خاص بات پیدا ہو گئی، جو غش آنے لگا۔ شعر یوں ہونا چاہیے

وہ مست نگاہیں مجھے یاد آ گئیں، سودا!
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

"کیفیت چشم" کے مقابلہ میں "مست نگاہوں" میں جو جادو بھرا ہے، اس کی تعریف نہیں ہو سکتی اور "یاد آ گئیں" کا مصرع اس کا محتاج تھا۔ اب شعر معراج کی بلندی تک پہنچ گیا۔

غالب کا شعر ہے:

تماشا کر، اے محو آئینہ داری!
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

"تماشا" فارسی میں کھیل اور دیکھنے کے معنوں میں مستعمل ہے۔ اردو میں شعرا نے بھی انھی دونوں معنوں میں استعمال کیا ہے، مگر نثر اور بول چال میں صرف کھیل کے معنوں میں مستعمل ہے، اس وجہ سے ان معنوں سے ہمارا ذہن زیادہ

مانوس ہے۔ غالب کے شعر میں "تماشا کر" فارسی کے "تماشا کن" کا بھونڈا، خلافِ محاورہ ترجمہ اور کھیل کے معنوں سے زیادہ قریب ہے۔ مصرع یوں درست ہو سکتا ہے:

ادھر اک نظر، محوِ آئینہ داری!
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

میر انیس کا شعر ہے:

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں میں، ضعفِ پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

ضعف سے کام لینا منشائے بلاغت کے خلاف ہے، دست بلیغ ہے۔ شعر یوں ہونا چاہیے:

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں میں، دستِ پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

داغ کا شعر ہے:

میں کلمہ گو ہوں خاص خدا و رسول کا
آتا ہے بامِ عرش سے مژدہ قبول کا

"کلمہ" عقیدہ ہے، جس کا اردو قبول سے کوئی تعلق نہیں۔ شعر یوں ہونا چاہیے:

مداح ہوں میں خاص خدا و رسول کا
آتا ہے بامِ عرش سے مژدہ قبول کا

مرزا محمد ہادی، معروف بہ رسوا، کا شعر ہے:

لذتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

عشق کو شعرا نے نور کہا ہے، جس سے صفائے باطن اور جلائے قلب پیدا

ہوتی ہے ۔ جس عشق کی لذت معصیت ہے ، وہ قبیح ہے اور غزل کا مضمون نہیں ۔ شعر یوں ہونا چاہیے:

لذتِ عشقِ بتاں کو مت پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

مرزا محمد ہادی عزیز کا شعر ہے:

لذتِ درد رہی بعدِ فنا بھی دل میں
حصۂ عمر میرے عشق کو کافی نہ ہوا

"حصہ" کو "عرصہ" میں بدل کے شعر کو بلند کر دیا، یعنی:

لذتِ درد رہی بعدِ فنا بھی دل میں
عرصۂ عمر میرے عشق کو کافی نہ ہوا

مرزا کاظم حسین محشر کے قصیدہ کا مطلع ہے:

ادھر سے شیخ ، ادھر سے برہمن لینے قدم نکلے
نہ جانے آج بطنِ کعبہ سے کیا لے کے ہم نکلے

اعتراض: "شیخ" کی لفظ بے محل ہے ، اس کو تو قدم لینا ہی چاہیے تھا ۔ برہمن لینے نکلا ، یہ تعجب کی بات ہے ۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی شخص ہونا چاہیے ، جس کو برہمن کی طرح قدم نہ لینا چاہیے ۔ دوسرے مصرع میں "ہم نکلے" مہمل ہے ۔ بنتِ اسد نکلی یا ابو طالب نکلے یا رسولؐ نکلے اگر ہوتا تو ایک بات تھی ۔ "ہم نکلے" مہمل ہے ۔ شعر یوں ہونا چاہیے:

ادھر سے گبر ، ادھر سے برہمن لینے قدم نکلے
حرم سے آج کیا لے کے رسولِ محترمؐ نکلے

علامہ اقبال کا یہ شعر ترتیب و بندش کے لحاظ سے جدیدانہ اور معنی کے لحاظ سے غلط ہے:

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر

تو شاہیں ہے ، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

قصرِ سلطانی کا گنبد تیرے نشیمن کی جگہ نہیں، یعنی مقام عیش و عشرت میں رہنا تجھے مناسب نہیں۔ اس مطلب کے ادا کرنے میں پہلی غلطی یہ ہوئی کہ گنبد پر جھوجھ نہیں لگایا جاسکتا، پھر قصرِ سلطانی کے گنبد پر جھوجھ کتنی بے تکی بات ہے! یہ اس وقت ممکن ہے، جب وہ قصرِ شاہی کبھی رہا ہو۔ اب ویران و شکستہ ہو، گنبد میں دراڑیں پڑ گئی ہوں اور چڑیوں نے جھوجھ لگایا ہو تو وہ مکان عیش نہیں، ویرانہ ہے اور اس کی یہ حالت مفید مطلب اور مقصودِ شاعر نہیں۔ اس کو یوں ہونا چاہیے:

نہیں زیبا ہے تجھ کو شاخِ گل پر آشیاں بندی
تو شاہیں ہے ، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

چٹانوں میں بھی غلط ہے، مگر ردیف کی مجبوری شاید جواز پیدا کردے۔

فانی بدایونی کا شعر ہے:

ستم رسیدۂ آوازۂ بیاباں ہوں
قفس میں کھینچ کے لائی میری زباں ، صیاد!

گرفتارِ قفس بلبل صیاد سے کہہ رہی ہے کہ اس نے اس کی خوش الحانی کی وجہ سے اس کو گرفتار کیا۔ یہ بات اپنے دل یا ہم قفس سے کہنے کی ہے، صیاد تو جانتا ہی ہے۔ یہ عیب ردیف سے پیدا ہوا۔ شعر یوں ہونا چاہیے تھا:

ستم رسیدۂ آوازۂ بیاباں ہوں
قفس میں کھینچ کے لائی مری زباں مجھ کو

مگر اس سے بھی شعر درست نہیں ہوا۔ پہلے مصرع میں خوش الحانی کو "آوازہ" اور دوسرے مصرع میں "زبان" کہا ہے۔ آوازہ اور زبان تمام جانوروں میں مشترک ہے گدھا اور کوا بھی یہی کہہ سکتا ہے۔ یہ کلام کا بڑا نقص ہے کہ کسی مخصوص صفت کمال کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس میں تعمیم پیدا ہو کے اس کی اہمیت ختم ہوجائے۔ یہ صحیح ہے کہ بلبل کے ساتھ "آواز" کا ذکر خوش الحانی کا اور گدھے کے

ساتھ کراہت صوت کا قرینہ ہے۔ مگر اس شعر میں یہ قرینہ بھی نہیں ۔ صرف "آوازۂ بیاباں" سے اگر آپ بلبل سمجھیں تو یہ آپ کا حسن ظن ہوگا کہ شاعر یہی کہنا چاہتا ہے الفاظ سے یہ معنی پیدا نہیں ہوتے ۔ بلبل بیاباں میں نہیں ، باغ میں شاخ گل پر خوشبو سے مست ہو کے چہکتا ہے ۔ بیاباں میں الو بولتا ہے ۔ قرینہ اس مطلب پر دلالت کرتا ہے کہ صیاد سے الو کہہ رہا ہے کہ اس نے اس کے بولنے سے اس کو پہچان لیا اور گرفتار کرلیا اور اس کے لیے "آوازہ" ہی کہنا مناسب تھا ۔ الفاظ اور قرینہ سب اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ "الو" سمجھا جائے ، مگر یہ شاعر کے کہنے کی بات نہیں اس نے یقیناً "بلبل" کہنا چاہا ہے ۔ یہ زبان و بیان کا بڑا نقص ہے کہ کہنا چاہا "بلبل" اور کہہ گیا "الو" ۔ اگر "آوازۂ بیاباں" کی جگہ "آوازۂ گلستاں" ہوتا تو یہ نقص پیدا نہ ہوتا ، مگر شاعر جو کہنا چاہتا ہے ، وہ اس سے بھی ادا نہیں ہوتا ۔ بلبل کا اپنی نواسنجی کو "آوازہ" کہنا منشائے بلاغت کے خلاف ہے ۔ اس کو یوں کہنا چاہیے:

ستم رسیدۂ اعجاز نغمہ سنجی ہوں
قفس میں کھینچ کے لائی مری زباں ، صیاد !

مگر اس میں بھی "صیاد" اور "زبان" کی لفظ باقی رہتی ہے ۔ اگر ردیف و قافیہ کا لحاظ نہ کیا جائے تو اس مفہوم کو یوں ادا ہونا چاہیے:

ستم رسیدۂ اعجاز نغمہ سنجی ہوں
قفس میں کھینچ کے لایا مرا کمال مجھے

اصغر گونڈوی کا شعر ہے:

اس سے زیادہ اور کیا شوخی نقش پا کہوں
بجلی سی اک چمک گئی میرے سر نیاز میں

اس شعر میں مولانا کا یہ لطیف اعتراض اور اس کی اصلاح ملاحظہ فرمایئے:

"بجلی آنکھ میں چمکتی ہے سر میں نہیں ۔"

اگر شاعر کوئی بات خلاف واقعہ یا خلاف عقل کہتا ہے تو اس کا ثبوت پیش

کرتا ہے۔ سر میں بجلی چمکنا خلافِ واقعہ بھی ہے اور خلافِ عقل بھی ہے۔ چمک کا تعلق آنکھ سے ہے۔ سر میں بجلی چمکنا غلط ہے۔ شعر یوں درست ہو سکتا ہے:

اس سے زیادہ اور کیا شوخی کفش یا کہوں
بجلی سی اک چمک گئی میرے سرِ نیاز میں

جگر کا شعر ہے:

ہجوم تجلی سے معمور ہو کر
نظر رہ گئی شعلۂ طور ہو کر

پہلے مصرع میں "ہجوم تجلی" غلط ہے۔ ہجوم کے لیے جمع کا ہونا ضروری ہے۔ افکار کا ہجوم، مسرتوں کا ہجوم کہتے ہیں۔ واحد کے لیے ہجوم نہیں کہتے۔ گھر میں روشنی کا ہجوم، دریا میں پانی کا ہجوم غلط ہے۔ اس کے لیے شدت و وفور کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں بھی اگر "ہجوم" کی جگہ "وفور" ہوتا تو صحیح ہوتا۔ دوسرے مصرع میں نظر کے شعلہ بن جانے کا کوئی مفہوم نہیں۔ کسی چیز کا شعلہ بن جانا کنایہ ہے، اس کے جل جانے سے جس کی دلالت ہے۔ فنا ہو جانا۔ نگاہ کے شعلہ بن جانے کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ نگاہ جل گئی اور بصارت زائل ہو گئی۔ ہاں! شاعری میں دل اس سے مستثنیٰ ہے۔ وہ جل کے زندۂ جاوید ہو جاتا ہے۔ اگر اس کو شعلۂ طور کہا جائے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ صفائے باطن بڑھ گئی۔ بصرت زیادہ ہو گئی اور کمال معرفت حاصل ہو گیا۔ جگر صاحب نظر کے شعلۂ طور بن جانے سے کیا کہنا چاہتے ہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کچھ کہنا بھی نہیں چاہتے تھے مجموعہ کی مناسبت سے ایک شعر لکھنے کو جی چاہا، وہ کہہ دیا۔ مجموعہ کا نام "شعلۂ طور" شعر میں آگیا، کام پورا ہو گیا۔

یہ اصلاحیں شمس صاحب کی کتاب "شعور و شاعری" اور دوسرے مضامین سے نقل کی گئی ہیں، جن سے تصرفِ الفاظ کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ شاعری کی گتھیاں سلجھتی ہیں، سخن فہمی کے گر معلوم ہوتے ہیں، اہل ذوق کے لیے شعر کے معائب و محاسن معلوم ہوتے ہیں اور سخن فہمی کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ بلاشبہ یہ اہل ذوق کے لیے خضرِ راہ اور مشعلِ راہ ہیں۔

جناب اظہار حیدر ایڈوکیٹ

ہمہ جہت شخصیت

امید ہے کہ آپ کی صحت بھی اپنی اسی حالت پر، جس کو انگریزی میں states quo کہتے ہیں، ہوگی ۔یہی بہت غنیمت ہے، ورنہ آجکل ہم سب ایک ہی کشتی پر سوار ہیں ۔ کیا پتا کس وقت کس کی سہ حرفی اطلاع اخبار میں شائع ہو جائے ۔ میری صحت کی بھی کیفیت کچھ ایسی ہی ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر ۔ یوں سمجھیے کہ نہ جانے کتنی بار قضا کا دامن ہاتھ میں آتے آتے چھوٹ گیا ۔ بہرحال زندگی کے کام تو آخر دم تک چلتے ہی رہتے ہیں ۔

اس وقت رات کے تین بجے کا عمل ہے ۔ آنکھ کھل گئی ۔ آپ کی ادبی شخصیت کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کرنا بھی ایک فرض سمجھتا ہوں، جس کو اپنے تمام محدودات کے باوجود پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں ۔ بہرحال خواہ ناکام ہی کوشش کیوں نہ ہو، اپنے ضمیر کے بوجھ کو ہلکا کر رہا ہوں ۔ آپ میرے مزاج سے بخوبی واقف ہیں کہ میں اپنے ضمیر کی عدالت میں صفائی کے گواہ پیش کرنے کا قائل نہیں ہوں ۔ یقین جانیے اگر یہ چند سطریں، جو آپ کے ایسے عظیم المرتبت عالم اور ادیب کے لیے ناکافی ہیں، نہ تحریر کرتا تو ایک ذہنی کرب میں مبتلا رہتا ۔

میں نے آپ کی تصنیف و تالیف کردہ ساری کتابوں کا بغور مطالعہ کیا، اور بالخصوص ادبی کتابوں کے مطالعہ سے آپ کی ناقدانہ صلاحیت کا قائل ہونا پڑا ۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ میرا صحیح معنوں میں آپ سے تعارف پہلے کیوں نہیں ہوا ۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ ایک ملک فتح کرنا یا دریافت کرنا آسان ہے، لیکن کسی ایک

صاحب نظر، لائق اور واقعی پڑھے لکھے شخص کی معرفت حاصل کرنا دشوار ہے ۔ میں اس امر میں شائبہ خوبی تقدیر کا بھی قائل ہوں ، وجہ یہ ہے کہ آپ کی شخصیت کے اثرات ، جن کا ادبی ماحول پر اثر پڑا ، لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں ۔ یوں تو آپ کی شخصیت ہمہ جہت ہے ، ایک اسلامی مورخ کی حیثیت سے بھی آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں ، لیکن چونکہ ان معاملات میں میرا علم واجبی واجبی سا ہے ، لہذا یہ بات تو اہل نظر حضرات کے ذمہ ڈال رہا ہوں اور میں اپنی تحریر کو آپ کے ادبی و تنقیدی مضامین تک محدود کر رہا ہوں ۔

یہ میری بد قسمتی ہے ۔ اس کا کہاں تک رونا رویا جائے ۔ آپ سے تعارف یوں تو تقریباً پچیس ، تیس سال پہلے ہوا تھا ، لیکن تعارف کچھ صحیح انداز اور صحیح شخصیت کے حوالہ سے نہیں ہوا تھا ۔ (غالباً کوئی مجہد نما مجہد ، جن کے متعلق آج بھی میری رائے زیادہ اچھی نہیں ہے اور نہ میں ان کو ادبی شخصیت ہی کے زمرہ میں شامل کرتا ہوں ، نے کھیل خراب کر دیا) ۔ میں عرصۂ دراز تک آپ کی شخصیت سے محض اسی غلط فہمی کی بنا پر بے بہرہ رہا ۔ جو شخص فیض کی کتاب " نقش فریادی " کے پرخچے اڑا سکتا ہے ، اس کی تنقیدی صلاحیت کا لوہا نہ ماننا کسی سمجھدار آدمی کے بس کی بات نہیں ہے ۔ میں یہ مضمون حال میں پڑھ کر آپ کی خدمت میں حاضر بھی ہوا تھا ، لیکن بقول بیخود موہانی (جن کے آپ کسی حد تک مخالف معلوم ہوتے ہیں) :

در میخانہ کھلا ، جب نہ کھلی آنکھ اپنی
اب کھلی آنکھ تو در بند ہے میخانہ کا

معاملہ خراب ہو چکا تھا ۔ آپ کی بینائی نے ساتھ چھوڑ دیا ، ورنہ میری دلی تمنا تھی کہ فیض کے سارے کلام پر اس سے زیادہ اچھے انداز سے آپ تنقیدی مضامین لکھ کر فیض کو ان کے صحیح مقام سے آگاہ کرتے ۔ خط طویل ہوتا جا رہا ہے ۔ سید سبط حسن مرحوم اور ایک دوسرے بڑے نامی گرامی کالم نگار ، زیادہ عرصہ کی بات نہیں ہے ،

لکھنؤ میں فیض کے سیمینار میں مندوب کی حیثیت سے شریک ہوئے ۔ اخباری اطلاع کے بموجب یہ جلسہ لکھنؤ کے رفاہِ عام کلب میں منعقد ہوا تھا ۔ وہاں کے کچھ شاعروں نے شکایت کی ،

" دیکھیے ! ہم لوگ تو اتنے ادب نواز ہیں کہ انھیں کی سرزمین پر فیض کا سیمینار منعقد کرا رہے ہیں ، لیکن آج تک پاکستان کے کسی بھی ادبی حلقہ نے لکھنؤ کیا ، بلکہ اودھ کے کسی بھی صاحبِ کمال ادیب یا شاعر کی یاد میں ایک جلسہ بھی منعقد نہیں کیا ۔ " اس پر کالم نویس صاحب ، جن کا آج بھی ملک کے دانشوروں میں بربنائے عہدہ اور سماجی مرتبہ شمار ہوتا ہے ، کہنے لگے ،

" اگر اہلِ لکھنؤ ایک فیض سا شاعر بھی پیدا کرتے تو میں دس سیمینار منعقد کراتا ۔ " اب اس بوالعجبی کا کیا جواب دیا جائے ۔ فیض کا مجموعہ تو اب کلیات کی شکل میں " نسخہ ہائے وفا " کے نام سے شائع ہوا ہے ۔ اس کا مطالعہ کر لیجیے ، مشکل سے چار فیصدی اشعار ایسے ہوں گے جن میں شعریت پائی جاتی ہے ۔ بہرحال آج میں تو یہ جانتا ہوں کہ محسن بھوپالی ، رضی اختر شوق ، قابل اجمیری ، حد یہ ہے کہ رسا چغتائی کی غزلوں کے اشعار ، فیض کی غزلوں کے اشعار سے ہزار گنا زیادہ اچھے ہیں ۔ ملک کے ممتاز گلوکاروں سے غزلیں گوا کر شہرت حاصل کرنا الگ بات ، سچ مچ شعر کہنا دوسرا معاملہ ہے ۔ میں نے جان بوجھ کر پاکستان کے ان شاعروں کا ذکر کیا ہے ، جو سن و سال ، عمر و عہدہ و سماجی رتبہ کے اعتبار سے فیض سے کمتر خیال کیے جاتے ہیں میں نے جوش ملیح آبادی ، مجاز ، پنڈت آنند نرائن ملا ، فراق ، مجروح سلطانپوری ، علی سردار جعفری ، کیفی اعظمی اور اس قبیلہ کے شعرا کا ذکر جان بوجھ کر اس لیے نہیں کیا ہے کہ ان سب کا نام لینا میرے خیال میں موخرالذکر حضرات کے ساتھ گستاخی کرنے کے مترادف ہے ۔ کاش آپ اب بھی کسی وسیلہ سے تنقیدی مضامین کا سلسلہ جاری رکھیے تو یہ واقعی ادب کی مستحکم خدمت ہوگی ! اس تحریر سے میرا مقصد کسی کی تنقیص یا برائی نہیں ، بلکہ حالات کا جائزہ لینا ہے ۔

تنقیدی مضامین پر مشتمل کتابیں، حالانکہ ان کی طباعت شایان شان طریقہ سے نہیں ہوئی ہے۔ لیکن مضامین کے لحاظ سے کسی اعتبار سے کم نہیں ہیں۔ آپ کا شمار میں جانتا ہوں تنقید نگاروں کے پرانے اسکول سے ہے۔ لیکن پرانا اسکول نئے تنقید نگاروں کے اسکول کا پیشرو ہے۔ میر مستحسن خلیق کی عظمت اس لیے کم نہ ہوگی کہ وہ انیس سے پہلے تھے۔ آپ کی کتابیں "لکھنؤ کی تہذیب"، "تاریخ زبان اردو"، "لکھنؤ کی زبان"، "شعور و شاعری" (جس میں اکیس مضامین شامل ہیں)، "نگارشاتِ رنگ رنگ"، "دیوان جاوید" (بندۂ کاظم جاوید) اور "لکھنؤ کی سیاسی، علمی و ادبی اور تمدنی تاریخ" اردو زبان میں گرانقدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

میں نے جان بوجھ کر آپ کی ان کتابوں پر جن کے موضوعات اسلامی تاریخ سے متعلق ہیں، نہیں کہا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو میری کم نگاہی اور کم علمی ہے۔ دوسری بات اس موضوع پر صرف مذہبی اسکالروں ہی کی رائے محل نظر ہو سکتی ہے۔ جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ میں نے، حقیقت یہ ہے کہ، یہ خط رات کو خرابی صحت کے باوجود قلمبرداشتہ، دلی تاثرات قلمبند کرنے کی خاطر تحریر کیا ہے۔ اگر صحت نے اجازت دی تو، انشاءاللہ! پھر تفصیلی گفتگو ہوگی۔

جناب سید محمد رضا رضا بی ۔ اے

نئی اصطلاحوں اور نئے قاعدوں کے واضع

زبان و ادب کے وہ معینہ قاعدے جو اساتذۂ قدیم نے مقرر کر دیے اور جن پر تمام شعرا و ادبا عمل کرتے ہیں، ان سے کسی قسم کا گریز یا ان میں کوئی ترمیم و تنسیخ جائز نہیں سمجھی جاتی اور اگر کوئی اس کی کوشش کرے تو اس کو نہ صرف یہ کہ قبول عام حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اکثر حلقوں کی طرف سے شدید رد عمل کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے اس قسم کی جسارت سے عموماً گریز کیا جاتا ہے۔ یہاں ان حضرات کا ذکر نہیں ہے، جو سہل انگاری یا اصول معنی و بیان اور معیارِ فصاحت و بلاغت سے ناواقفیت کی بنا پر یا جدیدیت اور جدت پسندی کے پرفریب نام پر زبان و ادب کی صورت مسخ کرتے رہتے ہیں اور لایعنی ترکیبوں، خلافِ اصول بندشوں اور عجیب و غریب لفظوں کے استعمال پر فخر کرتے ہیں۔ ان کا ادب میں کوئی مقام ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ میرا منشا تو زبان و ادب کو ترقی دینے کے عمل سے ہے، جس سے فصاحت و بلاغت یا معنویت پر حرف نہ آئے۔

جناب مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ اپنے درخشاں علمی اور ادبی پس منظر کے ساتھ ساتھ وہ اخلاقی جرأت بھی رکھتے ہیں کہ اگر مروجہ اصول و قواعد میں کہیں کوئی سقم پائیں یا اساتذۂ قدیم کے اسناد کے ساتھ کسی اصول میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت سمجھیں تو کسی رد عمل کی پروا کیے بغیر اس پر اظہار خیال کریں۔

شمس صاحب قبلہ میرے برادر بزرگ ہیں۔ میرے قلم سے ان کی تعریف خود اپنی تعریف کے مترادف ہے، اس لیے ان کے وصف و مدح سے گریز کرتے ہوئے

میں ان کے اس ادبی کارنامہ پر گفتگو کروں گا، جو انھوں نے زبان میں نئی اصطلاحیں اور نئے قواعد وضع کر کے انجام دیا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ ادبا اور شعرا نے کچھ ایسے قاعدے بھی مقرر کیے ہیں جو فصاحت کے خلاف ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں، جن سے فصاحت و بلاغت تو بڑھتی ہے مگر اصول شاعری کے مطابق جو عیب پیدا ہوتا ہے، اس کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا، میں مندرجۂ ذیل تین موضوعات پر گفتگو کروں گا اور ان کے متعلق شمس صاحب قبلہ کے نظریات پیش کروں گا:۔

۱۔ تعقید کا مسئلہ

۲۔ عطف و اضافت میں اعلان نون کا مسئلہ

۳۔ روزمرہ، محاورہ اور ضرب المثل میں تصرف کا مسئلہ

۱۔ تعقید کا مسئلہ : تمام شعرا و ادبا کے نزدیک تعقید شعر کا عیب ہے، مگر جناب شمس کے نزدیک تعقید کو مطلقاً عیب قرار دینا درست نہیں۔ انھوں نے اس کی تین قسمیں قرار دی ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

(الف) تعقیدِ خفی : مولانا صفی لکھنوی کا مصرع ہے:

جس کی جو فطرت ہے، وہ اس کو بدل سکتا نہیں

اصل محاورہ ہے "نہیں بدل سکتا"۔ صفی صاحب نے ضرورتِ شعری سے "بدل سکتا نہیں" کہا۔ یہ ایسی تعقید ہے، جو محسوس بھی نہیں ہوتی اور اس سے شعر میں عیب پیدا نہیں ہوتا، اس لیے اس کو "تعقیدِ خفی" کہنا چاہیے۔

(ب) تعقیدِ جلی : آتش کا مصرع ہے:

خزاں چمن سے ہے جاتی، بہار راہ میں ہے

یہ تعقید کی واضح مثال ہے اس لیے کہ "جاتی ہے" کو "ہے جاتی" نظم کیا گیا ہے، جو بری طرح کھٹکتا ہے اور مصرع میں عیب پیدا کرنے کا سبب بنا ہے۔ مولانائے محترم ایسی تعقید کو "تعقیدِ جلی" قرار دیتے ہیں۔

(ج) تعقید بلیغ : غالب کا شعر ہے

ہے خون جگر جوش میں ، دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور

اس مصرع میں تعقید ہے ، یعنی - خون جگر جوش میں ہے - کو - ہے خون جگر جوش میں - نظم کیا گیا ہے ، مگر اس تعقید سے مصرع میں عیب پیدا ہونے کی بجائے ، زورِ کلام اور حسن بیان پیدا ہوا ہے ۔ شمس صاحب ایسی تعقید کو - تعقید بلیغ - کہہ کر مستحسن قرار دیتے ہیں ۔

۲۔ عطف و اضافت میں اعلانِ نون کا مسئلہ : اردو الفاظ میں عطف و اضافت کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے شمس صاحب کا فرمانا ہے کہ حسن زبان و بیان کا نام ادب ہے ۔ حسن زبان کو - فصاحت - اور حسن معنی کو - بلاغت - کہتے ہیں اسی بنا پر عربی کے ایک انشا پرداز نے ایک فصیح جملہ کی تعریف میں کہا ہے : - دخل الاُذن بلا اِذن - ، یعنی کان میں بغیر اجازت کے داخل ہو گیا ۔ مطلب یہ ہے کہ سامعہ نے فوراً قبول کر لیا ۔

شمس صاحب مزید فرماتے ہیں کہ دیکھنا یہ ہے کہ عطف و اضافت کا تعلق فصاحت سے ہے یا بلاغت سے ، یعنی صوتی ہے یا معنوی ۔ جب ہم - کتابِ خوب : کہتے ہیں تو سامعہ فوراً قبول کر لیتا ہے اور - کتابِ اچھی - کانوں کو سخت ناگوار ہوتا ہے ۔ معلوم ہوا کہ اس کا تعلق معنوی نہیں بلکہ صوتی اور غنائی ہے ، لہٰذا وہ عربی فارسی الفاظ جن میں صوتی تغیر نہیں ہوا ، ان میں عطف و اضافت سامعہ کو ناگوار نہیں ہوتی ، اس لیے اس کے جواز میں بھی تامل نہیں ہونا چاہیے ۔ یہ خیال کہ معنی بدل جانے سے وہ اردو ہو گئے اور اردو کی اضافت فارسی سے درست نہیں ، محض کٹ حجتی ہے ۔ کتنی غیر منطقی بات ہے کہ - شادیِ قائم - مسرتِ قائم کے معنوں میں صحیح اور عروسیِ قائم کے معنوں میں غلط ہے ! میری رائے میں نہ صرف عربی فارسی الفاظ جو مورد ہو گئے ہیں ، بلکہ وہ الفاظ جو عربی فارسی ساخت کے ہیں ، ان میں بھی عطف و

اضافت جائز ہونا چاہیے۔ جیسے شرابور، منہ زور، تربوز، خربوزہ، تالاب، تلوار وغیرہ شرابورِ محبت، اسپِ منہ زور، تربوزِ شیریں، خربوزۂ سفید، تالابِ شجاع الدولہ، تلوارِ تیز وغیرہ کانوں کو برا نہیں لگتا۔ یہ "دخل الأذن بلا اِذن" کا مصداق ہے، مگر اس میں قباحت یہ ہے کہ اگر اس کو قبولِ سماعت کے اصول پر چھوڑ دیا جائے تو ہر شخص کو یہ حق حاصل ہو جائے گا کہ وہ کہے کہ دردِ پا، اٹھانِ شباب، کوٹھائے بلند، کھڑکیِ کشادہ، لوٹائے گلی، پھول یاسمین وغیرہ تو مجھے برا نہیں معلوم ہوتا، جبکہ کچھ لوگ اس سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ ہر ہندی لفظ کی فارسی سے عطف و اضافت صحیح سمجھنا چاہیے۔ زبان کو اس بے راہروی سے بچانے کے لیے اہلِ زبان کی تقلید ضروری قرار دی گئی ہے، اس لیے جب تک اہلِ زبان بھی اس کو قبول نہ کر لیں، کسی کو اس کے استعمال کا حق نہیں پہنچتا۔

اسی ذیل میں مورد الفاظ کے متعلق جناب شمس یوں اظہارِ خیال فرماتے ہیں:

ہر زندہ زبان میں دوسری زبان کی نظمیں کچھ تغیر کے ساتھ داخل ہوتی رہتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر جگہ کے لوگوں کے کام و دہن کی ساخت میں فرق ہوتا ہے، اسی کے موافق ان کی آوازیں اور لہجہ ہوتا ہے۔ یہ تغیر پہلے عوام کی زبان پر ہوتا ہے، کیونکہ وہ تہذیب و تمدن سے دور ہوتے ہیں اور فطری خصوصیات ان میں مضبوطی کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ متمدن افراد ہر زبان کے الفاظ اس کے اصلی تلفظ کے ساتھ بول سکتے ہیں۔ جب تک یہ تغیرات عوام تک محدود رہتے ہیں، زبان کا جزو نہیں بنتے اور جب خواص بھی قبول کر لیتے ہیں تو وہ مستند سمجھے جاتے ہیں۔ دوسری زبانوں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ عرب ٹیلیگراف کو تلغراف، ریڈیو کو رادیو اور انگریز امیرالبحر کو ایڈمرل، شریف کو شیرف اور سیر کو سَر کہتے ہیں۔ اسی سے تمام زبانیں ترقی کرتی ہیں۔ اردو میں بھی اسی طرح الفاظ کا ذخیرہ فراہم ہوا۔ دوسری زبانوں سے اردو میں آنے والے الفاظ کی مثالیں حسبِ ذیل ہیں، جن کی حرکات میں مورد ہونے سے تغیر ہو گیا:۔

حماقت سے حماقت، خزانہ سے خزانہ، موسم سے موسم، تُنبک سے تُنبک،
میّت سے میّت، دماغ سے دماغ، ترکش سے ترکش وغیرہ۔

حرف میں تغیر کی مثالیں : مبہم سے مُکھم، کباب سے کواب، لیمو سے نیبو، بدتر سے بتر، دلارا سے دُلارا، افیون سے افیم، احاطہ سے حاطہ، عقصلہ سے اولا، شادباش سے شاباش اور شابش، تنور سے تندور، کیپٹن سے کپتان وغیرہ۔

معنوی تغیر کی مثالیں : شادی کے معنی خوشی کے ہیں، اردو میں بیاہ کو کہتے ہیں دبنگ بمعنی پست فطرت ہے، مگر اردو میں رعبدار آدمی کو کہتے ہیں۔ وقعت کے معنی جنگ و جدل ہیں، مگر اردو میں عزت کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اسی طرح کے بہت سے الفاظ ہیں، جن میں حرکات، حرف یا معنی کا تغیر ہوا ہے۔ یہ تغیرات پہلے عوام کی زبان پر ہوئے ہوں گے، لیکن خواص کی زبان پر آنے کے بعد وہ مستند ہو گئے۔ اب ان کی تصحیح درست نہیں۔ شعرا نے بھی ان تغیرات کو مستند سمجھ کے قبول کیا اور ان کو اپنے اشعار میں استعمال کیا۔ اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

افیم = مصحفی نے افیون کو افیم باندھا ہے:

دیکھ صحبت کو بہم لالۂ نافرماں کی
شفق شام نے بھی شام سے کھائی ہے افیم

آگ ببولا = رشک نے آگ ببولا نظم کیا ہے:

مجھ سے گرمی بھی وہ کرتا ہے تو دوہری گرمی
خود جلانا مجھے ، خود آگ ببولا ہونا

پجامہ = برق نے پجامہ نظم کیا ہے:

ایسی صورت ، ایسے پٹے ، ایسے پجامے کہاں
طرز عالم سے ہمارے لکھنؤ کا اور ہے

پخانہ = ظریف نے پخانہ نظم کیا ہے:

ماش کی دال جو بھمن کو ملی کھانے میں
جا کے ناقوس بجانے لگا بتخانے میں

مگھم = آرزو نے مگھم لکھا ہے:

مگھم بات پہیلی ایسی ، بس وہی بوجھے جس کو بجھائے
بھید نہ پائے تو گھبرائے ، بھید جو پائے تو گھبرائے

(اقتباسات از نگارشاتِ رنگ رنگ)

زبان میں تغیرات کے اس پس منظر میں جناب شمس نے عطف و اضافت کے مسئلہ پر اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے:

شعرا اور ادبا کا اس امر پر اتفاق ہے کہ عطف و اضافت کے ساتھ اعلان نون جائز نہیں ۔ اس اصول کا اطلاق مضاف الیہ اور معطوف علیہ الفاظ پر ہوتا ہے اور ہونا چاہیے ۔

مضاف الیہ الفاظ کی مثال : بہار جاوداں ، گلزار بے خزاں ، گردش آسماں ، تیغ خونچکاں ، منزل امتحاں ، طائر آشیاں ، آرام جاں ، آبروئے خانداں ، آرائش مکاں ، محفل امکاں ، شمعِ شبستاں ، کوچۂ جاناں وغیرہ ۔

معطوف علیہ الفاظ کی مثال : پیر و جواں ، تیر و کماں ، معلم و دبستاں ، آزمائش و امتحاں ، مکان و دکاں ، دنیا و دیں ، دامان و گریباں ، آہ و فغاں ، زمین و آسماں ، برق و آشیاں ، دل و جاں ، زبان و بیاں ، حیران و پریشاں وغیرہ ۔

مندرجہ بالا دونوں صورتوں (یعنی مضاف الیہ و معطوف علیہ الفاظ) میں اعلان نون قطعاً ناجائز ہے ۔ اس کے برخلاف مضاف اور معطوف الفاظ میں نہ صرف یہ کہ اعلان نون جائز ہے ، بلکہ اعلان نون کے بغیر وہ پڑھے ہی نہیں جاسکتے ۔ مثلاً:

مضاف الفاظ = آسمان جفا کار ، امتحان وفا ، آشیان بلبل ، جوان رعنا ، کمان کیانی ، جان جہاں ، خاندان بنی ہاشم ، مکان محمود ، امکان تغیر ، شبستان شاہی ، جانان جاں وغیرہ ۔

معطوف الفاظ = جوان و پیر، کمان و تیر، دبستان و معلم، امتحان و آزمائش، مکان و زمیں، دین و دنیا، دامان و گریباں، فغان و آہ، آسمان و زمیں، آشیان و برق، جان و دل، زبان و بیاں، حیران و پریشاں وغیرہ۔

اسی طرح کچھ الفاظ ایسے ہیں، جن کی فطرت اعلان نون ہے۔ وہ اخفائے نون سے پڑھے ہی نہیں جا سکتے، چاہے مضاف ہوں، معطوف، مضاف الیہ ہوں یا معطوف علیہ۔ ان کی بھی قسمیں ہیں: اسم معرفہ، اسم نکرہ اور اسم صفت۔

اسم معرفہ کی مثالیں : حسنؑ، حسینؑ، ختن، حنین، عین، غین وغیرہ۔

اسم معرفہ میں مضاف الیہ کی مثالیں : کردارِ حسنؑ، شہادتِ حسینؑ، مشکِ ختن، جنگِ حنین، حرفِ عین وغیرہ۔

معطوف علیہ کی مثالیں : رسولؐ و حسنؑ، علیؑ و حسینؑ، بدر و حنین، روم و ختن، صاد و عین وغیرہ۔

اسم نکرہ کی مثالیں : گلشن، چمن، سخن، کفن، زمن، دمن، برہمن، بدن، رسن وغیرہ۔

اسم نکرہ میں مضاف الیہ کی مثالیں : بہارِ گلشن، گلہائے چمن، شیرینیٔ سخن، تارِ کفن، رسولِ زمنؐ، شکلِ برہمن، اعضائے بدن، حلقۂ رسن وغیرہ۔

معطوف علیہ کی مثالیں : گل و گلشن، سبزہ و چمن، غسل و کفن، کوہ و دمن، شیخ و برہمن، شعر و سخن، دار و رسن، صحت و بدن وغیرہ۔

اسم صفت کی مثالیں : محن، فتن، حسن، کہن، علن وغیرہ۔

اسم صفت میں مضاف کی مثالیں : دارِ محن، قولِ حسن، چرخِ کہن، دورِ فتن وغیرہ۔

معطوف علیہ کی مثالیں : رنج و محن، سر و علن، تازہ و کہن، زشت و حسن وغیرہ۔

۳۔ روزمرہ، محاورہ اور ضرب المثل میں تصرف کا مسئلہ : تمام ادبا کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ روزمرہ، محاورہ اور ضرب المثل میں تصرف جائز نہیں

اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے شمس صاحب فرماتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ جو الفاظ کسی ترتیب کے ساتھ اہل زبان کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں، ان میں فصاحت و بلاغت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ قبول عام کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ان میں تصرف فصاحت و بلاغت کو ختم کر دیتا ہے۔ مگر بعض اساتذہ اور بعض مشہور شعرا نے تصرف کیا ہے۔ اس کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ تصرفِ قبیح

۲۔ تصرفِ مستحسن

۳۔ تصرفِ ناجائز

۴۔ تصرفِ جائز

(۱) تصرفِ قبیح : سیماب اکبرآبادی کا شعر ہے:

سروں پر رات دن لٹکی ہوئی ہیں تیز تلواریں
تمیدہ سر بچگتنے کو تمال کار بیٹھے ہیں

تلواریں لٹکنا نہیں، تلواریں کھینچنا محاورہ ہے۔ اگر سر پر ہزاروں تلواریں لٹک رہی ہوں تو کوئی خوف کی بات نہیں، لیکن ایک تلوار بھی سر پر کھنچی ہے تو خوفِ قتل ہے۔ محاورہ میں تصرف نے معنی ہی بدل دیے۔ پر خطر بات بے خطر ہو گئی۔

شبلی نعمانی کہتے ہیں: "پاؤں کا ان کے ٹہوکا جو لگا"۔ ٹہوکا لگنا نہیں، ٹہوکا دینا محاورہ ہے، جو کہنی سے کسی کو کمر میں دیا جائے۔ بالارادہ "پاؤں" کہنا غلط بات ہے اور "لگا" کے معنی ہیں "بے ارادہ"۔ جو پاؤں سے ٹھوکر کو کہا جاتا ہے۔ کمر میں ٹہوکا کہنا فصیح بات ہے۔ یہ محاورہ کا ایسا غلط استعمال ہے، جس کی مثال نہیں مل سکتی۔

ایک جگہ فرماتے ہیں: "مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ ٹکے کا"۔ صحیح مثال یوں ہے "ہاتھی لاکھ لٹے گا، پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا"۔ اس کا محل استعمال یہ ہے کہ کوئی شخص

بہت دولتمند تھا، اب مفلس ہو گیا تو کہتے ہیں "ہاتھی لاکھ لٹے گا، پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا" - اس ہنوت میں بھی ان کے پاس بہت کچھ ہے - مرا ہوا ہاتھی دمڑی کا کوئی نہیں خریدے گا - وہ چیل کووں کی غذا ہے - ایسی غلطیاں نادانستہ زبان نہ جاننے کی وجہ سے ہو جاتی ہیں -

(۲) تصرفِ مستحسن : اردو کا محاورہ ہے: "چھت ٹپکتی ہے" - یہ مجازِ مرسل کی ایک مثال ہے - ظرف کہہ کر مظروف مراد لیا ہے - "اگر پانی ٹپکتا ہے" کہیں تو مطلب ہی خبط ہو جائے گا - "چھت سے پانی ٹپکتا ہے" کہیں تو ایجاز کا لطف جاتا رہے گا - "چھت برستی ہے" بالکل غلط ہے - یہ ابر کے لیے کہا جاتا ہے - "چھت برستی ہے" بہت خفیف بات ہے، لیکن غالب ایک خط میں لکھتے ہیں: "پانی ایک گھنٹہ برستا ہے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے" - اس میں ایک شعر کا لطف پیدا ہو گیا ہے اور وجد آفریں ہے - اردو کا محاورہ ہے: "گھٹائیں جھوم جھوم کے آئیں، پانی ٹوٹ ٹوٹ کے برسا" - آرزو صاحب کا شعر ہے:

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کے آئی گھٹا، ٹوٹ کے برسا پانی

بھیگے ہوئے بالوں کو جھٹکنا اور اس سے قطروں کا گرنا، جھوم کے گھٹا آنے اور ٹوٹ کے پانی برسنے سے مشابہت و مناسبت رکھتا ہے - جھوم جھوم کے اور ٹوٹ ٹوٹ کے، حالت سے مشابہت نہیں رکھتا -

(۳) تصرفِ ناجائز : میر انیس کی بیت ہے:

سرخی اڑی تھی پھولوں سے، سبزی گیاہ سے
سایہ کنویں میں اترا تھا پانی کی چاہ سے

چاہ میں اترنا" محاورہ ہے - "چاہ سے اترنا" غلط ہے، مگر ردیف و قافیہ کی مجبوری سے یہ تصرف کرنا پڑا، حالانکہ یہ غزل کا شعر نہیں ہے کہ جس کی ردیف نہ

بدل جا سکے ... مرثیہ کی بیت ہے ... ردیف آسانی سے بدل جا سکتی ہے ۔ جیسے:

سرخی رہی گلوں میں ، نہ سبزی گیاہ میں
سایہ کنویں میں اترا تھا پانی کی چاہ میں

"چاہ میں" صنعتِ توجیہ نے محاورہ کا لطف بڑھا دیا ۔

(۴) تصرفِ جائز: "میلے لگنا" محاورہ ہے ۔ "میلے رہنا" محاورہ کا غلط استعمال ہے ۔ امان علی سحر (شاگردِ ناسخ) کا مشہور شعر ہے:

ہمیں کیا ، جو تربت پہ میلے رہے
تہِ قبر ہم تو اکیلے رہے

"اکیلے رہے" اصل مضمون ہے ۔ اس میں تصرف نہیں ہو سکتا ۔ اس وجہ سے محاورہ میں تصرف کرنا پڑا ، جو ایسا تصرف نہیں ہے جس سے محاورہ کے معنی ہی بدل گئے ہوں ۔ محاورہ ہے: "ان کا دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا" ۔ "دنیا میں تعلق" خلافِ محاورہ ہے ۔ اسے بدلا نہیں جا سکتا ۔

دولھا صاحب نے عارف صاحب کے چہلم کی مجلس میں نیا مرثیہ کہہ کے پڑھا اس میں عارف صاحب کے متعلق یہ بیت تھی:

تعلق ان کا نہ کچھ اس جہانِ زشت میں تھا
قدم تھا ایک یہاں ، دوسرا بہشت میں تھا

دوسرا مصرع برجستہ ، مضمون کے لحاظ سے بےمثل اور زبان کے لحاظ سے پرلطف ہے ۔ اس میں کسی طرح کا تغیر مصرع کو بےلطف کر دے گا ۔ اس وجہ سے پہلے مصرع میں محاورہ میں تصرف کرنا پڑا ، جو ایسا تصرف ہے جس سے محاورہ کے معنی نہیں بدلے ۔

اس واقعہ کی یہ تاریخی اہمیت بھی ہے کہ مشہور تھا کہ دولھا صاحب کو عارف صاحب مرثیہ کہہ کر دیتے ہیں ۔ اس مرثیہ کے بعد لوگوں کا خیال بدل گیا ۔

مندرجہ بالا بحث کے پیش نظر جناب شمس صاحب قبلہ محاوروں میں بھی تصرف کو جائز قرار دیتے ہیں، بشرطیکہ اس سے محاورہ کے معنی نہ بدلیں اور لطف زبان متاثر نہ ہو۔

اس پوری گفتگو سے جو باتیں سامنے آئیں، وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ شمس صاحب قبلہ ہر تعقید کو برا نہیں سمجھتے، بلکہ اگر تعقید اس طرح آئے، جس سے بندش میں زور اور کلام میں حسن بڑھ جائے تو یہ تعقید مستحسن ہے۔ یہ بات پہلے کسی نے نہیں کہی۔

۲۔ شمس صاحب قبلہ نے عطف و اضافت کے مسئلہ میں بھی یہ بالکل نئی بات کہی ہے کہ عربی و فارسی کے وہ الفاظ جو اردو کا جزو بن کر معنی کے تغیر کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں، ان میں عطف و اضافت بالکل جائز ہے۔ اساتذۂ قدیم، خصوصاً میر عشق، اس کو قطعاً ناجائز سمجھتے تھے، مگر شمس صاحب قبلہ کے دلائل منطقی، قرین عقل اور قابل قبول ہیں۔

۳۔ شمس صاحب قبلہ نے روزمرہ اور محاوروں میں بھی تصرف کو جائز قرار دیا ہے، جو عموماً جائز نہیں سمجھا جاتا۔

اس طرح جناب شمس نے زبان میں ترقی کی راہیں کھولی ہیں، جو ان کی ژرف نگاہی، زباندانی اور فکر میں جدت کی نمایاں دلیل ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی قاعدے انھوں نے وضع کیے ہیں، جو ان کی کتابوں اور مضامین میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی
(مدیر دانش، اسلام آباد)

سرمایۂ افتخار

جناب مولانا محمد باقر شمس برِ صغیر پاکستان و ہند کے مایہ ناز ادیب ہی نہیں، طبیب بھی ہیں اور خاموش خطیب بھی ۔ تہذیب شرقی کی منہ بولتی تصویر اور اخلاق اسلامی کی جیتی جاگتی تفسیر بھی ... ذی علم حضرات میں نابغۂ روزگار اور ذی شعور طبقوں کے نزدیک سرمایۂ افتخار خاکسار ایسے کہ ہر تحریر کے آخر میں اپنے کو ذرۂ ناچیز لکھتے ہیں اور خوددار ایسے کہ پچاسی برس کی عمر میں بھی کسی سے کسی حاجت کا اظہار نہیں کرتے ہیں ۔ وضعدار ایسے کہ ابھی تک طفلی کی شوخی، جوانی کا تبسم، پختہ عمری کی متانت، پیرانہ سالی کی زینت بنی ہوئی ہے ۔ بولتے ہیں تو لکھنؤ یاد آتا ہے، چپ رہتے ہیں تو سنگراموؤ ۔ وہ ایک باوقار، صاف شفاف اور پر کشش شخصیت کے مالک ہیں ۔

کراچی میں ایک مرتبہ ڈاکٹر احسن فاروقی کی رہنمائی اور دوسری مرتبہ قیصر اختر نقوی (انیس شناس پاکستان) کی ہمراہی میں ان سے ملاقات ہوئی ۔ کیا بتائیں، کیسے بات ہوئی ۔ وہ مکمل زبان اور ہم ہمہ تن گوش، وہ مسلسل بیان اور ہم دم بخود خاموش ۔ یوں محسوس ہوا جیسے شاہ گنج لکھنؤ میں استادِ محترم سید مسعود حسن ادیب رضوی کے ادبستان یا شریعکدۂ ناصر الملت کے نخلستان میں بیٹھے ہوئے ہیں: "رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے ۔"

تہذیب و تمدن اور طریقت و شریعت کا جو امتزاج اس پر کشش شخصیت میں پایا جاتا ہے، وہ مجمع البحرین اور قران السعدین کی مثال رکھتا ہے ۔ ویسے بھی وہ خاندان اجتہاد کے چشم و چراغ اور لکھنؤ مرحوم کی خاک پاک کے ایاغ ہیں ۔ افکار

میں ندرت اور ابلاغ میں جدت ہے ۔ تحریروں میں لطافت، گفتگو میں حلاوت اور تنقیدوں میں متانت ہے ۔

موصوف بہت سی ادبی، علمی اور دینی کتابوں کے مصنف ہیں ۔ عرصہ ہوا محبی حسین انجم (مدیر " طلوعِ افکار ") نے مولانا کی بعض تصانیف اظہارِ نظر کے لیے ارسال کی تھیں اور اب عزیزی مولانا محمد حسین نقوی کی فرمائش پر، جو اس مرتبہ مولانا باقر شمس مدظلہ العالی کی دیگر تازہ کتابیں میرے لیے دلپذیر اور بےنظیر تحفوں کی شکل میں لائے ہیں، میں یہ چند جملے قلمبرداشتہ، تبرکاً اور تیمناً " صریرِ خامہ اور نوائے سروش " کی مدد سے رقم کر رہا ہوں، جو ہرگز ہرگز مولانائے موصوف کی " شخصیت اور فن " پر احاطہ نہیں کرتے، مگر اشارہ ضرور کرتے ہیں اور ان اشارات کی تصدیق ان کی کتابوں کے عنوانات سے ہو سکتی ہے ۔



جناب محسن مظفر نقوی

ایک علم دوست شخصیت

ایک دفعہ میں اپنے والد مرحوم جناب تاثیر نقوی کے ساتھ ترقی اردو بورڈ کے دفتر میں مولانا نسیم امروہوی کی خدمت میں بیٹھا تھا۔ متعدد ماہرین لغت نویسی بھی تشریف فرما تھے۔ کسی ہندی ترکیب پر گفتگو ہو رہی تھی۔ خالصتاً علمی مباحث چھڑے ہوئے تھے۔ اختلاف آرا کے سبب یہ بحث کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر ختم ہوتی نظر آرہی تھی کہ اتنے میں مولانا نسیم امروہوی مرحوم نے دروازہ کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا،

"لو! مسئلہ حل ہو گیا۔ مولانا شمس تشریف لا رہے ہیں۔" سب یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ دریں اثنا مولانا کمرے میں تشریف لائے تو سب نے تعظیم و توقیر کے بعد "موضوعِ گفتگو" مولانا کے سامنے پیش کیا۔ جس مسئلہ پر نصف گھنٹے سے بحث ہو رہی تھی، مولانا شمس نے اسے پانچ منٹ میں حل فرما دیا۔

مولانا محمد باقر شمس صاحب میرے بزرگ ہیں اور مجھے ان سے شرفِ نیازمندی حاصل ہے۔ مذکورہ بالا واقعہ نے میرے دل پر مولانا صاحب کے بارے میں انتہائی گہرے اثرات چھوڑے۔ جناب کے نام نامی سے دیگر طالبان علم کی طرح میں بھی واقف تھا اور ان کی نگارشات کے توسط سے انکا شاگرد بھی، لیکن بد قسمتی سے بالمشافہ نیازمندی حاصل نہ ہو سکی تھی۔ مولانا کی عقیدت اور علمی ہیبت، جو مجھ پر سوار تھی، وہ مذکورہ بالا واقعہ کے بعد دوچند ہو گئی۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، مولانائے محترم میرے خاندانی بزرگ ہیں۔

اگر میں ان کی خصوصیات کا، جس حد تک بھی میں ادراک کرسکا ہوں، ذکر کرنے بیٹھ جاؤں تو اسے "دادا کے لیے پوتے کے تاثرات" سمجھا جائے گا، لہٰذا میری خواہش ہے کہ ایک قاری اور طالبعلم کی حیثیت سے میں اس "استادِ بزرگ" کے بارے میں اپنے تاثرات نقل کروں۔

مدارس کی زندگی اور حصول اسناد تک کا عرصہ ہر طالبعلم کے لیے اہم ہوتا ہے اور ہر ایک کی اپنی الگ ایک دنیا ہوتی ہے، جس کے نقش و نگار تلون پذیر، کبھی مدھم اور کبھی شوخ ہوتے ہیں۔ انسان کیونکہ انھیں دنوں نوجوانی کی منزلوں میں قدم رکھتا ہے، لہٰذا فطری طور پر "اللہ جمیل ویحب الجمال" ہی اس کا آئیڈیل جملہ ہوتا ہے۔ اس عہد میں انسان عمق کے ساتھ ساتھ حسن پر بھی نظر رکھتا ہے۔ کوئی کتاب کتنی عمیق ہے، یہ امر اس کے لیے اہمیت ضرور رکھتا ہے، لیکن کتاب کتنی "انیق" ہے، یہ بات بھی کچھ کم اہم نہیں ہوتی۔ والدِ مرحوم ہمیشہ مولانائے محترم کی کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ "زبان کا مزاج" اور "چاشنی" انھیں کتابوں سے سمجھ میں آئے گی۔ پروفیسر شوکت سبزواری نے کہا کہ لکھنؤ سے دو ایسی کتابیں شائع ہوئی ہیں، جن کا مثل نہیں ہے۔ ایک آرزو صاحب کی "نظام اردو"، دوسری شمس صاحب کی "لکھنؤ کی زبان"۔

میں نے مولانا کی پہلی کتاب "لکھنؤ کی تہذیب" پڑھی تھی، جسے خریدتے وقت میں نے متعدد بار سوچا کہ اسے خریدا جائے یا نہیں۔ اس کی طباعت آنکھوں کو بھلی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ دوسری کتابوں کے بارے میں کتب فروش سے دریافت کیا تو بہت سی کتابیں اس نے سامنے لا کر رکھ دیں۔ تمام کتابوں کا معیارِ طباعت کم و بیش ایک سا تھا۔ یہ بات دوسروں کے لیے حوصلہ شکن ہو تو ہو، میرے لیے یہ ایک نکتۂ فکر ثابت ہوئی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ جس شخص نے اتنی ایک کتابیں لکھی ہیں، تحقیق کی ہے، اپنا وقت صرف کیا ہے اور طباعت کی زحمتیں برداشت کی ہیں تو آخر کیا وجہ ہے کہ اتنے بڑے ادیب و عالم کی کتابیں طباعت کے

لحاظ سے عمدہ نہیں ہیں ۔ اس سوال نے مجھے زیادہ دیر پریشان نہ رکھا ۔ کتابوں پر رضویہ سوسائٹی کا پتا چھپا ہوا تھا ۔ وہیں کے ایک کتب فروش سے کتابیں خرید لی تھیں اور اسی سے دریافت کر کے میں مولانائے محترم کے گھر پہنچ گیا ۔

مولانائے موصوف کتابوں کے جھرمٹ میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ کپڑوں پر کتابوں کی معمولی گرد کے اثرات نمایاں تھے ۔ پیشانی عرق آلود تھی ۔ مولانا اپنے کانپتے ہاتھوں سے ایک کتاب کو اٹھاتے اور کچھ دیر ورق گردانی کر کے دوسری طرف رکھ دیتے ۔ پھر کانپتا ہوا ہاتھ کسی ضخیم و وزنی کتاب کے لیے محو جستجو ہو جاتا ۔ کبھی تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ کسی الماری کی طرف تشریف لے جاتے اور ٹھیک اسی کتاب کو نکالتے ہیں ، جس کی انھیں ضرورت ہوتی تھی ۔ میں پندرہ ، بیس منٹ تک اس نظارہ میں محو رہا ۔ مجھے میرے سوال کا جواب مل چکا تھا ۔ میں اجازت لینے کی غرض سے اٹھا ۔ مولانا نے کہا ،

" بیٹا معاف کرنا ! ایک مسئلہ کو دیکھ رہا ہوں ، تم سے بات نہ کر سکا ۔ اچھا بتاؤ ! تم کون ہو اور کس لیے آئے تھے ؟ " میں نے اپنا تعارف کروانا ضروری نہیں سمجھا کہ " غبارِ خاطر " کا سبب نہ بن جائے ۔ عرض کی ،

" بس آپ کی زیارت کرنی تھی ۔ التماس دعا " ۔ میں نے مصافحہ کیا اور باہر نکل آیا ۔

جب تک مولانا کی زیارت نہ ہوئی تھی ، کتابوں کی طباعت پر غصہ تھا ۔ مولانا کی زیارت ہوئی تو تمام غصہ کافور ہو گیا اور اس بیس منٹ کی مشاہداتی نشست نے " ایک علمی و فکری پیکرِ نابغۂ روزگار " شخصیت کا مشاہدہ کروایا تھا ، جو اپنی جگہ دل خوش کن اور فرحت انگیز تھا ۔ مولانا کے گھر سے باہر آیا تو مجھے قوم پر غصہ تھا ، قوم کی بے حسی اور بے پروائی پر آنسو بہانے کو جی چاہ رہا تھا ۔

مولانائے محترم نے علمی و ادبی تحقیق میں اپنی زندگی کو فنا کر دیا ۔ وہ جب اپنے کتبخانہ میں محو تحقیق تھے تو انھیں ہوش بھی نہ تھا کہ گرد و پیش میں کیا ہو رہا

ہے ۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر، وہ بس اپنے کام میں معروف تھے ۔ ایسے محققین کے کارناموں کی مناسب اشاعت کی طرف قوم کو متوجہ ہونا چاہیے ۔ مولانا کی کتابیں علمی تہی دستی کا نہیں، مالی وسائل کی ناپرسی کا مرثیہ ہیں ۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ کوئی انسان کتابیں اور دولت ساتھ ساتھ جمع نہیں کر سکتا، کیونکہ کتاب دوست کی دولت خریداری کتب میں صرف ہو جاتی ہے ۔ مولانائے محترم تو خود مرجع وقت کے صاحبزادہ ہیں ۔ نہ ان کے والد نے دولت جمع کی اور نہ بیٹے نے اس کی میراث پائی ۔ نہ وہ کوئی دولت جمع کر سکے اور نہ ان کی اولاد اس میں سے حظ پائے گی ۔ اللہ انھیں ہمارے سروں پر تا دیر قائم رکھے!

مولانائے محترم کی کتابیں پڑھ کر آپ کی وسعتِ علمی اور قوتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے ۔ میرا خیال تھا کہ آپ کی جولانگاہ زبان و ادب اور تاریخ کے میادین ہیں ۔ واقعات کی تلاش، ان کی تنظیم، نشست و برخاست، اشیا و افعال کی تفصیل اور ان کے اجزا کا بیان، جزئیات کی تحقیق، ان کا تجزیہ و تحلیل اور پھر اخذِ نتائج تاریخ کے اہم ترین اجزا ہیں، جو مولانا کی تاریخی کتابوں میں ملتے ہیں ۔ مولانا موصوف کسی واقعہ کو اس لیے ضبطِ تحریر میں نہیں لاتے کہ وہ "واقعہ" ہے، بلکہ واقعہ کی سماجی تاریخی (sociopolitical) اہمیت کو بیان کرتے ہیں اور اس کے ضمنی اثرات کو اجاگر کر کے واقعہ کی اصل اہمیت و حیثیت کی وضاحت فرماتے ہیں ۔ یہ طرزِ تحریر گو اردو زبان میں نیا نہیں، "شبلی" کا مکتب بھی انھیں خطوط پر استوار تھا، لیکن ادب اور تاریخ کو باہم ممزوج کر کے اس طرزِ ادا کو باقی رکھنا، بلاشبہ مولانا شمس صاحب ہی کا کام ہے وہ تاریخ لکھتے ہوئے بھی ادب لکھتے ہیں ۔ یہ میرا ذاتی تاثر ہے، جس سے کوئی بھی اختلاف کا حق رکھتا ہے ۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مولانا صاحب کی کون سی کتابیں کم اہم اور کون سی زیادہ اہم ہیں، کیونکہ ہر کتاب اپنی جگہ ایک منفرد حیثیت کی حامل ہے، لیکن "شعور و شاعری" نامی کتاب بلاشبہ بہت ہی زیادہ اہمیت کی حامل ہے ۔ شعور و

شاعری کے حوالہ سے جو مباحث آپ نے سپردِ قلم فرمائے ہیں ، وہ ادبی دنیا پر ایک احسان ہے ۔ پھر اساتذہ کے کلام پر جو " اصلاحیں " دی ہیں ، وہ جرأتِ اظہار کے ساتھ ساتھ " فن پر عبور " کا پتا دیتی ہیں ۔ گو مجھے ان میں سے بعض مقامات سے اختلاف ہے ، لیکن اس کی تحلیلی حیثیت اپنی جگہ مضبوط و منفرد ہے ۔

ایک روز محترم ڈاکٹر محمد حسن رضوی صاحب نے فون پر بتایا کہ مولانا شمس صاحب نے مجھے یاد کیا ہے ۔ " حکم حاضری " سننے کے دو روز بعد میں مولانا کی خدمت میں گیا ۔ یہ ۹۲ء کی بات ہے ۔ مولانا موصوف کو ویسے ہی مطالعہ میں غرق دیکھا ، جیسا کہ اب سے بیس سال پہلے دیکھا تھا ۔ یہ جناب کے کتبخانہ میں دوسرا شرفِ ملاقات تھا ۔ میں نے عرض کی ،

" بندہ حاضر ہے ۔ "

" کون ہو تم ؟ "

" محسن مظفر " میں نے جواب دیا ۔

" سلامت رہو ! آؤ بیٹھو ۔ " میں ایک لمحہ کے لیے اب سے بیس سال پہلے کے مولانا شمس کو کتبخانہ میں تلاش کرنے لگا ۔ مجھے زیادہ زحمت نہیں ہوئی ۔ بیس سال میں کوئی تغیر نہ ہوا تھا ۔ صرف بینائی زیادہ کمزور ہو گئی تھی ، ورنہ آپ اسی طرح تحقیق و مطالعہ میں مصروف تھے ، جیسا کہ دو عشرے پہلے میں دیکھ چکا تھا ۔ آپ نے پوچھا ،

" تم آجکل کیا کر رہے ؟ " میں نے اپنی مصروفیت اور تحقیقی کاموں میں مشغولیت عرض کی ۔ مولانا نے شاباش دی اور کام میں منہمک رہنے کی ہدایت فرمائی میں نے عرض کی ،

" واوا ! یہ وہ کتاب ہے ، جو عربی زبان میں میں نے " اجماع " کے موضوع پر لکھی ہے اور اس پر مراجعِ عظام نے مجھے اجازہ دیا ہے ۔ " اوراق ہاتھ میں لیتے ہوئے عینک اتاری اور فرمایا ،

" بھئی ! اجماع کی دو ہی صورتیں ہیں : اجماعِ منقول اور اجماعِ محصل ۔ تم

نے اس پر کیا بحث کی ہے ؟" میں نے عرض کی ،

" دیکھ لیجیے ! " پھر آپ نے " اجماع " سے متعلق بعض مباحث پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی ۔ میں انھیں صرف ادیب اور تاریخ داں سمجھتا تھا ۔ اجماع اور اصول فقہ پر آپ کی گفتگو میرے لیے باعث خوشی و مسرت تھی ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موصوف فقہ اور اصول میں بھی درک رکھتے ہیں ، حالانکہ اس سے قبل انھوں نے کبھی اس کا اظہار نہ کیا تھا ۔ اسی نشست میں مولانا نے اپنی نئی کتاب " تاریخ لکھنؤ " کا ذکر کیا اور اس کے کتابت شدہ اوراق میرے حوالہ کرتے ہوئے مجھے پروف ریڈنگ کا حکم دیا ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس کام کو عدیم الفرصتی کی وجہ سے نہ کر سکا اور اب یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ ہو کر توزیع کے مرحلہ میں ہے ۔ مولانا نے کچھ کتابیں بھی مجھے تحفتاً عنایت فرمائیں ۔

دریں اثنا مولانا نے مجھ سے فرمایا ،

" بابا جان (سرکار صدرالشریعہ مولانا سبط حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ) نے بھی " اصول " پر ایک کتاب لکھی تھی ، جو اب ناپید ہے ۔ " میں نے عرض کی ،

" وہ کتاب میرے پاس ہے ۔ " یہ سن کر وہ ششدر رہ گئے اور ان کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی ۔

" یہ کتاب تمھارے پاس کہاں سے آئی ؟ " ان کا دوسرا سوال تھا ، جس کا جواب دینے کی بجائے ، میں نے عرض کی ،

" جناب کی ایک اور کتاب " ہات العذیر من خبر الغدیر " بھی میرے پاس ہے ، نیز آپ کا مجموعۂ فتاویٰ اور سرکار میر آغا صاحب کا رسالہ " عملیہ " بھی ہے ۔ " میں بتا نہیں سکتا کہ مولانا ان جملوں سے کس قدر خوش ہوئے ۔ ڈھیروں دعائیں دیں ، جو میری زندگی کا سرمایہ ہیں ۔ بعد ازاں موصوف نے مجھ پر ایک اور کرم فرمایا ۔ ایک الماری سے رجسٹر نما کتاب نکال کر لائے اور فرمایا ،

" یہ لو ! یہ سید علی محمد تاج العلما کی کتاب " شرح اخلاق جلالی " کا قلمی نسخہ ہے

جو میں نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ اس کا ایک جز کراچی یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔ وہاں سے کاپی کروالینا۔ ہاں! مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسے حفاظت سے رکھنا تم، ماشا اللہ! خود ....." میں نے سپاسگذاری کی اور آداب و تسلیمات عرض کر کے آپ کی دعاؤں کے سایہ میں رخصت ہو گیا۔

ان دو، تین واقعات سے مولانا کے تبحرِ علمی، علم دوستی، طالبانِ علم کی حوصلہ افزائی، تحقیقی کاوشوں، نیز قوم کی بے حسی و بے مذاقی پر روشنی پڑتی ہے۔ قوم کا یہ فرض تھا (اور ہے) کہ مولانا کو تحقیق میں مصروف رہنے دیا جاتا، ان سے علمی استفادہ کی صورتیں نکالی جاتیں، انھیں فکرِ معاش سے آزاد کر کے صرف علمی کام کرنے دیا جاتا اور ان کی کتابوں کی معقول اشاعت کے لیے کوئی ادارہ بنایا جاتا تو سیفِ قلم کا یہ دھنی "ناقابلِ یقین" علمی و تحقیقی سرمایہ چھوڑتا۔ جو کچھ آپ نے تحریر فرما دیا ہے، اب بھی بڑے کتبخانوں پر بھاری ہے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!

جناب حسرت کاظمی

عصر حاضر کی عظیم شخصیت

مولانا محمد سید باقر شمس صاحب کی ذاتِ گرامی مجموعۂ اوصافِ حمیدہ ہے۔ آپ اپنی ذات میں ایک ایسا چمن زار بے خس و خار ہیں، جس میں ادب، تاریخ، تنقید، تحقیق، لسانیات اور شاعری کے گلہائے رنگ رنگ اپنی پوری شادابی کے ساتھ کھلے ہوئے ہیں اور اپنی مہک سے شائقینِ علم و ادب کے مشامِ جاں کو معطر کر رہے ہیں۔

آپ کا ورودِ مسعود اس جہانِ رنگ و بو میں اگست ۱۹۰۹ء کو شہر جونپور میں ہوا۔ آپ ایک عظیم باپ کے عظیم فرزند ہیں۔ آپ کی تعلیم و تربیت کے متعلق جناب علامہ مولانا محمد رضی صاحب قبلہ مجتہد نے لکھا ہے:

"آپ نے عظیم باپ حضرت مجتہدِ اعظم سرکار مولانا استاذنا السید سبطِ حسین النجفی طاب ثراہ کی گود میں پرورش پائی۔ یہی جناب شمس صاحب کی علمی ترقی اور تحقیقی بلندی، نیز ارتقائے ذہن کا روشن مینار اور تابناک اساس ہے۔

موصوف کی تصنیفات و تالیفات کا مطالعہ کرنے والے ان کی وسعتِ علمی، کمالِ فن، ذوقِ تحقیق، اعتدالِ تحریر، تنقید میں انصاف پسندی اور اعلائے کلمۃ الحق میں بے لوثی اور بیباکی، خاندانی وجاہت اور موروثی ذہانتِ خداداد کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میں نے موصوف کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے۔ لکھنے کا طریقہ انتہائی

دلچسپ، معلومات سے بھرا ہوا ہے۔ ہر قدم پر گہری تحقیق اور بغیر کسی فرقہ وارانہ اور یکطرفہ رجحان کے اپنی معتدل رائے کا اظہار ہے اور اکثر و بیشتر باتیں موصوف کے بیانات میں ایسی بھی آتی ہیں، جو آج تک کسی دوسرے مقالہ نگار یا مصنف نے نہیں لکھی ہیں اور کسی کی بھی نظر ان کی طرف نہیں گئی۔

علمِ دین میں اسلامی نظام پیش کیا ہے اور اس سلسلہ میں جو باتیں لکھی ہیں، وہ سب نئی ہیں۔ مثلاً: عرب میں ظہورِ اسلام کی وجہ، مکہ میں ظہورِ اسلام کی وجہ، بنی ہاشم میں ظہورِ اسلام کی وجہ، ابو طالب کے گھر سے ظہورِ اسلام کی وجہ، دعوتِ عشیرہ کی وجہ، مخالفتِ قریش کی وجہ ... پانچ سو صفحات کی کتاب (اسلام پر کیا گزری) میں کوئی نظریہ، کوئی نکتہ، کوئی تحقیق، کوئی استدلال ایسا نہیں ہے، جو اس سے پہلے کوئی کہہ چکا ہو۔ ان کی ہر تحریر وسعتِ معلومات، وسعتِ نظر اور گہری تحقیق کا شاہکار ہے۔ وہ جس طرح ادب و تاریخ میں ایک منفرد ادیب و مورخ ہیں، ایک منفرد محقق بھی ہیں۔

مولانا شمس صاحب کی علمی جامعیت اور صلاحیتِ فن کے متعلق ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب یوں رقم طراز ہیں:

۔ مولانا محمد باقر شمس صاحب نے علم دینیات میں اضافے کیے ہیں اور ادب میں ایک نئے علم کی بنیاد رکھی ہے۔ تنقید نگاری میں ان کا جواب نہیں ہے۔ وہ صرف شعر کے عیب ہی نہیں بتاتے، بلکہ اس کو درست کر دیتے ہیں اور اصلاح کی وجہ بتانے میں جو توضیح و تشریح کرتے ہیں، اس سے قاعدے منضبط ہوتے ہیں اور فن کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ مثلاً ایک نعت پر تنقید میں لکھتے ہیں کہ

نعت کیسی ہونا چاہیے ، کس طرح کے مضامین ہوں اور کس طرح
کے الفاظ ہونا چاہییں ۔ اس سے نعت گوئی کا فن قائم ہوتا ہے ۔

شعر میں انتخابِ الفاظ کو کتنی اہمیت ہے اور اس میں ذرا سی چوک شعر کو غلط اور بے معنی بنا دیتی ہے ، اس کی مثالیں پیش کی ہیں اور اس کو اصلاح سے درست کیا ہے ۔

مولانا کی تنقید نگاری اور شعر پر اصلاح کے سلسلہ میں قارئین کی دلچسپی کی خاطر چند مثالیں پیش کرتا ہوں ۔ ملاحظہ ہو غالب کا شعر:

تماشا کر ، اے محو آئینہ داری !
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

مولانا فرماتے ہیں " تماشا " کے معنی اردو میں کھیل کے ہیں ۔ امیر مینائی کا شعر ہے:

ترے بندوں سے کرتے ہیں یہ بت دعوا خدائی کا
تماشا دیکھتا ہوں تیری شان کبریائی کا

" چشمِ تماشائی " تماشا دیکھنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے ، مگر " تماشا کر " " تماشا دیکھ " ، " تماشا دکھا " ، کھیل ہی کے معنوں میں بولا جاتا ہے ۔ " تماشا کر " " ادھر دیکھ " کے محل پر بڑی بدذوقی اور لطفِ زبان سے محرومی ہے ۔ شعر یوں ہونا چاہیے:

ادھر ایک نظر ، محو آئینہ داری !
تجھے کس محبت سے ہم دیکھتے ہیں

اور سنیے:

کون ایسا ہے ، جسے دست ہو دلسازی میں

"دست ہو" کی بجائے، "درک" ہوتا تو پاکیزگی، ذوق کے گلے پر چھری نہ پھرتی۔

ایک اور مصرع:

ہوں میں وہ سبزہ کہ زہرآب اگا ہے مجھ سے

"زہرآب" پیشاب کو بھی کہتے ہیں۔ دست و پیشاب چرکین کے کہنے کی باتیں ہیں۔

یہ مصرع بھی ملاحظہ ہو:

بروئے سفرہ کباب دل سمندر کھینچ

"کباب دسترخوان پر کھینچ" کہاں کی زبان ہے؟

گر نفس جادۂ سر منزل تقویٰ نہ ہوا

یہ تقویٰ راضی کا قافیہ ہے۔ ایسی مثالیں ان کے کلام سے بہت مل سکتی ہیں۔

اب اختصار کے ساتھ دو، تین اشعار داغ دہلوی کے بھی ملاحظہ ہوں:

غش کھا کے داغ یار کے قدموں پہ گر پڑا
بیہوش نے بھی کام کیا ہوشیار کا

شمس صاحب فرماتے ہیں کہ اپنی بات منوانے کے لیے پاؤں پر گرتے ہیں۔ دوسرا مصرع بتاتا ہے کہ "غش" مصنوعی نہ تھا اور پاؤں پر گرنے میں ارادہ کو دخل نہیں تھا۔ جس کے پردہ میں کوئی مقصد ہو، جب یہ غیر ارادی اور اتفاقی بات ہے تو قدموں پر گرنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔ اس سے بہتر "آغوش" ہے:

غش کھا کے داغ یار کی آغوش میں گرا
بیہوش نے بھی کام کیا ہوشیار کا

"مہتاب داغ" کی پہلی غزل کا مطلع

میں کلمہ گو ہوں خاص خدا و رسول کا
آتا ہے بام عرش سے مژدہ قبول کا

(یہ مطلع غزل کا نہیں ہو سکتا) بہرحال شمس صاحب کہتے ہیں کہ "کلمہ" متکلم کا عقیدہ ہے۔ اس کے رد و قبول کا دوسرے مصرع سے تعلق نہیں۔ قبول یا رد نذرانۂ عقیدت ہوتا ہے اور وہ شاعر کی مدح و ثنا ہے۔ کلمہ کی قبولیت کا مژدہ عرش سے آنا غلط ہے۔ شعر یوں ہونا چاہیے:

مداح ہوں میں خاص خدا و رسول کا
آتا ہے بام عرش سے مژدہ قبول کا

یہ بلاغت کی مثال تھی۔ اب فصاحت کو دیکھیے:

چڑھاؤ پھول مری قبر پر جو آئے ہو
کہ اب زمانہ گیا تیوری چڑھانے کا

"تیوری" فصیح نہیں ہے۔ "تیوریاں" ہونا چاہیے، یعنی:

کہ اب زمانہ گیا تیوریاں چڑھانے کا

غیر کی لاش اٹھائی تو نہ ہو خواب میں آج
بار کاکل سے نہ دکھا کبھی شانہ تیرا

"دکھا بتشدید" غیر فصیح ہے۔ مصرع یوں ہونا چاہیے:

بار کاکل سے دکھا تھا کبھی شانہ تیرا

یہ صحیح ہے کہ شعری ضرورت سے غیر مشدد کو مشدد کیا جا سکتا ہے، مگر یہ قاعدہ ہونا کافی نہیں ہے۔ اس پر عمل میں فصاحت کا لحاظ ضروری ہے، اسی وجہ سے

انشا نے اس قاعدہ کا یوں مذاق اڑایا تھا:

تشدید در شعر صحیح چرا نہ باشد

اس سے ان کا یہ مطلب تھا کہ قاعدہ سے تو یہ مصرع بھی صحیح ہے، مگر صرف قاعدہ کا سہارا لینا غلط ہے۔ فصاحت کا باقی رہنا ضروری ہے۔

اب آیئے علامہ اقبال کے کلام کی طرف۔ ابتدائی بندوں کو بخوفِ طول چھوڑ رہا ہوں۔ شمس صاحب فرماتے ہیں کہ دسویں بند کے چاروں مصرعے اپنے مفہوم کو ادا نہیں کرتے:

کشورِ ہند میں کلیسۂ ناکام کا بت
عربستان میں شفا خانۂ اسلام کا بت

اور لندن میں عبادتکدۂ عام کا بت
لیگ والوں نے تراشا ہے بڑے نام کا بت
(شکوہ جوابِ شکوہ)

پہلا مصرع "کلیسا" کا لام مشدد کرنے سے موزوں ہوتا ہے، جو ذوقِ سلیم کے خلاف ہے۔ معنوی ستم دیکھیے:

ہندوستان میں ناکام کلیسا، عرب میں اسلام کا شفا خانہ، لندن کا گرجا گھر اور لیگ، یہ سب بت ہیں۔ کیا شاعری اور کیا تلاش ہے! کہاں کہاں سے چیزیں اکٹھا کی ہیں! اب ہر ایک کا مطلب سمجھنا آپ کا کام ہے۔ شاعر اپنا کام کر چکا ہے۔

"بالِ جبریل" کی پہلی نظم کا شعر:

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

نوا: نغمہ، راگ، گانا — شوق: مرغوب۔

"نوائے شوق" میں اضافت افتراقی ہے، یعنی وہ نغمہ، جو مقرون بشوق ہو۔

حریم: مکان ــــ ذات: وجود، شخصیت۔

"حریمِ ذات" میں اضافتِ تشبیہی ہے، جس کے معنی ہیں ذات کا مکان۔

الامان: پناہ مانگنا ــــ بتکدۂ صفات: صفات کا بتکدہ۔ اس میں اضافت بالاستعارہ ہے۔ "ذات" کو "بتکدہ" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذات، جس کے صفات بت کی طرح باطل ہیں۔ مطلب یہ کہ جب میں اپنا پسندیدہ راگ الاپتا ہوں تو ذات، جو اپنے صفاتِ باطلہ کے ساتھ ایک بتکدہ کی حیثیت رکھتی ہے، پناہ مانگنے لگتی ہے، یعنی میری حقیقت آگیں گفتگو ذات و صفات کا طلسم توڑ دیتی ہے۔ یہ مطلب بھی کھینچ تان کر پیدا کیا گیا ہے، ورنہ حریمِ ذات میں شور اور بتکدۂ صفات میں الامان کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔

حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

حور و فرشتہ میرے تخیلات میں اسیر ہیں، یعنی میری سمجھ سے باہر نہیں ہیں

خلل: خرابی، تعطل۔

خلل دہلی اور لکھنؤ میں ہیضہ کو کہتے ہیں: فلاں کو خلل ہو گیا، یعنی ہیضہ ہو گیا۔ ممکن ہے اس میں ہضم یا معدہ محذوف ہو۔ اس کے علاوہ دماغ میں خلل، کام میں خلل، نیند میں خلل، آرام میں خلل، پڑھنے میں خلل، شعر کہنے میں خلل، سوچنے میں خلل کہتے ہیں ــــ مگر اس پر قیاس کر کے ہر چیز کے ساتھ آزادی سے "خلل" کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ جیسے شمع جلانے سے اندھیرے میں خلل کوئی نہیں کہتا، کیونکہ شمع جلانے کا مقصد ہی اندھیرے کو دور کرنا ہے۔ یہاں "خلل" کا استعمال غلط ہے۔ جس چیز یا کام میں تعطل مقصود نہ ہو اور ہو جائے، وہ "خلل" ہے۔ جس کے کام میں خلل پڑے، اس کے لیے ناگواری کا سبب ہے، لیکن خلل ڈالنے والے کا فعل اگر جان بوجھ کر ہے تو اس کا پسندیدہ ہے۔ تجلیاتِ خداوندی میں خلل ڈالنا

منشائے قدرت کے خلاف ہے، لیکن خلل ڈالنے والے کا پسندیدہ فعل ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میری نگاہ سے تیری تجلیات میں خلل پڑ جاتا ہے، یعنی میری نگاہ تیری تجلی ریزیوں کو روک دیتی ہے۔ یہ بالکل بے معنی اور مہمل بات ہے۔ اس کے علاوہ "تخیلات" کا قافیہ "تجلیات" غلط ہے۔ "فرشتہ" کی جگہ "فرشتے" ہونا چاہیے۔

مزید اشعار چھوڑ کر آخر کا ایک شعر لکھتا ہوں۔ ملاحظہ ہو:

لکھتے ہیں ذیل کا شعر ترکیب و بندش کے لحاظ سے جدیدانہ ہے:

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

قصرِ سلطانی کا گنبد تیرے نشیمن کی جگہ نہیں ہے، یعنی مقامِ عیش و عشرت میں رہنا تجھے مناسب نہیں۔ اس مطلب کے ادا کرنے میں پہلی غلطی یہ ہوئی کہ گنبد پر جھونجھ نہیں لگایا جا سکتا، پھر قصرِ سلطانی کے گنبد پر جھونجھ کتنی بے تکی بات ہے! یہ اس وقت ممکن ہے کہ جب وہ قصرِ شاہی کبھی رہا ہو۔ اب ویران و شکستہ ہو، گنبد میں دراڑیں پڑ گئی ہوں اور چڑیوں نے جھونجھ لگا لیا ہو تو وہ مکان عیش نہیں، ویرانہ ہے اور اس کی یہ حالت مفید مطلب اور مقصودِ شاعر نہیں۔ اس کو یوں ہونا چاہیے

نہیں زیبا ہے تجھ کو شاخِ گل پر آشیاں بندی
تو شاہیں ہے، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

چٹانوں میں بھی غلط ہے، مگر ردیف کی مجبوری شاید جواز پیدا کر دے۔

آخر میں اصغر گونڈوی کے ایک شعر پر تنقید اور اصلاح ملاحظہ ہو۔ اس میں شاعر کی ندرتِ ادا کا بیان ہے:

اس سے زیادہ اور کیا شوخیِ نقشِ پا کہوں
بجلی سی اک چمک گئی میرے سرِ نیاز میں

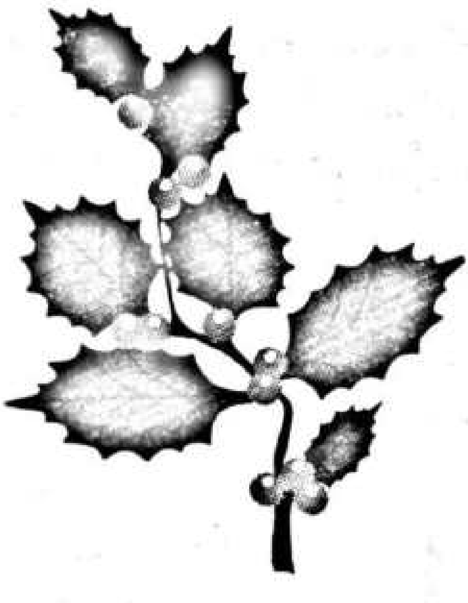
شمس صاحب فرماتے ہیں کہ اس میں جدت یہ ہے کہ تمام شعرا کی آنکھ میں

بجلی چمکتی ہے ، اصغر گونڈوی صاحب کے سر میں بجلی چمکی ، مگر مصرع میں اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ آنکھ کی بجائے ، سر میں کیوں بجلی چمکی ۔ اگر پہلے مصرع میں دو حرف بدل دیے جائیں تو شعر درست ہو جائے گا:

اس سے زیادہ اور کیا شوخی کفش پا کہوں
بجلی سی اک چمک گئی میرے سرِ نیاز میں

مولانا کی کتاب "شعور و شاعری" سے یہ چند مثالیں پیش کی گئی ہیں ۔ اس سے مولانا کے طرزِ نگارش اور طرزِ نقد کا اندزہ لگایا جا سکتا ہے ۔

مولانا کے تنقیدی مضامین ، تصنیفات اور تالیفات ایسے دلچسپ اور مفید معلومات کا گنج بے بہا ہیں کہ ایک ، دو بار پڑھ کر دل نہیں بھرتا ۔ بلاشبہ آپ برصغیر ہند و پاک کی عظیم شخصیت ہیں ۔ خدا آپ کو طول عمر عطا کرے!



جناب سید معراج جامی

مولانا شمس ـــ شعور و شاعری کے تناظر میں

مولانا محمد باقر شمس جیسے مجتہد، عالم و فاضل، آبروئے لکھنو اور نابغہ روزگار شخصیت پر مجھ جیسے ایک کم علم اور ادب کے ادنیٰ طالبعلم کو خامہ فرسائی کا حکم دیا گیا ہے۔ مجھے اس وقت عاصی کرنالی صاحب کی تحریر کا وہ ابتدائیہ بڑی شدت سے یاد آرہا ہے، جو انھوں نے حزیں صدیقی صاحب کی کتاب "قفس رنگ" میں لکھا ہے۔ جو کیفیت ان کی حزیں صدیقی کی شاعری پر لکھتے وقت ہوئی، اس سے کہیں زیادہ میں مضطرب ہوں۔ چاہتا ہوں کہ عاصی کرنالی صاحب کی تحریر کا وہ ابتدائیہ آپ بھی پڑھیں اور اس کے پس منظر میں میری بیچارگی سے نہ صرف لطف اندوز ہوں، بلکہ ایک منارۂ علم و دانش پر مجھ جیسے جبتدی کے بے ربط جملوں کو محل نظر کرتے ہوئے اس جذبۂ عقیدت کو مدِ نظر رکھیں، جس کا عکس میری اس تحریر میں چھپا ہوا ہے۔

عاصی کرنالی "قفس رنگ" میں لکھتے ہیں:

> "قارئین! وقت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ مجھے ایک سمندر کے سامنے کھڑا کر دیا گیا ہے ـــ تند و تیز، عمیق اور بیکراں سمندر اور مجھے حکم ملا ہے کہ اس کو عبور کرو اور مجھے کاغذ کی ایک ناؤ عطا کی گئی ہے کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا ـــ چنانچہ بسم اللہ مجریہا و مرسہا پڑھتا ہوں اور کاغذ کی ناؤ کو قلم کے چپو سے حرکت دیتا ہوں اور بحرِ ذخار و مواج و بے پایاں و ناپیدا کنار کے حوالہ کرتا ہوں۔"

قارئین محترم! میں بھی اس کٹھن، دشوار گزار اور اہمی حیثیت و مرتبہ سے

بلند کام کرنے کے لیے "نصر من اللہ وفتح قریب" پڑھتا ہوں۔

چل میرے خامے ! بسم اللہ

مولانا محمد باقر شمس صاحب ہمہ صفت وہمہ جہت شخصیت کے حامل ہیں۔ میں نے انھیں سب سے پہلے "طلوع افکار" کے دفتر میں منعقدہ ایک مشاعرہ میں آج سے دس سال قبل دیکھا تھا اور اسی زمانہ سے ان کی علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی تحریریں "طلوع افکار" میں پڑھتا رہا۔ میں خاص کر ان کی تنقیدی تحریروں سے بہت متاثر ہوا ہوں، کیونکہ بقول ساحر لکھنوی:

> "مولانا نے "شعور و شاعری" میں کسی بڑے نام سے مرعوب ہوئے بغیر جس طرح انیس، غالب اور فیض ایسے شعرا کے کلام کا جائزہ لیا ہے اور ان پر اصلاحات دی ہیں، وہ کسی معمولی صلاحیتوں کے شاعر، نقاد اور استاد کے بس کی بات نہیں۔ اصلاح دینا تو کوئی بڑی بات نہیں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ اصلاح کے بعد شعر کا حشر کیا ہوا۔ کیا شعر اصلاح کے بعد بلند یا بلند تر ہو گیا یا اصلاح دینے والے نے اس کی مٹی پلید کر دی۔"

اور میں نے دیکھا کہ "شعور و شاعری" میں مولانا نے واقعی جس شاعر کے شعروں پر اصلاحات دی ہیں، وہ شعر اپنے اصل معیار سے کہیں زیادہ بلند ہو گئے ہیں اور اس طرح مجھے مولانا کی ژرف نگاہی پر ایمان لانا پڑا۔ ایک دن قدرت بھی مہربان ہو گئی اور مولانا نے ازراہِ کرم مجھے اپنی بیشتر تصانیف عنایت کیں۔

میں نے پہلی فرصت میں مولانا کی کتاب "شعور و شاعری" کا مطالعہ شروع کیا تنقیدی مضامین سے قبل میرے لیے مولانا کا مقدمہ زیادہ اہم تھا، جس کے ذریعہ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ آخر مولانا کس پیمانہ سے شعرا کے کلام کو ناپتے اور کس کسوٹی پر شعر کو پرکھتے ہیں۔ "شعور و شاعری" کے مقدمہ کا نام مولانا نے "معیارِ شعر

و شاعر " رکھا ہے ۔ مولانا نے طریقۂ کار کا اصلاحی نام " فن " بتایا ہے اور اس فن کی قسمیں بھی بیان کیں ہیں ۔ شعر کو فنون لطیفہ کبریٰ میں جگہ دی ہے ۔ یقیناً فنون لطیفہ کبریٰ میں اول درجہ شاعری ہی کا ہے ، بعد میں مصوری ، موسیقی ، تعمیر ، مجسمہ سازی اور نقاشی آتے ہیں ۔ شعر کی تعریف میں لکھتے ہیں:

" شعر فنون لطیفہ کبریٰ میں ہے ۔ اس کے معنی سمجھنا اور سمجھا جانا ہے ۔ مفہوم وہ ، جو اپنے الفاظ کا محتاج ہے ۔ اگر سلسلۂ الفاظ میں کوئی لفظ غلط ہے تو معنی مجروح ہو جائیں گے اور کبھی ممکن ہے کہ بالکل ہی سمجھ میں نہ آئیں ۔ اس میں غلطی کی چار صورتیں ہیں : (۱) صرفی (۲) نحوی (۳) روزمرہ اور محاورہ اور (۴) بے محل صرف ۔ بے محل صرف کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ اگر کوئی لفظ صحیح معنوں میں صرف ہوا ہے ، مگر اس سے بہتر لفظ وہاں آ سکتا ہے تو یہ فنی غلطی نہیں ، انتخابِ الفاظ میں کوتاہی ہے ، جس سے بلاغت میں کمی ہو سکتی ہے ۔ "

اس تعریف کے بعد مولانا ایک جگہ لکھتے ہیں کہ شاعری میں الفاظ کی مرصع کاری ہی سب کچھ ہے ۔ اس صلاحیت کی کمی لفظ و معنی میں کس کس طرح خرابی پیدا کرتی ہے ، اس کی بہت سی مثالیں مولانا نے " شعور و شاعری " میں دی ہیں ۔ مولانا کا زیادہ زور دو لفظوں میں عطف کے استعمال پر ہے ، جو اگر قاعدہ کی رو سے بالکل صحیح ہو ، مگر ذوقِ سلیم پر گراں گذر رہا ہو ۔ جیسے " جگر و اصغر " میں جو روانی ہے ، وہ " اصغر و جگر " میں نہیں ، " شعور و شاعری " میں جو سلاست ہے ، وہ " شاعری و شعور " میں نہیں ۔ بالفاظِ دگر شاعری میں صحیح الفاظ کا استعمال بھی اگر ذوقِ سلیم پر گراں گزرے تو ایسا صرف شعور کی کمی سے ہوتا ہے ۔ شاعری بغیر شعور کے نہ پختہ ہے اور نہ مکمل یہ معیار مولانا کا اپنا رائج کردہ نہیں ہے ، بلکہ بقولِ مولانا:

"ہر زمانہ میں شعر و شاعر کو جانچنے کا یہی معیار رہا ہے اور اس معیار سے شعر کو پرکھنے والے سخن سنج، نکتہ رس و نقادِ فن سمجھے گئے ہیں ۔"

مولانا نے بھی اسی معیار کی کسوٹی پر شعرا کے کلام کو پرکھا ہے اور ان کے اشعار پر جو اصلاحیں دی ہیں، ان اصلاحوں سے واقعی اشعار میں وہ تمام نقائص دور ہو گئے، جن کی وجہ سے شعر درست ہوتے ہوئے بھی مخلِ وضاحت تھے ۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی "شعور و شاعری" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں

"۔ شعور و شاعری میں فن شاعری کے ان اٹل اور دائمی و بنیادی اصولوں کے تحت مختلف قسم کی شاعری کو پرکھا گیا ہے، جن سے اختلاف تو ہو سکتا ہے، بغاوت بھی کی جا سکتی ہے، مگر جنھیں فراموش کر دینے سے شاعری کا اپنی صحیح راہ سے ہٹ کر برباد ہو جانا لازمی ہو جاتا ہے ۔ اس وقت جبکہ اردو شاعری زیادہ سے زیادہ انھیں بھولنے ہی کو تیار نظر آ رہی ہے، جس کے نتیجے میں وہ بالکل بے اثر اور بے معنی ہوتی جا رہی ہے، ان اصولوں کی طرف توجہ دلا کر، انھیں برت کر دکھا کے شمس صاحب نے اردو کی بڑی خدمت انجام دی ہے ۔"

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا ارشاد بجا ہے کہ مولانا نے "شعور و شاعری" میں اپنے زاویۂ نظر سے جس طرح شعرا کے کلام کو پرکھا ہے، اس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور بغاوت بھی، مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا مولانا نے اپنی اصلاحوں سے کوئی اختلاف کا پہلو وا رکھا ہے ۔ رہا سوال بغاوت کا تو یہ ممکن ہے، کیونکہ بقول سردار جی "جب میں کوئی بات تسلیم ہی نہیں کروں گا تو ہاروں گا کیسے ۔" اس قول کے مصداق ہر وہ شخص جس کے کلام میں شعوری خامیاں پائی جائیں گی ۔ اگر ان کو

درست کر دیا جائے اور وہ پھر بھی اس درستی کو تسلیم نہ کرے تو کوئی ان کا کیا بگاڑ سکتا ہے ۔ ہاں اختلاف کی گنجائش کے کئی پہلو نکل سکتے ہیں ، مگر ان پہلوؤں میں بھی جان نہیں ہو گی ، اگر چہ لاکھ دلیلیں دی جائیں اور بیشمار اشعار سند کے طور پر پیش کیے جائیں ، کیونکہ مولانا نے اختلافات اور بغاوت کے راستہ میں ایسی دیوار کھڑی کر دی ہے ، جسے کوئی اہل علم محض جوش رقابت سے گرانا بھی چاہے تو گرا نہ سکے ، البتہ جوش جہالت سے ایسا ممکن ہو سکتا ہے ، کیونکہ مولانا جب کسی نامی گرامی شاعر کے کلام پر تنقیدی و اصلاحی مضمون سپرد قلم کرتے ہیں تو آخر میں ان کے مضمون کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے : "بندۂ ناچیز شمس" ۔ گویا "ذرۂ ناچیز" لکھ کر مولانا کسی سے چھیڑخانی نہیں کرتے ہیں بلکہ حقیقت میں ان کی عاجزی و انکساری یہی ہوتی ہے کہ اگر شعرائے کرام صرف لفظ و بیان ہی سے نہ کھیلیں بلکہ اپنے ان الفاظ کے مجموعہ کی ترکیب و تہذیب کو شعور کی کسوٹی پر ہی پرکھ لیں تو شاعری مرصع کاری کا نمونہ بن جائے گی ۔ گویا مولانا کا سارا زور مرصع کاری پر ہے اور اس صلاحیت کی کمی کی وجہ سے شعرا کے کلام میں لفظ و معنی میں جس جس طرح کی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں ، انھی خرابیوں کی نشاندہی اور درستی پر مشتمل کتاب کا نام "شعور و شاعری" ہے ۔

"شعور و شاعری" میں مولانا نے انیس کے ایک شعر کو بے معنی قرار دیا ہے جبکہ دیگر اہل قلم نے اس شعر کی اپنے فہم و ادراک کے مطابق تشریح کی ہے ۔ بقیہ مضمونوں میں غالب کے شعر پر نیاز فتحپوری کی اصلاح پر تنقید ہے ، حضرت داغ دہلوی کی کتاب "مہتاب داغ" ، علامہ اقبال کی "بال جبریل" ، جگر مراد آبادی کی "شعلۂ طور" ، ماہر القادری کی "ذکر جمیل" اور فیض احمد فیض کی "نقش فریادی" پر تنقیدی جائزہ ہے ۔ علاوہ کلام فانی ، غزلیات اصغر ، ابن انشا ، میراجی وغیرہ کے کلام پر بھی مولانا نے تنقیدی نظر ڈالی ہے ۔

"شعور و شاعری" ایک نہیں ، کئی لحاظ سے منفرد ، دلچسپ اور عالمانہ حیثیت کی کتاب ہے ۔ اگر چہ اس نوعیت کی کئی کتابیں ماضی میں بھی لکھی گئی ہیں اور حال

میں بھی، مگر اس کتاب کی انفرادیت اس لیے مسلم ہے کہ یہ ایک صاحب بصیرت، ماہر لسانیات اور اہل نظر کی تصنیف ہے، مگر ایسے جید اہل قلم نے بعض جگہ بڑے فالسانہ انداز سے تنقید کی ہے اور ایک مدت کی ریاضت کو بیک جنبش قلم رد کر دیا ہے۔ مثلاً فانی کے ابتدائی غزلوں کے اشعار پر مولانا نے تنقید بھی کی ہے اور اصلاح بھی دی ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں:

"اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی بھر شعر کہتے رہے اور کلام میں پختگی پیدا نہیں ہوئی۔ ایسی صورت میں ان کو میر و غالب کا ہمسر کہنا کتنی نافہمی ہے!"

مولانا اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ دنیا میں عزت و احترام اور شہرت و مرتبہ من جانب اللہ ہوتے ہیں۔ کوئی شخص خود سے عالم میں نامور یا معزز نہیں بن سکتا۔ ایک عالم اس کے علم و فضل کا معترف ہوتا ہے اور اسے عزت و احترام کے بلند مرتبہ پر فائز کرتا ہے اور مولانا اس امر سے بھی واقف ہیں کہ دنیا میں کوئی کتنا ہی عالم و فاضل ہو، مکمل کبھی نہیں ہوتا، کیونکہ انسان کامل صرف اور صرف رسول کی ذات ہے۔ ہر بڑے سے بڑا اور مشہور سے مشہور شخص بھی اپنی ذات میں خامیاں رکھتا ہے، لہذا کسی مشہور و معروف شخص کی تمام افضلیت کو بالائے طاق رکھ کر اس کی خامیوں کی نشاندہی کر کے اسے قعر مذلت میں ڈھکیل دینا، انتہائی نامناسب رویہ ہے۔ مولانا نے خود اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے فانی کی ابتدائی غزلوں سے چند اشعار منتخب کر کے ان کی اصلاحیں کیں ہیں اور انھی ابتدائی غزلوں سے مولانا نے فانی کی پوری شاعری اور ان کی اردو ادب میں خدمات کو اپنے دو جملوں سے رد کر دیا ہے۔ فانی کے کلام میں جو آفاقیت نظر آتی ہے، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے اشعار مختلف اور متنوع موضوعات پر ہیں اور ان کے کلام میں گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ساتھ انسانی فضا کا احساس بھی ہے، کیونکہ ان کی غزلیں تمام تر انفرادی

کیفیات اور شخصی واردات پر مشتمل ہیں ۔ ان کے کلام میں جو یاسیت ہے ، اس یاسیت میں زندگی کے بعض بنیادی حقائق بھی ملتے ہیں ۔ فانی کے یہاں صرف غم ہی نہیں ہے ، غم کا ایک فلسفہ بھی ہے اور فانی نے اسی فلسفہ سے غزلوں میں ایک عظمت پیدا کی ہے ۔ بات بہت طویل ہو جائے گی ۔ میں فانی کے چند اشعار مولانا کے ملاحظہ کے لیے پیش کرتا ہوں ۔ یہ مختلف اشعار ہیں ، جو اپنے متنوع موضوعات لیے ہوئے ہیں :۔

فانی کو یا جنوں ہے یا تیری آرزو ہے
کل نام لے کے تیرا دیوانہ وار رویا

پھر ابر میں وحشت کی تصویر نظر آئی
لہراتی ہوئی بجلی ، زنجیر نظر آئی

پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے ، مگر اتنا
جب ذکر بہار آیا ، سمجھے کہ بہار آئی

دل ان کے نہ آنے تک لبریز شکایت تھا
وہ آئے تو اپنی ہی تقصیر نظر آئی

مولانا محمد باقر شمس اور ان کے علم و فضل پر ملک اور بیرون ملک کے بہت سے مشاہیر ادب نے بڑے بھرپور مضامین لکھے ہیں اور انھیں ادب کے ہر محاذ پر خراج تحسین پیش کیا ہے ، مگر بیشتر مدح خواہ مولانا کی مدح خوانی میں یہ بھول گئے کہ مولانا جتنے بلند پایہ نقاد ہیں ، اس سے کہیں کم سطح کے بھی شاعر نہیں ہیں ۔ حسین انجم صاحب نے " طلوع افکار " کے گوشۂ مولانا محمد باقر شمس اپریل ۹۲ء میں اپنے مضمون " خاندان اجتہاد کی ادبی یادگار " میں مولانا کی شاعرانہ صفت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے :

> "مولانا کے اشعار اور ان کی نثر، دونوں، میں غیر معمولی جمالیاتی ذوق کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔"

اور اپنی بات کو مدلل بنانے کے لیے مولانا کے مضمون "کچھ اپنے بارے میں بھی" (شعور و شاعری) سے وہ ٹکڑا پیش کرتے ہیں، جس میں مولانا نے اپنے جمالیاتی ذوق کا ذکر محض ایک سامع اور سخن فہم کے طور پر کیا ہے۔ بعینہٖ اس شمارہ میں ساحر لکھنوی نے "محقق یگانہ" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے، اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "ان کے کلام میں بہت سے زندہ رہنے والے اشعار مل جائیں گے۔ ان کی شاعری فکر و فن، دونوں، کا دلکش مرقع ہے، مگر انھوں نے شاعری کو ایک مستقل مشغلہ کے طور پر اختیار نہیں کیا۔"

ساحر لکھنوی کا مولانا کے بارے میں یہ بیان جہاں بحد عقیدت و محبت کا مظہر ہے، وہیں ان کا یہ بیان اہل علم کو بہت کچھ سوچنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ مولانا کی شعر فہمی بڑی زبردست ہے، پلک جھپکتے میں مولانا شعر کے معائب تک پہنچ جاتے ہیں اور اس شعر کی اصلاح بھی لحہ بھر میں کر دیتے ہیں، مگر یہ کہنا کہ مولانا کو شعر گوئی میں نہایت قوی ملکہ حاصل ہے، کچھ عجب سا ہے، کیونکہ اگر ان کا کلام زندہ رہنے والا ہوتا، اگر ان کی شاعری فکر و فن کا دلکش مرقع ہوتی تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ مولانا ایسی اعلا و ارفع شاعری کو مستقل مشغلہ کے طور پر نہ اپناتے۔ دراصل کسی کی مدحت سرائی مدح خواہ کو اتنا سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتی کہ وہ ذہن رسا سے کام لے سکے، کیونکہ اس کے نزدیک ممدوح پیکر نور ہوتا ہے اور نور، سراپا شفاف۔

اب ذرا دیکھیے کہ اپنی شاعری پر خود مولانا کیا فرماتے ہیں۔ ان کی تحریر کا یہ ٹکڑا ان کی کتاب "شعور و شاعری" کے آخری مضمون "کچھ اپنے بارے میں بھی" سے ہے۔ لکھتے ہیں

"شاعری میری گھٹی میں پڑی ہے۔ آنکھ کھول کے میں نے شاعری دیکھی اور ہر طرف شاعری میں گھرا ہوا تھا۔ سات، آٹھ برس کے سن سے شعر سمجھنے اور چودہ، پندرہ برس کے سن تک پہنچتے پہنچتے شعر کہنے لگا اور یہ میرا محبوب مشغلہ بن گیا۔ اتنے شعر کہے کہ ایک دیوان مرتب ہو سکتا تھا۔"

چند جملوں کے بعد لکھتے ہیں

"اپنے کلام کا جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ میرے اشعار چست و درست ہیں، مگر باکمال مضامین کو فرسودہ طریقہ سے نظم کرتا ہوں کوئی تازگی نہیں، کوئی انفرادیت نہیں۔ میں کبھی ایسا شاعر نہیں بن سکتا، جو صاحب طرز ہو اور کوئی امتیاز حاصل کر سکے۔ خدا نے مجھ کو شاعر نہیں بنایا ہے۔ میری شاعری ادب میں کوئی اضافہ نہیں اپنے کو شاعر سمجھنا خود کو دھوکا دینا ہے اور شعر کہنا وقت کو ضائع کرنا ہے۔ میں نے فوراً شعر کہنا چھوڑ دیا۔"

اتنا بڑا سچ اور اتنی بڑی صداقت کے ساتھ ببانگ دہل اپنے بارے میں اظہار خیال کرنا، اہل ظرف ہی کا کام ہوتا ہے اور مولانا واقعی اہل ظرف میں سے ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ انسان خود اپنا احتساب کرے اور پھر اپنے اصل میلان طبع کی طرف توجہ کرے۔ شرط صرف احتساب ذات کی ہے

تو اگر چاہے احتساب اپنا
تیرے اندر بھی اک عدالت ہے

اگر مولانا شمس کا شعری سرمایہ فکر و فن کی بلندیوں پر ہوتا تو آج مولانا نقد و نظر کے اتنے بلند مقام پر نہیں ہوتے۔ دراصل قدرت نے مولانا کو جو ژرف نگاہی بخشی ہے اور جس فہم و ادراک سے نوازا ہے، اس کا تقاضا یہی تھا کہ بجائے دوسرے

شعرا کی طرح ہدف تنقید بننے کے، کیوں نہ اصلاح شعر پر توجہ دی جائے ۔ لہٰذا انھوں نے یہی کیا، جو انھیں کرنا تھا ... اگرچہ ان کے اس منصفانہ اعتراف کے جواب میں حسین انجم صاحب نے ان کی کتاب " نگارشات رنگ رنگ " میں درج ذیل فٹ نوٹ لکھا:

" اگر اس جذبۂ خود احتسابی اور حقیقت پسندی کی ذرا سی رمق دوسرے حضرات میں بھی پیدا ہو جائے تو دنیائے شعر ان جملہ مزخرفات سے محفوظ ہو جائے گی ، جو آئے دن شعر کے نام پر کہے ، پڑھے اور چھاپے جا رہے ہیں ۔"

مگر حسین انجم صاحب بھی کیا کریں ۔ اتنا سب کچھ پڑھنے اور سمجھنے کے باوجود بھی حسین انجم صاحب کا " طلوع افکار " دنیائے شعر کے ان مزخرفات سے بچ نہیں سکا ہے جن سے حسین انجم صاحب انتہائی کبیدہ خاطر ہیں ۔ دراصل ایسا ممکن بھی نہیں ہے جیسا کہ میں نے اس مضمون میں کہیں لکھا ہے کہ ہر انسان کامل نہیں ہو سکتا ۔ اسی طرح وہ اپنے کسی بھی عمل میں یکتا و بے عیب بھی نہیں ہو سکتا ۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ان کے محاسن کی تعریف کی جائے اور ان محاسن کو منظر عام پر لایا جائے ۔ معائب کی نشاندہی شرط اولین ہے ، مگر صرف تصویر کا ایک رخ دیکھنا دانشمندی نہیں ہے ۔ " شعور و شاعری " میں جب مولانا نے اپنے بارے میں انتہائی سچ لکھا تو ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے اس سچ کے جواب میں جو مختصر سا بیان دیا ہے ، وہ ملاحظہ فرمائیے:

" یہاں جو بات کہی گئی ہے ، وہ مصنف کی ذات سے خاص طور پر تعلق رکھتی ہے ۔ ان (مولانا) کا شاعری ترک کر دینا اور اس سلسلہ کا استدلال محض ذاتی فیصلہ ہے ، جس کا دوسروں سے تعلق نہیں ۔ اس کے معنی ہرگز نہیں کہ تمام شاعر شاعری ترک کر دیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ جتنے زیادہ لوگ شاعری کرتے جائیں گے، اتنا ہی
قومی سطح پر شاعری کو فروغ ہوتا رہے گا۔ قارئین سے درخواست ہے
کہ وہ شمس صاحب کی رائے پر غور کریں اور اس کے بعد اپنے عمل
پر خود فیصلہ کریں۔

اس قدر جامع اور صائب رائے کے بعد مزید میرے لیے خامہ فرسائی کرنا قطعی مناسب نہیں ہے، لہٰذا میں مولانا سے اس لن ترانی پر معذرت چاہتے ہوئے اجازت لیتا ہوں۔

جنابِ شاداں دہلوی

نذرِ عقیدت

دلنشیں ہے اس قدر تحریر باقر شمس کی
بن گئی ہر لفظ میں تصویر باقر شمس کی

اصل اردو کے کئی گوشے اجاگر ہو گئے
خواب ہے تاریخ کا تعبیر باقر شمس کی

واقفِ رازِ شعور و شاعری اس دور میں
اک چراغِ راہ ہے تنویر باقر شمس کی

ہے قلمرو میں ادب کے جس قلم کا اقتدار
وہ قلم ہے آج بھی جاگیر باقر شمس کی

دیکھنا چاہے جو تصویرِ شبابِ لکھنؤ
دیکھ لے وہ اک نظر تحریر باقر شمس کی

کھینچتا ہے دل کو اندازِ نگارش خود بخود
منفرد ہے قوتِ تسخیر باقر شمس کی

ان کو نظم و نثر پر حاصل ہے یکساں دسترس
ہے عظمت ، بھی توقیر باقر شمس کی

دورِ آزادی میں بھی پابند ہے اخلاق کا
ہے قلم کے پاؤں میں زنجیر باقر شمس کی

فلسفہ ، منطق ، ادب ، تاریخ ، قرآن اور حدیث
ہے ہر اک عنوان پہ تحریر باقر شمس کی

ان کی ہر تصنیف نے پایا ہے اعزازِ قبول
کس قدر ہے اوج پہ تقدیر باقر شمس کی !

دیکھ کر اسلام زیرِ کوہِ قرآن و حدیث
دیکھتے ہیں لوگ جوئے شیر باقر شمس کی

یہ ہیں ناموسِ ادب کے پاسباں اس دور میں
کارگر ہے کوشش تطہیر باقر شمس کی

یہ ہیں فخرِ خاندانِ حضرت غفرانمآب
علمِ دیں ہے مستقل توقیر باقر شمس کی

ناز کرسکتا ہے جس پہ خاندانِ اجتہاد
وہ ہے ، شاداں ! جرأتِ تحریر باقر شمس کی

جناب پروفیسر سردار نقوی

منظوم خراجِ عقیدت

انسانیت کے حسن کی میزان علم ہے
ہے جو وقارِ خلق ، وہ انسان علم ہے

بابِ کتابِ عز و شرف ہیں جنابِ شمس
آئینۂ علومِ سلف ہیں جنابِ شمس

یہ خاندانِ علم کے چشم و چراغ ہیں
روشن ہے یہ نسب سے کہ روشن دماغ ہیں

اس دورِ بے جہت میں یہ ایسے ادیب ہیں
جو حرمتِ زبان و بیاں کے نقیب ہیں

ان کی نگاہِ شعر جو نازک شناس ہے
یہ وہ ہیں ، جن کو فن کے اصولوں کا پاس ہے

علمِ لسانیات پہ ہے ایسی دستگاہ
ہے جس کا اعتراف نہ کرنا بھی اک گناہ

میزانِ فکر میں جو مضامیں نئے تلے
علمِ لسانیات کے ابوابِ نو کھلے

تحریریں وہ لکھیں قلم انتقاد سے
محفوظ رکھ سکیں جو ادب کو فساد سے

تاریخ پر عبور کا عالم نہ پوچھیے
ہے فکر کتنی صائب و محکم نہ پوچھیے

اسلام پر جو وقت کے ہاتھوں گذر گئی
وہ بات یوں لکھی کہ دلوں میں اتر گئی

جو لفظ ، جو خیال سپردِ قلم کیا
تاریخ کو دلیل بنا کے رقم کیا

کیا کہیے ، ایک ذات میں کتنی جہات ہیں
گویا یہ اپنی ذات میں شہرِ صفات ہیں

جناب ساحر لکھنوی

نذرِ آبروئے شعر و ادب، گرامی مرتبت
جناب محترم مولانا سید محمد باقر شمس صاحب قبلہ مدظلہ العالی

قصر ادب و علم کے در روشن ہیں
آفاق ہنر شام و سحر روشن ہیں
تحقیق و تواریخ و زبان و تنقید
اک شمس سے کتنے ہی قمر روشن ہیں

سچ ہے کہ محقق یگانہ ہیں شمس
تحقیق کا بیمثل خزانہ ہیں شمس
کہتے ہیں جنھیں محمد باقر سب
اردو کا وہ اک تاج شہانہ ہیں شمس

دنیائے تمدن پہ کرم کرتے ہیں
تاریخ محبت کی رقم کرتے ہیں
جو شمس صفت ادب میں کرتے ہیں جہاد
وہ لوگ قلم ہی کو علم کرتے ہیں

کب مثلِ شعاعِ شمس اٹھایا نہ قلم
پیری نے بھی ہاتھوں سے چھڑایا نہ قلم
آنکھوں نے تو ضرور کی ہے طوطا چشمی
گرتی ہوئی صحت نے گرایا نہ قلم

اردو کی بقا کا عجب عنواں ہیں شمس
اس باغ کو پیغامِ بہاراں ہیں شمس
تحقیق ، ادب ، شاعری ، تنقید ، اصلاح
ایک فرد نہیں ، ایک دبستان ہیں شمس

کیا شمس ہیں ، کیا شمس کی تابانی ہے
اک ذات میں اوصاف کی ارزانی ہے !
اس دور میں دیکھا ہے جو ایسا انساں
آئینہ صفت آنکھ کو حیرانی ہے

اک شمس کے انوار میں کیا کیا دیکھا
شعر و ادب و علم کا چہرہ دیکھا
اک شخص میں تہذیب کی دنیا دیکھی
اک ذات میں تاریخ کا جلوہ دیکھا

سجع

علم و حکمت کی جان باقر شمس
عظمتوں کا نشان باقر شمس
خوب سجتا ہے سجع یہ ، ساحر !
علم کا آسمان باقر شمس

جناب اختیار حسین صاحب دل شمس آبادی ایڈوکیٹ

جذباتِ دل

شمس نقدِ سخن کا کوہِ گراں
طورِ معنی کا موسیٰ عمراں
کر دیے اس نے غرق نیل سخن
کتنے فرعونِ نقدِ بے ساماں

حضرتِ شمس سا نقادِ ادب
کون ہے آج تہ چرخ کہن
جس نے اس طرح معانی کی گرہ کھولی ہو
جس نے اس طرح سے سلجھائے ہوں گیسوئے سخن

علم دینِ نبوی کا دریا
علم تاریخ کا بحرِ ذخار
شمس کا ذوقِ سخن سنجی ہے
نقدِ اشعار کا اعلا معیار

شمس نے دین میں بھی کی ہیں نئی تحقیقیں
ادب و شعر میں ہیں ایک مسلم استاد
قاعدے فن میں نئے وضع کیے ہیں کتنے
کر دیا ایک نیا علم ادب میں ایجاد

ادب و شعر کا وہ ذوقِ کہن زندہ ہے
آج بھی شاید رعنائے سخن زندہ ہے
سب پہ کھل جاتا، دل! کھوٹے کھرے کا پردہ
شمس کی ذات سے تنقید کا فن زندہ ہے

ان کی ہے فکر و نظر درس حقیقت بینی
علم تاریخ و سیر اور علوم دینی
ان کے الفاظ ہیں آرائشِ گیسوئے سخن
سامنے جس کے خجل نقش و نگارِ چینی

جناب اقبال کاظمی

(سیکریٹری جنرل مرثیہ فاؤنڈیشن، کراچی)

ان سے علم و ادب کی عظمت ہے

حضرت شمس ہیں ادیب جلیل — آج ان کا نہیں ہے کوئی عدیل
ہے ہمہ گیر شخصیت ان کی — علم و دانش ہے مملکت ان کی
علم تاریخ ہو یا علم کلام — در پہ کرتے ہیں ان کے آ کے سلام
فن تاریخ پر ہے ان کی نظر — ہیں محقق یگانہ و برتر (۱)
نا مکمل ہر ایک ہے تحقیق — ان کی جانب سے گر نہ ہو تصدیق
کوئی شاعر ہو یا ادیب کوئی — ان کی قربت کا ہے تمنائی
نظم ہو، نثر ہو کہ ہو تنقید — رائے ان کی ہے سب پہ قابل دید
نثر میں ان کی اک روانی ہے — نظم اک دفتر معانی ہے
شاعری و شعور ہے وہ کتاب (۲) — ہے جو تنقید کا اصول و نصاب
ان کے زور قلم کا کیا کہنا — ہے اسی سے شکست آئینا (۳)
در منظوم میں کھلے جوہر (۴) — تبصرہ ہے کلام ناظم پر
بندے کاظم کا انتخاب کلام (۵) — شاعر خوشنوا کو ان کا سلام
دیکھیے تو نگارشات کا رنگ (۶) — ہے مضامین نو کا اک آہنگ
ان کی تحریر لکھنؤ پہ سند — کام اس شہر پر کیا بے حد
لکھی تاریخ لکھنؤ ایسی (۷) — نہیں ملتی کتاب اس جیسی
شاعری لکھنؤ کی اور تہذیب (۸) — یہ کتابیں ہیں کیا ہی خوش ترتیب
لکھنؤ کی زبان کا مذکور — عالم علم میں ہوا مشہور
لکھی اردو زبان کی تاریخ (۹) — فکر سابق کی جس نے کی تنسیخ
کر کے اس باب میں بڑی تدقیق — ارتقائے زباں پہ کی تحقیق
رنگ نو دے کے اس فسانہ کو — اک نئی فکر دی زمانہ کو

گزری اسلام پر جو ، وہ لکھ کر (۱۰)
روشنی ڈالی اس حقیقت پر

زندگی بھر قلم کی عظمت کا
دوش پر شمس نے علم رکھا

مذہب و علم و فن کی خدمت ہے
شمس کی زندگی عبادت ہے

یہ ہیں سبطِ حسین کے فرزند (۱۱)
ان پر مضموں نہیں ہے کوئی بند

عالم بے بدل تھے سبط حسین
پورے ہندوستاں کے دل کا چین

ہند کو ناز تھا اس اعلم پر
وہ تھے نایاب علم کے گوہر

باپ سے علم و فضل کی نسبت
کیوں نہ ہو ان کو باعثِ عزت

ان کا رتبہ بیان کیا ہو بھلا
یہ ہیں علم و ادب کا سراپا

پہلے جلسہ میں ان کی شرکت سے
معترف ان کی فاؤنڈیشن ہے (۱۲)

کاظمی حقیر و پر تقصیر
ان کے بارے میں کیا کرے تحریر

ان سے اردو کی شان و شوکت ہے
ان سے علم و ادب کی عظمت ہے

ہے خدا سے یہ کاظمی کی دعا
وہ کرے ان کو عمرِ خضر عطا

اہل علم و کمال پر دائم
ان کا سایہ خدا رکھے قائم !

(۱) "محقق یگانہ" کا خطاب سید العلما سید علی نقی صاحب قبلہ نے عطا فرمایا (۲) "شعور و شاعری" (۳) "شکستِ آئینہ" (۴) درِ منظوم (۵) بندے کاظم جاوید (۶) "نگارشاتِ رنگ رنگ" (۷) "تاریخ لکھنؤ" (۸) "لکھنؤ کی شاعری" اور "لکھنؤ کی تہذیب" (۹) "تاریخ زبان اردو" (۱۰) "اسلام پر کیا گزری" (۱۱) اعلم العلما علامہ سید سبطِ حسین صاحب قبلہ (۱۲) مولانا سید محمد باقر شمس کے مرثیہ فاؤنڈیشن کے پہلے تعارفی اجلاس اور مجلس مذاکرہ میں بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی طرف اشارہ ہے ۔

مولانا کی بعض کتابوں پر مشاہیر کے تبصرے

تاریخ لکھنؤ

جناب مکرم لکھنوی

(مدیر ماہنامہ "عکسِ لطیف")

برصغیر پاک و ہند کے مایہ ناز ادیب مولانا سید محمد باقر شمس نے لکھنؤ کی علمی اور تمدنی تاریخ کا جو سلسلہ "عکس لطیف" میں شروع کیا تھا، وہ باقساط پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ قارئین کرام نے جس قدر اس مضمون کو پسند کیا، اس کا اندازہ ادارہ کو تعریفی خطوط کی کثیر تعداد کے موصول ہونے سے ہوا۔ ہر صاحب ذوق اس تاریخ کی مکمل قسطوں کو محفوظ کرنے کا خواہشمند تھا۔ بیشتر شائقین ادب کے پاس یہ اقساط سرمایۂ ادب کی حیثیت سے محفوظ ہیں، لیکن صدہا ارباب ذوق ایسے ہیں، جن کے پاس اس سلسلہ کی کوئی نہ کوئی کڑی کم ہے اور وہ بار بار ادارہ کو خط لکھ کر مختلف یا مکمل قسطیں طلب کرتے ہیں۔ ہم اپنی اس کوتاہی پر معذرت خواہ ہیں کہ ان کی فرمائش پورا کرنے سے قاصر رہے۔

قارئین کے خلوص، طلب اور ہماری گزارش نے جناب شمس صاحب کو ان اقساط کے دوبارہ شائع کرنے پر آمادہ کرلیا ہے اور اب جناب موصوف نے نظرِثانی میں حذف و اضافہ سے ادب پارہ کو نئی جلا بخشی ہے۔ ادارہ جناب شمس کی اس نوازش کا شکر گزار ہے۔ جو تعریفی خطوط ہمیں موصول ہوئے، ان میں جناب مولانا سید مرتضیٰ حسین صاحب فاضل کا خط اس غرض سے پیش کیا جارہا ہے کہ وہ کتاب کی افادیت پر ایک بصیرت افروز تبصرہ ہے:

"عکس لطیف" جلوہ ریز ہوتا رہتا ہے۔ شکریہ! دسمبر ۱۹۷۰ء

اور ۱۹۷۱ء کے دونوں پرچے ملے ۔ میری مخلصانہ دعائیں اور حقیقت پسندانہ آفرین قبول فرمائیں ۔ "عکسِ لطیف" جس ادبی وقار کا ترجمان ہے اور یہ ماہنامہ جس محنت سے آپ مرتب کرتے ہیں، وہ لائقِ ہزار تحسین ہے ۔

گرامی منزلت جناب شمس صاحب قبلہ نے زبان و تاریخ ثقافتِ لکھنؤ پر جو طویل مطالعہ فرمایا ہے، اسے سب اہلِ نظر جانتے ہیں ۔ خدا آپ کے ادارہ کو پروان چڑھائے!

آپ نے جنابِ موصوف کے افادات کو شائع فرما کے تاریخ ثقافت پر احسان کیا ہے ۔ جناب شمس صاحب کی محققانہ کتاب دہلی اور دکن پر لکھی ہوئی بہت سی تالیفات پر برتری رکھتی ہے ۔ ادب، فن، رہن سہن، تاریخ وفیات، تذکرہ، اہلِ فن، اہلِ ہنر، علاقوں، قصبوں، شہروں اور متعدد پہلوؤں سے بحث و نظر کے لیے جو مختصر نتائجِ تحقیق بیان فرمائے ہیں، اس نے کتاب کو جامع اور بےحد کارآمد بنا دیا ہے ۔

صاحبانِ ذوق، اربابِ تحقیق اور تاریخ کے طلبا اور ادب و ثقافت پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب مطالعہ کے نقطۂ نظر سے فکر انگیز ہے اور معلومات کے زاویۂ نظر سے مختلف مقامات پر حوالہ کی کتاب ہے ۔

میری طرف سے مولانا کی خدمت میں تسلیم عرض کریں ۔ میں اس نادر تحفہ کے ارسال پر آپ حضرات کا ممنون ہوں ۔"

جناب ڈاکٹر احسن فاروقی
(ڈین آف فیکلٹی آف بلوچستان یونیورسٹی)

مولانا سید محمد باقر شمس صاحب کی ہستی سے علمی اور ادبی طور پر مستفیض ہونے والوں میں، میں اپنا شمار کر کے فخر کرتا ہوں ۔ موصوف نے جو اضافے تاریخ، علم دینیات اور ادب میں کیے ہیں، وہ سب کے لیے فیض رساں ہیں ۔ زیرِ نظر کتاب میں انھوں نے ایک ایسا اہم کام انجام دیا ہے، جو ہماری تہذیب اور کلچر کی تاریخ میں اہم رہے گا ۔ لکھنؤ کا نام آتے ہی ہمارے سامنے ایک نہایت حسین و دلکش تہذیب کا نقشہ کھنچتا ہے ۔ نوابان اودھ، جو بعد میں شاہان اودھ کہلائے، کا دور اندرونی اور بیرونی جھگڑوں سے بری ہونے کی وجہ سے عجیب دور تھا، جس میں وہ ساری تہذیب جو مسلمانوں کی آمد سے لے کر سلطنتِ مغلیہ کے زوال تک دلی میں ارتقا کرتی رہی لکھنؤ میں آکر ایک خاص نکھار پر پہنچی ۔ سرسید احمد خان اور ان کے پیروؤں نے اس تہذیب کو تخریب کا نام دیا اور اس لیے اس کی طرف سے ایک تعصب قائم ہوگیا، جس کی بنا پر اس کی خوبیوں کی طرف عام لوگوں اور مورخوں نے دیکھنے سے انکار کیا شمس صاحب اس تہذیب کی زندہ تاریخ ہیں ۔ یہ ان کے خاندان اور ماحول کی چیز ہے اور انھوں نے اس کے حالات اس ہمدردی کے ساتھ لکھے ہیں، جو اس کی خوبیاں نمایاں کر سکتی ہے ۔ اس کتاب کو پڑھ کر ہماری آنکھوں کے سامنے سے تعصب کی عینک اتر جاتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ سرزمین اودھ نے ایسے خوبصورت پھول لگائے تھے، جن کی دنیا کی ہر تہذیب خوشہ چیں ہو سکتی ہے ۔

اس کتاب کی تعجب انگیز صفت اس کی وسعت و گہرائی ہے ۔ یوں تو عام تاریخ کی طرح اس میں بھی بادشاہوں کے ناموں کی سرخیاں ہیں اور حالات انھیں کے ماتحت لائے گئے ہیں، مگر بادشاہوں کے حالات سے زیادہ علمی، ادبی، مذہبی، دستکارانہ اور سپاہیانہ سرگرمیوں کے حالات نہایت دلکش طریقہ پر بیان ہوئے ہیں ۔ مصنف موصوف عالم اور علمائے دین کے خاندان سے ہیں، مگر موسیقی اور اس کے سلسلہ کے وہ سب کارنامے، جنھوں نے اودھ دربار کو راجا اندر کا اکھاڑا بنا دیا تھا، ان کی نظر میں ہیں اور وہ مختلف راگوں اور راگنیوں کے بیان میں بھی ویسی ہی

وضاحت سے کام لیتے ہیں، جیسی ادبی یا علمی امور کے بیان میں ۔ ہم اس کتاب کو لکھنؤ کی انسائکلوپیڈیا کہہ سکتے ہیں اور اسی طرح استعمال کر سکتے ہیں ۔ مولوی عبد الحلیم شرر نے بھی اس موضوع پر کافی لکھا ہے اور ان کے حوالے، شمس صاحب نے دیے ہیں، مگر شمس صاحب کی کتاب شرر صاحب کی تمام تصانیف سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور اسی لیے ہم اسے لکھنوی تہذیب کا آخری نقطہ کہہ سکتے ہیں ۔

کتاب کو پڑھنے سے بڑے بڑے انکشاف ہوتے ہیں اور عام معلومات کی صحت ہوتی ہے ۔ مثلاً واجد علی شاہ اختر کا ہمارے ذہن میں انگریزوں کے پروپیگنڈے سے جو تصور بنتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ عیش پرستی میں ہر وقت محو تھے، عورتوں کے ساتھ ناچنے کے سوا ان کا کوئی کام نہ تھا ۔ شمس صاحب شرر کے حوالہ سے تصدیق کرتے ہیں:

"مٹیا برج کے واجد علی شاہ کو میں نے آنکھوں سے دیکھا ہے وہ اتقا اور پرہیزگاری و خداترسی اور خداپرستی کی مجسم تصویر تھے ۔"

راجا درگا پرشاد کے حوالہ سے بتاتے ہیں:

"ان کا سا کوئی بادشاہ علوم و فنون کی ایسی جامعیت کے ساتھ ہند کی سرزمین سے نہیں اٹھا اور اس فضل و کمال کے کسی فرمانروا نے ہندوستان کی فضا میں علم بادشاہی بلند نہیں کیا ۔"

(ماہنامہ "عکس لطیف")

اس ("لکھنؤ کی شاعری") میں بہت سی نئی باتیں بھی ہیں، جو اب تک کسی کے علم میں نہ تھیں ۔ مثلاً: اہل لکھنؤ کی مادری زبان، لکھنؤ کی ادبی زبان، لکھنؤ کی ٹکسالی زبان، ٹکسالی زبان کے معنی وغیرہ ۔ (اقتباس از مقدمہ "لکھنؤ کی شاعری")

سید محمد تقی

مولانا سید محمد باقر شمس صاحب اردو کے مقبول مصنفین میں شامل ہیں۔ ان کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں۔ "اسلام پر کیا گزری" چوتھے ایڈیشن میں چھپی ہے۔ ان کی اور کتابیں بھی قلیل تر عرصہ میں فروخت ہوگئیں۔ ہر چند کسی مصنف کی مقبولیت ادبی درجہ کا تعین نہیں کرتی بلکہ برعکس اس کے بعض کلاسیکی اہل قلم تو اس قدر عمض نواز ہیں کہ ان کے خیال میں اچھی کتاب کی اچھائی کا پیمانہ اس کی نامقبولیت ہی ہوتی ہے، لیکن باقر شمس صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ مستند اور بلیغ انداز بیان کے باوجود ابلاغ مفاہیم کا حیرت انگیز فن جانتے ہیں، جو اس کامیابی کا سبب ہے۔

ان کی تازہ تر تصنیف "تاریخ لکھنؤ" ہے۔ ہمارے یہاں یہ رواج نہیں کہ کتاب کی اشاعت سے پہلے چند قلمکاروں کو مسودات دکھا دیے جاتے ہیں، جو اکثر حالات میں اشاعت سے قبل تبصرے بھی شائع کر دیتے ہیں اور یوں آنے والی کتاب کے لیے پہلے سے قارئین میں انتظار کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ لیکن میرے لیے یہ بات اس نئی کتاب کی اہمیت جتانے کے لیے کافی ہے کہ اس کے مصنف جناب محمد باقر شمس صاحب ہیں، جنھوں نے لکھنؤ کی تہذیب پر جو کچھ اب تک لکھا ہے، وہ تحقیق اور ریسرچ کے شاندار کارنامہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

لکھنؤ نفاست اور تہذیب کے ایک اعلا نمونہ کے طور پر ثقافتی علامت کا درجہ رکھتا ہے۔ تہذیب مآل کار افراد کی "انا" کے احترام کا نام ہے۔ کلچر پاکیزگی احساسات اور گہری انسان دوستی سے عبارت ہے، جس میں نفرت اور منفیت کا عنصر موجود نہ ہو۔ مادی ذرائع مسرت بجائے خود کلچر کے اجزائے ترکیبی نہیں ہوتے۔ البتہ ان کا متوازن استعمال، جس کے پس منظر میں متانت، سنجیدگی اور اعلا تہذیبی

اقدام کا احترام موجود ہو، ثقافت کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔ متانت، مزاج اور شرافتِ کردار، حکمت یا وزڈم سے پیدا ہوتا ہے، جس کے لازماً یہ معنے ہوئے کہ عقلیت کا پس منظر موجود ہو تو بڑی تہذیب جنم لیتی ہے، اور عقلیت کے پس منظر کی موجودگی کے معنی پھر یہ بھی ہیں کہ خیال و نظر کی مکمل آزادی اور تنقید و تجسس کے گوشے کھلے رکھے جائیں اور اختلافات کے حق کا احترام پوری طرح موجود رہے۔ ول دوان نے اپنی "تاریخ تہذیب" میں لکھا ہے کہ انقلاب سے پہلے کے فرانس میں جو معاشرہ ابھرا تھا، وہ اپنی آزادی اور تہذیبی ترقی کے اعتبار سے بیمثال درجہ رکھتا تھا۔ اگر ول دوان کو لکھنؤ کے تہذیبی ارتقا کا علم ہوتا تو وہ اس اعتراف سے نہ ہچکچاتے، جس کا لکھنؤ حقدار ہے۔ میں نہ ول دوان کی رائے سے پوری طرح متفق ہوں، نہ اس بات کا مدعی کہ لکھنوی تہذیب پوری تاریخ میں بیمثال تھی، اس لیے کہ اس تعمیم میں افلاطون، ارسطو اور سوخاک لیز کے یونان اور قدیم ہندوستان اور چین کے بعض معاشروں کو نظرانداز کر دیا جائے گا، جو جائز نہیں ہے۔ مولانا شمس نے لکھنؤ کے اس معاشرہ کو جس بڑے کینوس میں رکھ کر دیکھا ہے، اس کے لیے طویل تر اور مسلسل مطالعہ او سوشیالوجیائی جزئیات بینی کی جس صلاحیت کی ضرورت ہے، وہ بہت کم مبصرین میں پائی جاتی ہے۔ زبان کی تحقیق، مطالعہ اور ادب کے وسیع تر دائرہ کے گوشوں پر ان کی جو نظر ہے، وہ شاید ہی کسی دوسرے اردو اہل قلم کے حصہ میں آئی ہو۔

عام اندازِ نظر سے آپ دیکھیں تو یہ بات محض ناقابل قیاس نظر آتی ہے کہ عراق و ایران میں درس دینے والے صف اول کے مجتہد مولانا سید سبط حسین صاحب نجفی کا بیٹا اور ان کی گود میں پرورش پانے والا مصنف سید محمد باقر شمس، لکھنؤ کے کلچر کے تذکرہ کے دوران رقص و سرود کی محافل اور طوائف کی سرگرمیوں، آرٹ اور فنون لطیفہ کی ہمہ گیر مقبولیت کے پہلو پر بار بار زور دے، اور پھر مجال ہے کہ لکھنؤ

کی شاعری کے ضمن میں ثقافتِ لکھنؤ پر بحث کرتے ہوئے تقشف زدگی کا ذرا سا اشارہ بھی دے دے ۔ یہ شمس صاحب کی وسعتِ نظر ہی کا ثبوت نہیں ہے ، اس بزرگ مجتہد کی ذہنی ، تخیلی اور شعوری فضا کی بالیدگی اور توسیع خیالی کا مظاہرہ بھی ہے ، جنھوں نے عراق و ایران میں درس دینے کا قابل رشک اعزاز رکھنے کے باوجود اپنے لائق فرزند کی کھلے ذہنی ماحول میں تربیت کی ۔ لیکن کیا اس سے یہ منطقی نتیجہ نہیں نکلتا کہ عراق و ایران کی مشرقی تعلیم پختگی اور فکر و نظر کے بلوغ کا ذریعہ بنتی ہے

"تاریخ لکھنؤ" کے مصنف کے مطالعہ کا دائرہ بہت وسیع اور بہت ہی عمیق ہے ، جس کی مثالیں خال خال ملتی ہیں ۔ کوئی شبہ نہیں مغربی ملکوں اور ترقی یافتہ دنیا میں اس نوع کے علما اور مصنفین کی تعداد بہت زیادہ ہے ، جو اپنے آخری تجزیہ میں اس عظمت کا باعث بنی ہے ، جو آج ترقی یافتہ دنیا کو حاصل ہے ۔ سید محمد باقر شمس کو ایک دوسرا اعزاز یہ حاصل ہے کہ وہ حقیقت کے احترام کو جذبات اور میلانات پر فوقیت دینے کی انتہائی قابل قدر صلاحیت کے حامل ہیں ۔ ان کی کسی تحریر میں ملازدگی اور تنگ نظری کی پرچھائیں نہیں پڑتی ۔ حقائق کو ، جیسے کہ ہیں ، صاف بیان کردیتے ہیں ۔

ہرچند مجھے اپنے محترم مصنف کے بارے میں ابھی بہت کچھ لکھنا تھا ، لیکن وقت کی قلت ، جو میری مصروفیات کے دباؤ اور "تاریخ لکھنؤ" کی اشاعت کے بالکل آخری لمحہ ہونے کے باعث بہت کم ہے ، اس توقع (بلکہ یقین) کے ساتھ ان معروضات کو ختم کرتا ہوں کہ زیرِ نظر کتاب بھی ان کا ایک اسی طرح کا شاہکار ہوگی ، جس طرح ان کی دوسری تصنیفات ان کے یادگار کارناموں کی حیثیت رکھتی ہیں ۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی "ڈسکوری آف انڈیا" میں اودھ کا ذکر اچھی خاصی تفصیل سے کیا ہے ، لیکن حیرت ہے کہ انھوں نے لکھنؤ کی ثقافت کے تذکرہ

کو نظر انداز کر دیا، حالانکہ لکھنؤ کلچر کم از کم برصغیر کی تاریخ تہذیب میں سب سے زیادہ مرکزیت کا حامل تھا۔ الہ آباد کے لائق مصنف نے یہ حق ادا نہ کیا، لیکن لکھنؤ کے ایک علمی خانوادہ کے ایک قابل سپوت اور ایک فاضل اسکالر نے اس فرض کو ادا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، جس سے تحقیق اور مطالعہ کی نئی راہیں کھل جائیں گی۔ یقیناً شمس صاحب اس کامیابی پر علمی اور تہذیبی حلقہ کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں اور اس احترام کے حقدار ہیں، جو ایک حقیقی اسکالر کو دیا جانا چاہیے۔

شعور و شاعری

ڈاکٹر احسن فاروقی

"شعور و شاعری" میں فن شاعری کے ان اٹل، دائمی اور بنیادی اصولوں کے تحت مختلف قسم کی شاعری کو پرکھا گیا ہے، جن سے اختلاف تو ہو سکتا ہے، بغاوت بھی کی جا سکتی ہے، مگر جنھیں فراموش کر دینے سے شاعری کا اپنی راہ سے ہٹ کر برباد ہو جانا لازمی ہے۔" (اقتباس از مقدمہ "شعور و شاعری")

مولانا کی یہ بڑی خصوصیت ہے کہ ان کے مطالب اور بحثیں، ترتیب و دلنشیں تحریر شگفتہ اور زبان مستند اور معیاری ہوتی ہے۔ وہ ایک منفرد مفکر اور صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ میں علمی اور ادبی حیثیت سے ان سے استفادہ کرنے والوں میں اپنا شمار کر کے فخر محسوس کرتا ہوں۔ (اقتباس از مقدمہ "شعور و شاعری")

علی حامد

مولانا محمد باقر شمس کی تازہ تصنیف "شعور و شاعری" ابھی حال میں منظر عام پر آئی ہے۔ اس میں انیس، غالب، داغ، اقبال، جگر، اصغر، فیض، احسان دانش، میراجی اور جناب ماہر القادری کے کلام کی فنی غلطیاں پیش کر کے ان کی اصلاح کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں شعر و سخن کے متعلق بڑی مفید، دلچسپ اور باریک بحثیں کی گئیں ہیں، جو شعر گوئی اور سخن فہمی میں بہت مدد دے سکتی ہیں۔ مصنف نے اصلاح میں کمال دکھایا ہے۔ مثلاً فیض احمد فیض کا شعر ہے:

حسن مرہونِ جوشِ بادۂ ناز
عشق منت کشِ فسونِ نیاز

اس پر مصنف نے اس طرح اصلاح دی ہے:

حسن سرمست جوش بادۂ ناز
عشق سرگشتۂ فسون نیاز

اسی طرح

سوزش درد دل وہ کیا جانے
جس کو معلوم ہو نہ عشق کا راز

میں بھی "سوزش" کی جگہ لفظ "شدت" استعمال کر کے شمس صاحب نے شعر کو حقیقی مفہوم دیا ہے۔

اصغر کا شعر

بکھری ہوئی ہو زلف بھی اس چشم مست پر
ہلکا سا ابر بھی سرِ میخانہ دیکھیے

شمس صاحب کی اس اصلاح کے بعد کہیں سے کہیں پہنچ گیا:

بکھری ہوئی ہے زلف سیہ چشم مست پر
چھائی ہوئی گھٹا سرِ میخانہ دیکھیے

جگر کا شعر

حسن کو بے نقاب ہونا تھا
آپ اپنا جواب ہونا تھا

شمس صاحب کی اصلاح کے بعد:

حسن کو بے نقاب ہونا تھا
آپ اپنا حجاب ہونا تھا

احسان دانش کا شعر

میرے نغمات کے پردے میں چھپ کر بولنے والے!
تجھے میں اپنی دیوارِ تعین تک پکار آیا

شمس صاحب کی اصلاح کے بعد:

مرے نغمات کے پردے میں چھپ کر بولنے والے!
یہ بدبختی کہ سن کر بھی نہ مجھ کو اعتبار آیا

اقبال کا شعر

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

شمس صاحب کی اصلاح کے بعد:

نہیں زیبا ہے تجھ کو شاخِ گل پر آشیاں بندی
تو شاہیں ہے، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

داغ کا شعر

غش کھا کے داغ یار کے قدموں میں گر پڑا
بیہوش نے بھی کام کیا ہوشیار کا

شمس صاحب کی اصلاح کے بعد:

غش کھا کے داغ یار کی آغوش میں گرا
بیہوش نے بھی کام کیا ہوشیار کا

مندرجہ بالا اشعار اصلاح کے بعد نہ صرف دلکش و بامعنی ہو گئے ہیں، بلکہ ان کی فنی غلطیاں، زبان و بیان اور روز مرہ درست ہو جانے کے باعث اب ان کو اعلا درجہ کے اشعار کی صف میں رکھا جا سکتا ہے۔

ہم سخن فہم ہیں، غالب کے طرفدار نہیں، لہٰذا غالب کے شعر پر بھی شمس صاحب کی اصلاح ملاحظہ ہو:

غالب:

تماشا کر، اے محو آئینہ داری!
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

اصلاح کے بعد:

ادھر اک نظر، کہ تو آئینہ داری!
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

غرض یہ اور اس قسم کی دوسری تمام اصلاحیں مولانا کے کمال نکتہ رسی کو ظاہر کرتی ہیں۔ ڈاکٹر احسن صاحب فاروقی نے زیرِ بحث کتاب کو موجودہ دور کی ایک اہم تصنیف قرار دیا ہے، کیونکہ شمس صاحب نے محض اصلاحیں نہیں کی ہیں بلکہ فن شاعری پر بڑی علمی اور تحقیقی بحثیں بھی کی ہیں، لیکن ایک چیز پوری کتاب میں بہت نمایاں ہے اور وہ یہ ہے کہ ماہر القادری صاحب کو خاص طور پر نشانۂ تنقید بنایا ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں بھی ان پر لے دے کی ہے اور اس طرح کتاب کا ایک معتد بہ حصہ ان کی نذر ہو گیا ہے، جس پر ہم علمی حیثیت سے تو اعتراض نہیں کر سکتے، لیکن مولانا سے ان کی برہمی کا اندازہ ضرور کر سکتے ہیں۔ بہر حال یہ شمس صاحب کی بہت دلچسپ تصنیف ہے۔

حسین انجم

مولانا محمد باقر صاحب شمس خاندان اجتہاد (لکھنؤ) کی چند علمی یادگاروں میں سے ایک یادگار ہیں اور اس دور کے ویرانۂ علم و ادب میں

ہست فرد دفترِ احوال صاحب خانہ

کے مصداق

تو اہل دانش و فضلی ہمیں گناہت بس

کی مجسم تصویر ہیں۔ مبدائے فیاض سے ودیعت شدہ جوہر علم کا خراج اس گوہر شناس خذف سرفراز دور سے تنگیٔ معاش کی صورت میں وصول کرنے کے باوصف وہ جس انہماک سے پیرانہ سالی کے باوجود ادبی اور علمی کاموں میں مشغول و معروف ہیں، وہ بجائے خود ایک ایسا اہتم بالشان کام ہے کہ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

علامہ نیاز فتحپوری کے علمی و ادبی مجلہ " نگار " کے قدیم قلمکار ہونے کے علاوہ " لکھنؤ کی زبان " اور " تاریخِ لکھنؤ " ایسی نادر علمی کتابوں کے مصنف ہونے کی حیثیت سے دنیائے ادب میں ممتاز مقام کے مالک ہیں ۔ " تاریخِ لکھنؤ " شمس صاحب کی وہ معرکہ آرا کتاب ہے، جس کو بلاخوفِ تردید بلحاظِ کیفیت و کمیت مولانا شرر کی " مشرقی تمدن کا آخری نمونہ " کے بعد اس موضوع پر دوسری بڑی اور اہم کتاب قرار دیا جا سکتا ہے ۔

مولانا شمس کی علمی اور ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے ۔ متعدد علمی کتابوں اور مضامین کے علاوہ، جن میں زبان و بیان کے بیشمار موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے، انھوں نے اپنی خاندانی روایات کے مطابق مذہبی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے، لیکن ان کی تمام تحریروں میں نقد و اجتہاد وہ قدرِ مشترک ہے، جس نے ان کی نگارشات کو ادبِ عالیہ میں منفرد حیثیت عطا کی ہے، بلکہ ان کی تحریروں کو قارئینِ ادب کے لیے حد درجہ جاذبِ توجہ بنا کر حیاتِ دائم کی سند عطا کر دی ہے، بالخصوص نقدِ ادب کے باب میں ان کا قلم تلوار کی تیزی اور خنجر کی خونریزی کا حکم رکھتا ہے اور نقدِ شعر کے معاملہ میں یہ بیت ان پر صادق آتی ہے :

کسے نہ ماند کہ او را بہ تیغِ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

حال میں شمس صاحب کی ایک ادبی تصنیف " شعور و شاعری " شائع ہو کر پاکستان کے علمی اور ادبی حلقوں میں بشدت موضوعِ بحث بنی ہوئی ہے ۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس قحط الرجال میں ابھی چند ایسی ہستیاں باقی ہیں، جو اسلاف کے علم کی حافظ و محافظ ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاف کی بدعات پر حرف گیری اور احتساب کا حوصلہ بھی رکھتی ہیں ۔

نقدِ ادب کی تاریخ بھی اتنی قدیم ہے جتنی خود تاریخِ ادب، لیکن اردو زبان

میں اس فن شریف کو نیا رنگ و آہنگ دینے والوں میں نیاز فتحپوری مرحوم کا بڑا حصہ ہے۔ انھوں نے نگار میں اپنے عہد و عصر کے تقریباً تمام اکابر شعرا کے کلام کو تنقید کی کسوٹی پر خوب خوب پرکھا اور جانچا ہے۔ بعد میں انھوں نے ان تمام تنقیدی مضامین کو "مالہ و ماعلیہ" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کرا دیا تھا۔ یہ اپنے رنگ کی اردو میں پہلی تصنیف ہے، ورنہ جستہ جستہ مضامین نقد کا سراغ تو اکثر صاحبان قلم کے یہاں مل جاتا ہے۔ انشا و مصحفی، غالب و قتیل، چکبست و شرر وغیرہم کی ادبی معرکہ آرائیاں لفظی دبستان تنقید کا لافانی باب بن چکی ہیں۔ مولانا حالی کے مقدمہ اور شبلی نعمانی کے موازنہ سے لے کر اب تک متعدد و مستقل کتابیں بھی اس موضوع پر آچکی ہیں، لیکن جس دلجمعی کے ساتھ اس موضوع پر نیاز صاحب نے قلم اٹھایا ہے اور جس طرح ان کی تحریروں نے ایک بڑے طبقۂ شعرا کے کلام کے معائب و محاسن کا احاطہ کیا ہے، اس کی مثال شاید و باید "شعور و شاعری"، "مالہ و ماعلیہ" کے درجہ کی دوسری بڑی کتاب نقد ہے، جس میں انیس سے لے کر فیض تک دس اکابر شعرا کے کلام کو موضوع نقد بنایا گیا ہے۔ یہ مضامین بھی اول اول "نگار"، "عکس لطیف" اور "طلوع افکار" کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے تھے۔ اب ان کو ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے فاضلانہ مقدمہ اور تعلیقات و حواشی کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کر کے مولانا نے تشنگان ادب پر بڑا احسان فرمایا ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے مولانا کی ذات میں نقد و احتساب کا ملکہ بطور خاص ودیعت فرما دیا ہے۔ جو لوگ ان کی تصانیف کے توسط سے ان سے متعارف ہیں، وہ ان کی نکتہ رسی کے مداح و معترف ہیں۔ "شعور و شاعری" کی بزم نقد میں شایان دست و بازوئے قاتل کی فہرست میں شریک تقریباً تمام شعرا اپنے اپنے عہد و عصر میں مختلف ناقدین کا نشانۂ مشق بن چکے ہیں، لیکن شمس صاحب نے "موازنۂ انیس و دبیر" سے لے کر "مالہ و ماعلیہ" کے بعد تک جملہ سفر جس اختصارانہ چابکدستی سے طے کیا ہے، اس نے "شعور و شاعری" کے انداز

بیان کو بلاغت کی جان بنا دیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا بڑی وسیع المطالعہ شخصیت کے مالک ہیں۔ تاریخ، ادب اور مذہب کے مختلف موضوعات پر ان کی گہری نظر ہے۔ حافظہ قوی ہے اور تصنیف و تالیف سے طبیعت کو خاص میلان ہے۔ اس وقت ساٹھ کے پیٹے میں ہیں اور اضمحلال قویٰ کے باوصف بیشتر وقت علمی مشاغل میں صرف کرتے ہیں اور ذہنی طور پر ابھی جوانوں کی طرح چاق و چوبند ہیں۔ کورانہ تقلید کو بڑی حقارت سے دیکھتے ہیں۔ زندگی کے ہر مسئلہ کو اجتہادانہ غور و فکر اور نقد و نظر کا موضوع بنا کر پرکھنے کے قائل ہیں اور اس سارے عمل میں موضوع کے تقدس و عظمت سے قطعاً خائف نہیں ہوتے۔

"شعور و شاعری" میں انھوں نے انیس، داغ، اقبال، فانی، اصغر، جگر، ماہرالقادری، میراجی، احسان دانش اور فیض احمد فیض کے کلام کو نقد کی آگ پر پگھلایا اور احتساب کی کسوٹی پر کسا ہے۔ "شعور و شاعری کا" سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس کی کل بحث حد درجہ مختصر اور جامع ہونے کے باوجود نہایت مدلل اور دلنشیں ہے۔ تند و تیز جملوں کے باوجود عبارت کی شگفتگی میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا ہے۔ بعض جملے مضحک حد تک جسارت اور دریدہ دہنی معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کو ایسے محکم دلائل کی پشت پر سوار کرایا گیا ہے کہ ہلائے ہل نہیں سکتے۔ مشتے نمونہ از خروارے آپ بھی ملاحظہ کیجیے:۔

داغ کے کلام پر نقد کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"داغ کو تصرفِ الفاظ کا سلیقہ نہ تھا۔" اور مثال میں یہ شعر پیش کرتے ہیں:

غش کھا کے داغ یار کے قدموں میں گر پڑا
بیہوش نے بھی کام کیا ہوشیار کا

اور اس شعر پر اصلاح یوں دی ہے:

غش کھا کے داغ یار کی آغوش میں گرا
بیہوش نے بھی کام کیا ہوشیار کا

فانی کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

"آدمی طبیعت دار ہے، مگر ذوقِ سلیم اور شعورِ صحیح کی کمی ہے۔"

جگر مرادآبادی کے متعلق اس رائے کا اظہار کیا ہے:

"طبیعت شاعرانہ ہے۔ کبھی کبھی پھڑکتے ہوئے مصرعے بے اختیار نکل جاتے ہیں۔"

اصغر گونڈوی کے کلام کا تجزیہ کر کے یہ رائے دی ہے:

"ان کے یہاں مہملات کی اتنی بھرمار کی وجہ یہ ہے کہ ان کو صحیح مشورہ دینے والا کوئی نہ ملا۔ اس کے برخلاف نافہموں کی واہ واہ نے شاعر کو بگاڑ دیا۔"

لیکن ان مثالوں سے یہ رائے قائم کر لینا سراسر غلط ہوگا کہ "شعور و شاعری" طنز و تعریض کا دفتر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنے ان دعووں کے حق میں مولانا نے بڑے مضبوط و مستحکم دلائل پیش کیے ہیں اور مباحث کو تجزیاتی انداز میں لکھا ہے۔ یہ قطعاً ایک الگ بحث ہے کہ چونکہ شاعری خالص وجدانی چیز ہے، اس لیے زبان و عروض کے قاعدوں کی پابند ہونے کے باوجود اپنے اظہار کے پیرایوں کے لیے ہر آن نئے اسلوب اور قاعدے وضع کرتی رہتی ہے، یا یہ کہنا کہ اس کا معیار قبولِ خاطر و لطفِ سخن کو قرار دینا چاہیے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی نے مقدمہ میں اس کی افادیت سے بحث کرتے ہوئے بہت صحیح لکھا ہے:

"حقیقت کچھ بھی ہو "شعور و شاعری" میں فنِ شاعری کے ان اٹل، دائمی اور بنیادی اصولوں کے تحت مختلف قسم کی شاعری کو پرکھا گیا ہے، جن سے اختلاف تو ہو سکتا ہے۔ بغاوت بھی کی جا

سکتی ہے، مگر جنھیں فراموش کر دینے سے شاعری کا اپنی صحیح راہ سے
ہٹ کر برباد ہو جانا لازمی ہو جاتا ہے۔"
اس کتاب کو صرف اسی نقطۂ نظر سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔

(روزنامہ "جنگ"، کراچی)

تاثیر نقوی

اردو ادب میں رئیس التحریر جناب مولانا سید محمد باقر شمس لکھنوی کو ایک مسلّمہ حیثیت حاصل ہے۔ ان کی ہمہ گیر شخصیت ان کی مختلف موضوعات پر بلند پایہ تحریروں سے ظاہر ہے۔ وہ جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس میں ان کی خود اعتمادی اور وسعتِ فکر و نظر نمایاں ہوتی ہے۔ وہ مذہب، تاریخ اور شعر و ادب پر اتھارٹی سمجھے جاتے ہیں (مذہب پر میں نے یوں کہا کہ وہ آیۃ اللہ الکبرا مجتہد اعظم حضرت مولانا سید سبطِ حسین صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ کے جلیل القدر فرزند ہیں) تنقید میں تنقیص سے اجتناب کرتے ہیں۔ شعری ادب کی نزاکتیں، لطافتیں اور فنی محاسن کے ساتھ معائب، فنی اغلاط، لغزشیں اور معنوی اسقام کوئی شاعر ایسا نہیں جس کے کلام میں موجود نہ ہوں۔ محاسن سے شاعر کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہے، معائب سے کمی نہیں ہوتی، کیونکہ غلطی اور لغزش ہمیشہ غیر محسوس طور پر ہوتی ہے۔ عام طور پر آمد کے اشعار میں ایسی فنی و معنوی خامیوں کا امکان کم ہوتا ہے، لیکن بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ شاعر جذبات و احساسات کی گہرائیوں میں ڈوب کر شعر کہتا ہے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب! صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

جب ایسا ہوتا ہے تو اس میں شاعر کے شعور کا دخل نہیں ہوتا، لہٰذا فنی و معنوی لغزشوں کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ عیب سے پاک صرف اللہ و رسولؐ اور معصومینؑ کا

کلام ہے ۔ لہٰذا اس پر حیرت کی کوئی بات نہیں کہ مسلم الثبوت شعرا کے کلام میں لغزشوں کی نشاندہی کی جائے یا ان کے بعض اشعار کے معائب بیان کیے جائیں یا ان پر اصلاح کی جرأت کی جائے ۔ البتہ یہ کام ہر ایک کا نہیں ۔ ہر ایک قلم اٹھانے کا اہل نہیں ۔ یہ تو وہی کر سکتا ہے ، جو اس کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہو ، خود قادر الکلام ہو ، صرف و نحو اور عروض پر کامل قدرت رکھتا ہو ۔ "شعور و شاعری" کے مصنف جناب مولانا سید محمد باقر شمس لکھنوی بلاشبہ اس مقام و منزل پر ہیں کہ قلم اٹھا سکتے ہیں ، معائب کا اظہار کر سکتے ہیں اور اساتذہ کے اشعار پر اصلاح دے سکتے ہیں اور ایسی اصلاح ، جس کو بلاتامل قبول کیا جا سکتا ہے ۔ "شعور و شاعری" میں خدائے سخن انیس ، غالب ، اقبال ، فانی ، جگر ، اصغر ، ماہر القادری ، فیض احمد فیض ، احسان دانش وغیرہ کے اکثر اشعار پر قابل قدر بحثیں کی گئی ہیں اور بیشتر اشعار پر خوبصورت اصلاحوں سے وہ فنی و معنوی نقائص دور کیے گئے ہیں ، جن سے اشعار میں بلندی پیدا ہو گئی ہے اور مفاہیم شعری کا ابہام و نقص دور ہو گیا ہے ۔ اس موقع پر ہم "شعور و شاعری" سے صرف ایک اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کریں گے ۔

فانی بدایونی کے ایک مشہور شعر پر تنقید و اصلاح ملاحظہ ہو ۔ فرماتے ہیں :

"سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ ، میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

فانی کا یہ شعر کبھی کسی سے سنا تھا اور اسی وقت یہ رائے قائم کی تھی کہ آدمی طبیعت دار ہیں ، مگر ذوقِ سلیم اور شعورِ صحیح کی کمی ہے ۔ یہ رائے میں نے اس وجہ سے قائم کی تھی کہ شکوے کرنے اور سننے کے لیے دونوں کا یکجا ہونا ضروری ہے اور دن رات یکجا رہنے والا معشوق نہیں ، ہمزاد ہے ۔ شعر یوں ہونا چاہیے :

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے نالے
کفن سرکاؤ ، میری بے زبانی دیکھتے جاؤ "

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ صرف ایک لفظ کی تبدیلی سے شعر کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلاح اسی کو کہتے ہیں اور ایسی اصلاح وہی دے سکتا ہے، جو اس کا واقعی اہل ہو۔

"شعور و شاعری" اردو کے تنقیدی ادب میں ایک زندہ رہنے والی کتاب ہے اور اس کتاب کا اردو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کی لائبریری میں ہونا اور زیر مطالعہ رہنا ضروری ہے، لہٰذا ہم "عظیم" کے قارئین سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ پہلی فرصت میں اس بلند پایہ کتاب کو حاصل کریں۔ (رسالہ "عظیم")

رئیس امروہوی

مخدوم و محترم جناب محمد باقر شمس لکھنوی فنِ شعر کی روایات کے سلسلہ میں بڑی نازک اور دقیقہ رس طبیعت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس مجموعہ میں شعر کے محاسن و معائب پر بڑی نازک اور پرلطف بحثیں کی ہیں اور مشہور شعرا کے کلام پر اصلاحیں دی ہیں۔ "شعور و شاعری" کے دیباچہ میں ڈاکٹر احسن فاروقی نے لکھا ہے:

> "شعر کے ان اٹل، دائمی اور بنیادی اصولوں کے تحت مختلف قسم کی شاعری کو پرکھا گیا ہے، جن سے اختلاف تو ہو سکتا ہے، بغاوت بھی کی جا سکتی ہے، مگر انھیں فراموش کر دینے سے شاعری کا اپنی صحیح راہ سے ہٹ کر برباد ہو جانا لازمی ہو جاتا ہے۔"

شمس لکھنوی کی اصلاحاتِ سخن کا لطف اور معنویت کا اندازہ صرف کتاب کے مطالعہ سے ہی ممکن ہے۔

لکھنؤ کی تہذیب

راقم الحروف نے ۱۹۴۸ء میں عرض کیا تھا:

اودھ کا ذکر نہ کر ، لکھنؤ کا نام نہ لے
اسی دیار کو ہم لکھنؤ بنا دیں گے

لیکن یہ خیرہ چشمی تھی ۔ ۱۹۷۸ء کا کراچی نہ لکھنؤ بن سکتا ہے ، نہ دہلی ، نہ لاہور ۔ لکھنؤ کیا تھا ، یہ داستان حیرت بیان جناب محمد باقر شمس لکھنوی سے سنیے کہ چمن کی کہانی محرم اسرارِ چمن ہی بیان کر سکتا ہے ۔

شمس صاحب نے تاریخ کے موقلم سے لکھنؤ کی تہذیب کا دلکش مرقع تیار کیا ہے ۔ ہفت اقلیم میں اس شہر کے افسانے تھے ۔ ایک سو چون ابواب اور تین سو چار صفحات میں جناب شمس نے لکھنؤ کی جزئیات بیان کی ہیں ۔ آغازِ داستان ہوا ہے لکھنؤ کے جغرافیہ ، موسم ، پیداوار اور معاشرہ کے ذکر سے اور رفتہ رفتہ گفتگو شاہانِ اودھ اور بیگماتِ اودھ کی علمی دلچسپی ، تصانیف ، اہلِ کمال کی سرپرستی ، لکھنؤ اور علوم عقلیہ ، لکھنؤ اور فلسفہ ، ریاضیات ، ہیئت ، طب ، بیطاری ، مناظرہ ، علم الکلام ، فقہ (شیعہ ، سنی) ، مواعظ ، تصوف ، ادب ، شعر ، نعت ، موسیقی ، داستان سرائی ، ڈراموں ، اخبارات ، رسائل ، کتبخانوں ، مشاعروں وغیرہ کا احاطہ کرتی ہوئی لکھنؤ کی روز مرہ زندگی کے جزوی پہلوؤں تک آپہنچی ہے ۔ جناب محمد باقر شمس نے جس جامعیت اور ہمہ گیری کے ساتھ لکھنوی تہذیب کی عکاسی کی ہے ، کم سے کم میری نظر سے اس کی مثال نہیں گزری ۔ ہر فن کے بیان میں اتنی پیشہ ورانہ اصطلاحات جمع کر دی ہیں کہ صرف اس کتاب سے مصوری ، خطاطی ، زرگری ، حکاکی ، قلعی گری ، ملمع سازی رفو گری ، رنگریزی ، چھاپے ، زردوزی ، چکن دوزی ، عطر سازی ، گھکاری ،

شہسواری، چابکسواری، کوچوانی، فیلبانی، طباخی، چپاتی سازی، شیر مال، باقر خانی، دودھ کی روٹی، کاغذی ٹکیاں، تنکی روٹی، نانِ قطیری، نانِ برنجی، نانِ مغزی، بادام کی روٹی، پوریاں، پراٹھے۔ پلاؤ سازی وغیرہ کے بارے میں ایک مکمل لغت مرتب ہو سکتی ہے۔

مطالعہ کے بغیر آپ اس کتاب کی دلنواز نوعیت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ کاش جس خوبصورت قلم نے اس کتاب کی تدوین کی، اتنا ہی خوبصورت قلم اس کتاب کی کتابت بھی کرتا! جناب محمد باقر شمس کے شکریہ کے ساتھ ہم اس کتاب کی اشاعت پر ادارۂ دارالتصنیف کو بھی مستحقِ تبریک سمجھتے ہیں۔ (روزنامہ "جنگ" کراچی)

مدیر روزنامۂ "جسارت"

لکھنوی تہذیب و ادب کے نامور محقق اور بزرگ ادیب مولانا محمد باقر شمس کی دو کتابیں حال میں شائع ہوئی ہیں۔ ایک تو "لکھنؤ کی شاعری" ہے، جس میں لکھنؤ کی شاعری کی خصوصیات تفصیل سے بیان کی گئی ہیں اور ممتاز شعرا کے کلام پر تنقیدی بحث کی گئی ہے۔ مولانا شمس نے لکھنؤ کی شاعری پر مجموعی بحث کرتے ہوئے بتایا کہ لکھنؤ کا مخصوص تمدن کیا تھا اور وہاں کی شاعری میں اس کی عکاسی کس طرح ہوئی ہے۔ دوسری کتاب جاوید لکھنوی کے دیوان کا انتخاب ہے۔ جاوید لکھنوی لکھنؤ کے اہم شعرا میں سے تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۲۱ء میں ہوا تھا۔ ان کا کلام کبھی شائع نہیں ہوا۔ مولانا محمد باقر شمس کے پاس جاوید کا قلمی دیوان تھا۔ اسی کا یہ انتخاب ہے۔

لکھنؤ کی زبان

نیاز فتحپوری

لکھنؤ کی زبان کا جواب محال ہے ، لیکن اگر کوئی صاحب لکھنا چاہیں تو "نگار" کے صفحات حاضر ہیں ۔ ("رسالہ نگار")

مرزا جعفر علی خان اثر

"لکھنؤ کی زبان" کے مدلل اور پر مغز ہونے میں کوئی شک نہیں ۔ اکثر غلط فہمیاں آپ نے دور کر دیں اور معترضین کو دندان شکن جواب دیے ۔ میرا عقیدہ ہے کہ آپ کی تصنیف اسقام یا اغلاط سے قطعاً پاک ہے ۔ ("رسالہ قومی زبان")

پروفیسر فراق گورکھپوری

"لکھنؤ کی زبان" بہت تندہی اور تحقیق و تلاش سے لکھی ہے ۔ دلائل اور واقعات اور بہت سے حوالہ جات و اقتباسات سے یہ تصنیف مالامال ہے ۔

("رسالہ افکار")

پروفیسر شوکت سبزواری

لکھنؤ سے دو کتابیں ایسی شائع ہوئیں ہیں ، جن کا مثل نہیں ۔ ایک آرزو صاحب کی "نظام اردو" اور دوسری شمس صاحب کی "لکھنؤ کی زبان" ۔

("اخبار انجام")

پروفیسر حامد حسن قادری

جناب محمد باقر شمس کی تازہ تصنیف ("لکھنؤ کی زبان") میں نے بڑی دلچپی سے پڑھی اور اس سے بہت کچھ سیکھا ۔ زبان اور محاورہ کے متعلق ایسی پرلطف کتاب بڑے عرصہ کے بعد دیکھنے میں آئی ۔ اس کتاب میں تحقیق کا فائدہ بھی ہے ، تنقید کا مذاق بھی ، افسانوں کا لطف بھی اور لطیفوں کا مزہ بھی ..... اس لیے کتاب کے مطالعہ

میں شروع سے آخر تک دلچسپی قائم رہتی ہے۔ ("اخبارِ جنگ")

ماہر القادری

جناب محمد باقر شمس لکھنوی کی یہ پہلی تصنیف ہماری نظر سے گزری۔ موصوف زباندانی، وسعتِ معلومات اور انشا پردازی میں بعض مشاہیر، اہلِ قلم اور تنقید نگاروں سے کوسوں آگے ہیں۔ ان کے خیالات میں سلجھاؤ، بیان میں زور اور قلم میں شگفتگی ہے۔ دو نمونے:

"لفظوں کی اصلی ساخت کی بقا لہجہ پر منحصر ہے۔ لفظوں کی تصویر میں بولنے کی طاقت کہاں سے لاؤں، جو بتائے کہ لہجہ سے تلفظ کس طرح بدل جاتا ہے۔"

"کون شاہجہاں آباد، اطبا کا یونان، شعرا کا اصفہان، فقہا کا بغداد، محدثین کا بخارا، راجگانِ ہند کی حشمت کی یادگار، آلِ تیمور کی عظمت کا سرمایہ دار، ہندوستان کا دل، شاہجہاں کا بنایا ہوا ارم ......"

اس کتاب میں اس پر زور دیا گیا ہے، بلکہ مثالوں کے ذریعے ثابت کیا گیا ہے، کہ زبان کا ایک مرکز ہوتا ہے اور دلی اجڑنے کے بعد لکھنؤ اردو زبان کا مرکز بن گیا۔ اب:

"ہم کو چاہیے کہ حقائق سے چشم پوشی نہ کریں۔ لکھنؤ کی زبان کو ٹکسالی سمجھیں، اسے سیکھیں اور لکھنؤ والوں کے برابر ہو جائیں۔ پھر اسے ترقی دے کر اپنا ایک معیار الگ قائم کر دیں اور بجائے لکھنؤ کے، کراچی، لاہور، پشاور اور ڈھاکے کو مرکز بنا دیں۔" (صفحہ ۹)

فاضل مصنف نے دلی کے مقابلہ میں لکھنؤ کی زبان اور تہذیب و تمدن کی برتری ثابت کرنے میں پورا زورِ قلم صرف کیا ہے۔ وہ ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں کہ لکھنؤ زبان کا مرکز بن گیا تھا، جس کی تقلید دہلی والوں کو کرنی پڑی۔ انھوں نے ناسخ

لکھنؤ کے کارناموں کو ایک ایک کرکے گنایا ہے کہ ناسخ نے زبان کو کس کس عنوان سے سنوارا اور غزل کو ترقی دے کر کہاں سے کہاں پہنچادیا ۔ لکھنؤ کی زبان اور شاعری پر جو اعتراضات وارد کیے جاتے ہیں، شمس صاحب نے تفصیل سے ان کا جواب دیا ہے ۔ مثلاً لکھنوی شاعری اور اہل لکھنؤ کے لب و لہجہ پر نسائیت اور زنانہ پن کی پھبتی چست کی جاتی ہے ۔ اس کے جواب میں لائق مصنف نے یہ بتایا ہے کہ اہل لکھنؤ میں کس قدر سپاہیانہ اسپرٹ پائی جاتی تھی اور لکھنؤ نے فن سپہ گری میں کتنی ترقی کی تھی ۔۔۔ تو جہاں چھوٹے بچوں کو جھنجھنوں کی جگہ چھوٹے تیغ اور کاٹھ کی تلواریں کھیلنے کے لیے دی جاتی ہوں، وہاں کے لوگوں میں زنانہ پن کیسے آسکتا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ زبان کی نزاکت اور لوچ کو معترضین "نسائیت" سے تعبیر کرتے ہیں، جو غزل کا خاصہ ہے:

چاہیئے گا عامیوں کو بھی مہذب، نکتہ رس
واقفِ آدابِ مجلس، باخبر، باحس و مس
(صفحہ ۳۶)

صفی لکھنوی کے اس شعر میں "باحس و مس" کی غیر شاعرانہ اور نامانوس ترکیب دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی ۔ مصنف کو یہ شعر خود حذف کردینا چاہیے تھا ۔

"ہر باحواس اس کے جواب میں فوراً 'نہیں' کہے گا ۔" (صفحہ ۴۹)

"باحواس" کے مقابلہ میں "ہوشمند" موزوں تر لفظ تھا ۔

"اہل دہلی کی زبان پر ہمیشہ بھونڈی لفظیں، بھدی ترکیبیں چڑھی رہیں ۔" (صفحہ ۱۱۷)

یہ مبالغہ ہے ۔ چند کرخت لفظوں پر "ہمیشہ" کا اطلاق نہیں ہوسکتا ۔

"تمام دنیا میں محرم کے دس دن تعزیہ داری ہوتی ہے ۔" (صفحہ ۱۵۹)

ہم چار سال محرم میں خود مدینۂ منورہ میں موجود تھے اور وہاں کوئی علم اور تعزیہ نظر نہیں آیا ۔ پورے نجد و حجاز میں کہیں تعزیہ داری سننے میں نہیں آئی ۔

ناسخ کے متروکات اور مستعملات کی جو فہرست دی ہے، اس میں " جہاں تہاں " کو ناسخ نے حیرت ہے کہ متروک قرار دے دیا۔ حالانکہ ان لفظوں میں بلا کی نغمگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ ناسخ کی یہ متروک ترکیب (جہاں تہاں) آج افسانوی ادب میں استعمال کی جارہی ہے۔

لکھنؤ نے بلاشبہ زبان و ادب کو سنوار دیا ہے۔ لکھنؤ اسکول کی خدمات آفتاب و ماہتاب کی طرح روشن ہیں۔ مگر یہ مبالغہ ہے کہ اردو زبان کی مرکزیت سمٹ سمٹا کر تنہا لکھنؤ میں آگئی تھی۔ دہلی اور لکھنؤ (دونوں مقامات) زبان کے مرکز رہے ہیں۔

" لفظ " کی جمع " لفظیں " جہاں بھی کتاب میں آیا ہے۔ بس وجدان تلملا تلملا کر رہ گیا ہے۔ لکھنؤ والے بیشک " لفظیں " بولتے ہیں۔ مگر وجدان کہتا ہے کہ کاش وہ اس طرح نہ بولتے۔ (" رسالہ فاران ")

علامہ ابن حسن نجفی

" اگر ہم کوئی ایسی زبان بنالیں، جو ملک کی تمام زبانوں کا مجموعہ ہو تو کسی حصہ میں بھی وہ بولی اور سمجھی نہ جاسکے گی۔ زبان بنانے سے نہیں بنتی۔ وہ خود بخود بنتی رہتی ہے اور صدیوں میں ایک مستقل صورت اختیار کرتی ہے۔ حساس طبیعتوں نے مدت مدید میں، انتہائی دقتوں، کنج کاویوں، ژرف نگاہی، باریک بینی، کانٹ چھانٹ اور تراش خراش کے بعد اردو کو ایک جیتی جاگتی، چلتی پھرتی اور بڑھتی چڑھتی زبان کا رتبہ دیا ہے۔ اب یہی ہماری قومی اور ملکی زبان ہے۔ ہر قوم کو اپنی زبان سے جتنے تعلق ہوتے ہیں، وہ سب اس سے پیدا ہوچکے ہیں۔ یہی ملک کی دفتری اور تعلیمی زبان بن سکتی ہے، کیونکہ یہی ایک ایسی زبان ہے، جو ملک بھر میں کہیں کم، کہیں زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس کی صحت و سلامتی

محاسن و خصوصیات ، نیز مزید وسعت و اشتراک کی خاطر بطور سند کسی مقام کو لسانی مرکز قرار دینا ضروری ہے ۔ اودھ پنچ کے ایڈیٹر شیخ ممتاز حسین مرحوم کی کہاوت:

" زندہ زبانوں میں کوئی ایسی نہیں ، جس کا مرجع کوئی خاص قطعۂ زمین نہ ہو ۔ فارسی میں شیراز و طہران کی زبان مستند ہے ۔ انگریزی زبان لندن کی مستند ہے ۔ امریکا میں بھی انگریزی مروج ہے ، لیکن امریکا زبان کے اعتبار سے لندن کی خوشہ چینی کرتا رہتا ہے ۔ لہٰذا اردو کا بھی ایک مرکز ہونا چاہیے ۔"

ہاں ! اصول کا سوال خاصی اہمیت رکھتا ہے لیکن قدیم مرکزی ادبا نے یہ گتھی سلجھا دی ہے اور تاریخ ادب طے کر چکی ہے کہ دہلی اجڑی تو لکھنؤ آباد ہوا ۔ پرانا دارالضرب ٹوٹتے ہی نئے ٹکسال نے اپنا سکہ جما دیا اور اس خوبی سے کہ قدیم مرکز کے آخری حکمران حضرت غالب مرحوم کو بھی اعتراف کرنا پڑا:

" مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ والوں نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے ، ورنہ بولنے کو کون نہیں بول لیتا ، مگر میرے نزدیک تو وہ تراش خراش کی گنجائش ہی نہیں چھوڑ گیا ۔"

اردو کو " آب حیات " دینے والے بزرگ آزاد اعلی اللہ مقامہ فرماتے ہیں:

" شیخ صاحب (ناسخ) اور خوجہ حیدر علی

آتش کے کمال نے لکھنؤ کو دہلی کی قید پابندی سے
آزاد کرکے استقلال کی سند دے دی اور وہی مستند
ہوئی ۔ اب جو چاہیں ، سو کہیں ، ہم نہیں روک
سکتے ۔

المیزان کے ادیب (اور معیاری ادیب) سید نظیرالحسن
صاحب فوق رقمطراز ہیں :

لکھنؤ کو حسن شناسان سخن نے زبان کا مرکز
تسلیم کرلیا ہے ۔

لیکن اس کے باوجود یہ ماننا بہت مشکل ہے کہ ہماری اردو بھی
زعفران جیسی کوئی چیز ہو گی ، جس کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر فطرت
نے چند خاص علاقوں میں پابگل کر دیا ہے ۔ نہیں ! یہ زبان تو
قدرتی طور پر اتنی آزاد اور ایسی ملنسار ہے کہ کوئی ہو ، کسی کا علاقہ
ہو ، پہنچی اور پہنچی لکھنؤ کی زبان کو ٹکسالی سمجھیں ، اسے سیکھیں اور
لکھنؤ والوں کے برابر ہوجائیں اور پھر اسے ترقی دے کراپنا ایک
معیار الگ قائم کر دیں اور بجائے لکھنؤ کے ، کراچی ، لاہور ، پشاور
اور ڈھاکے کو مرکز بنا دیں ، جس کی تقلید لکھنؤ والوں کو کرنا پڑے
اور اس کے امکانات موجود ہیں کہ لکھنؤ میں زبان کو ترقی نہ ہو اور
ہم آگے بڑھ جائیں ... لیکن جب سیکھیں گے ہی نہیں تو بڑھنا کیسا ،
برابر بھی نہ ہونگے ۔ لکھنؤ میں زبان رہ جائے گی اور ہم بے زبان بن
جائیں گے ۔

یہ ہیں وہ کچی باتیں ، قیمتی خیالات اور بلند مقاصد ، جنھیں " لکھنؤ کی زبان "
کے قابل مصنف جناب محمد باقر صاحب شمس نے بڑے سلیقے سے قلمبند فرما کر ادبی
حلقوں کے لیے متاع فکر و نظر مہیا کیا ہے ۔ موضوع کے تعلق سے فلسفۂ لسانیات ،

اردو زبان کی ابتدائی سرگذشت ، دورِ عروج لکھنؤ اور اس کی خدمات ، ناسخ کے مساعی جمیلہ ... غرض اسی قسم کی کوئی دو سو عنادین ہیں ، جن پر شمس صاحب نے روشنی ڈالی ہے اور خوبی یہ ہے کہ ہر حد پر زبان کے ساتھ لکھنؤ کی تہذیب خراجِ عقیدت وصول کرتی ہے ۔

فی الواقع یہ پیشکش صرف ایک دلچسپ ادبی تاریخ ہی نہیں ، بلکہ ایک نہایت مفید ثقافتی تحریک بھی ہے ۔ امید کہ زبانوں کی ہست و بود اور اردو کی زندگی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ضرور مطالعہ فرمائیں گے ۔

مدیرِ اخبارِ " مسلمان "

دارالتصنیف کراچی نے حال میں یہ کتاب شائع کی ہے ۔ اس کے مصنف محمد باقر صاحب شمس ہیں ۔ میں نے یہ کتاب اور اس پر انشا پردازوں کے مشہور تبصرے بڑی دلچسپی سے پڑھے ۔ نیاز فتحپوری نے لکھا ہے کہ اس کا جواب محال ہے ۔ مرزا جعفر علی خاں اثر نے فرمایا ہے کہ یہ کتاب اسقام و اغلاط سے پاک ہے ۔ فراق گورکھپوری کی رائے ہے کہ کتاب تدبر اور تحقیق و تلاش سے لکھی گئی ہے اور دلائل و واقعات سے مالامال ہے ۔ حامد حسن صاحب قادری کا خیال ہے کہ بہت عرصہ کے بعد ایسی کتاب دیکھنے میں آئی ۔ مولانا عبدالمجید سالک نے لکھا ہے کہ یہ کتاب صاحبِ ذوق کو پڑھنا چاہیے ۔ ماہرالقادری نے فرمایا ہے کہ مصنف بعض مشاہیر ، اہلِ قلم اور تنقید نگاروں سے کوسوں آگے ہیں ۔ ان کے خیالات میں سلجھاؤ ، بیان میں زور اور قلم میں شگفتگی ہے ۔ رئیس امروہوی نے لکھا ہے کہ فاضل مصنف نے بڑے لسانی امور و ادبی سوجھ بوجھ اور شعور سے یہ کتاب لکھی ہے ۔ مولانا حامد علی خاں (مدیر " الحمرا ") نے اسے ہنگامہ خیز بتایا ہے ۔ اس سے غالباً کتاب کے اس حصہ کی طرف اشارہ ہے ، جس میں دہلی کی زبان اور شاعری اور تہذیب و تمدن پر سخت اعتراض کیے گئے ہیں اور بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی ایک عبارت پیش کرکے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ان کا املا درست ہے ، نہ انشا ... اور سیماب اکبرآبادی کی لسانی غلطیاں پیش کرکے

کہا گیا ہے کہ ان کے کلام کی خصوصیت یہی ہے ۔

کتاب کا موضوع یہ ہے کہ زبان میں اس طرح نامانوس لفظیں اور ترکیبیں داخل ہوتی ہیں، جن سے بہت جلد ایک کمزور زبان پیدا ہو جائے گی ۔ اس سلسلہ میں فاضل مصنف نے بڑی تحقیق اور تدقیق سے اس پر بحث کی ہے کہ زبان کیونکر پیدا ہوتی ہے، کس طرح ترقی کرتی ہے، اس پر کن کن جزوں کا اثر پڑتا ہے اور کس طرح بگڑتی ہے ۔ پھر یہ بتایا ہے کہ اردو کس طرح بنی اور کس طرح سنوری اور پروان چڑھی، کن باتوں کا اس نے اثر قبول کیا، اب سے پہلے اس کو کس طرح بگڑنے سے بچایا گیا اور اب کیونکر اس کو محفوظ رکھا جاسکتا ہے ۔ ان باتوں کو حسن کاوش سے مدلل طریقہ پر بیان کیا ہے ۔ اس کی داد نہ دینا انصاف سے دشمنی ہے اور جس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کتاب لکھی ہے، اس سے اتفاق نہ کرنا قومی زبان سے غداری ہے، اس لیے پرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ یہ کتاب ہر اس شخص کو پڑھنا چاہیے، جس کے دل میں اردو کا درد ہے، بلکہ اس پر عمل کی ضرورت ہے تاکہ زبان کو بگڑ نے سے محفوظ رکھا جائے ۔

مدیر اخبار " اسد "

اس اسم بامسمیٰ کتاب میں زبان کی ساخت و ساز، نشو و ارتقا کے ساتھ ساتھ تاریخ اور فلسفہ کی روشنی میں لکھنؤ کی زبان و شاعری پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے ۔ دہلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا موازنہ دونوں مقام کے شعرا و ادبا کی شخصیت اور ہر ایک کے کلام کے اعتبار سے کیا گیا ہے، جو صرف مبتدی کے لیے نہیں، بلکہ منتہی ادیب کے لیے بھی افادہ بخش ہے ۔

مدیر ہفت روزہ " معجزہ "

مولانا محمد باقر صاحب شمس کی تصنیف " لکھنؤ کی زبان "، جس میں مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ان کا نہ املا درست ہے، نہ انشا اور سیماب اکبر آبادی کی غلطیاں پیش کر کے زبان کے صحیح استعمال کی ضرورت اور اس

کے اصول بیان کیے گئے ہیں ، اور لکھنؤ کی زبان و شاعری ، تہذیب و تمدن کی بلندی اور اس کے مقابلہ میں دہلی کی زبان و شاعری اور تہذیب و تمدن کی پستی پر محققانہ بحث کی گئی ہے ۔ نیاز فتحپوری کا چیلنج ہے کہ اس کا جواب ممکن نہیں ۔

عبدالمجید سالک

اگرچہ اردو اب دہلی اور لکھنؤ کے مرکزوں سے نکل کر پورے برصغیر میں پھیل چکی ہے اور اس میں ملک کے مختلف حصوں کے اسالیبِ بیان (بلکہ محاورات تک) راہ پا گئے ہیں ، لیکن اس امر سے کوئی صاحبِ ذوقِ سلیم انکار نہیں کر سکتا کہ اردو سیکھنے کے لیے ہر حال میں ہمیں انھیں پرانے مرکزوں کے ثقات و اکابر کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے اور جو شخص ان سے کسبِ فیض کیے بغیر اردو کا شاعر یا نثار بننے کا دعویٰ کرتا ہے ، وہ غلطی پر ہے ۔ حضراتِ دہلی و لکھنؤ نے اردو کی تخلیق ، تہذیب اور تبلیغ میں جو شاندار خدمات انجام دی ہیں ، ان کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی ۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ دولتِ مغلیہ کے زوال کے آغاز ہی میں شرفائے دہلی کے بیشمار خاندان لکھنؤ میں منتقل ہو گئے تھے اور ابھی اردو پوری طرح منجھ کر صاف نہ ہوئی تھی کہ حضراتِ لکھنؤ نے اسے اپنی آغوشِ تربیت میں لے کر اس کی تحسین و تہذیب پر محنت شروع کر دی تھی ، خصوصاً ناسخ نے اردو شعر کی زبان درست کرنے میں جس حیرت انگیز سمجھ بوجھ اور وسعتِ نظر سے کام لیا ، اس کی کوئی مثال موجود نہیں اور آج تک دہلی ، لکھنؤ ، لاہور ، حیدرآباد دکن ، کراچی اور دیگر مقامات کے شعرا و ادبا ناسخ کی اصلاحات کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ جدید ماڈرن اردو کی بنیاد لکھنؤ میں ناسخ ہی نے رکھی ۔

جناب محمد باقر شمس لکھنوی نے " لکھنؤ کی زبان " کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے ، جس میں زبان اردو کے نشو و ارتقا کی تاریخ بیان کی ہے ، دہلی کی خدمات کا اعتراف کیا ہے ، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ دہلی کی زبان کے بعض قدیم اسالیب پر

تنقید بھی کی ہے ۔ لکھنؤ نے زبان اردو کے مختلف اصناف سخن اور اسالیب نثر کو معین کرنے اور ترقی دینے میں جو مستقل اور مسلسل کارنامے انجام دیے ہیں ، ان کا مدلل ذکر کیا ہے ، دہلی اور لکھنؤ کی بعض خصوصیات کا موازنہ کیا ہے ، لکھنؤ کے پاکیزہ تمدن ، اس کے باشندوں کی نفیس معاشرت اور ان کی شائستگی اظہار و بیان کو مثالیں دے دے کر دوسروں کے مقابلہ میں مرجح ثابت کیا ہے ۔ ناول ، نعت ، مزاحیہ نگاری ، مرثیہ گوئی ، مثنوی نگاری ، رباعی ، ریختی ، واسوخت وغیرہ میں لکھنؤ کو دہلی پر جو فوقیت حاصل ہے ، اس کو تفصیل سے لکھا ہے ۔ غرض دہلی کی زبان کے مقابلہ میں لکھنؤ کی زبان (بلکہ لکھنؤ کی ہر معاشرتی خصوصیت) کو قابل ترجیح بتایا ہے اور حضرات دہلی کے اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے ۔

اگرچہ زمانۂ حاضر کے انقلابات کے بعد دہلی اور لکھنؤ کے پرانے جھگڑے کو جاری رکھنا بالکل بے معنی سا ہو گیا ہے اور دہلی اور لکھنؤ (دونوں ہی) کم و بیش مہاجرین اور شرنارتھیوں کی یورش سے متاثر ہوئے ہیں ، جس سے ان کے قدیم معاشرے کی بنیادیں متزلزل ہو گئی ہیں ، خاص کر زبان بہت بری طرح متغیر ہو رہی ہے ۔۔۔ لیکن جہاں تک قدیم روایات کا تعلق ہے ، ہمیں ہدایت و رہنمائی کے لیے انھی مرکزوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ تقسیم ہند کے بعد دہلی کی شکل و صورت قطعاً بدل چکی ہے اور اب اس شہر کے پچھتر فیصدی باشندے وہ ہیں ، جن کی مادری زبان اردو نہیں تھی ۔ گو لکھنؤ میں ابھی کچھ پرانے آثار اور ثقات کے خاندان باقی ہیں ، لیکن وہ بھی عنقریب ہندی زبان کا شکار ہونے والے ہیں ۔

بہرکیف شمس صاحب کی کتاب زبان و ادب سے شغف رکھنے والوں کے لیے بیحد دلچسپ اور سبق آموز ہوگی اور انھیں معلوم ہوگا کہ اردو کی آرائش و زیبائش میں لکھنؤ والوں کا حصہ کتنا قابل قدر ہے ۔ رہا یہ امر کہ پاکستان کو لکھنؤ کی زبان اختیار کرنی چاہیے تو میرے نزدیک آجکل کے زمانہ میں اس قسم کی تحریک محض تکلف ہے ، کیونکہ اب وہ درباری اور جاگیرداری معاشرت باقی نہیں رہی ، جس کے زیر سایہ

زبان کے معیار قائم ہوتے تھے اور پھر ان معیاروں پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ جمہوریت نے وہ تمام پرانے نظام پلٹ کر رکھ دیے ہیں اور مختلف علاقوں کے باشندے اور ان کے لسانی تصورات اور ان کے محاورے آپس میں اس قدر گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ کسی "مارشل لا" سے بھی اس اختلاط پر پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اردو کے ادیبوں، انشاپردازوں اور شاعروں کے لیے اردو کے معیاری اور کلاسیکی مصنفین کی کتابیں پڑھنا اور زبان کے متعلق ان بزرگوں کے رکھ رکھاؤ اور اہتمام سے واقف ہونا اشد ضروری ہے تاکہ ہماری تصنیفی زبان بے معیار نہ ہونے پائے اور اگر بعض مقامی محاورات اور اسالیب اس میں دخل پا بھی جائیں تو خوش ذوق ادبا و شعرا انھیں خوش ذوقی سے زبان میں داخل کر سکیں۔

لکھنؤ نے حقیقت میں ہماری زبان کو زبان بنانے اور اسے دنیا کی معزز ترین زبانوں کی صف میں کھڑا کرنے کی شدید کوششیں کی ہیں۔ ان کوششوں کا علم حاصل کرنے کے لیے شمس صاحب کی کتاب اردو کے ہر صاحبِ ذوق کو پڑھنی چاہیے۔ ("رسالۂ الحمرا")

رئیس امروہوی

سید علی ضامن فائز ترمذی (جونپوری) نے روز نامۂ "سرفراز" میں زبان و اہلِ زبان کے متعلق ایک بحث کا آغاز کیا۔ بحث کیا تھی، ایک اچھا خاصا مناظرہ و مجادلہ تھا۔ اس مضمون میں سید صاحب نے لکھنؤ کے دبستانِ شعر پر جی کھول کر حملے کیے اور یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ لکھنؤ نے اردو زبان کی تہذیب و تطہیر میں کوئی قابلِ ذکر حصہ نہیں لیا۔ مضمون خاصا طویل تھا اور "سرفراز" کی کئی اشاعتوں میں اس کی اقساط چھپتی رہیں۔ جب فائز صاحب کے ترکش کے تمام تیر صرف ہو چکے تو بقول جناب محمد باقر شمس ("لکھنؤ کی زبان" کے مصنف)، "میری باری آئی"۔ شمس صاحب نے ان مضامین کے جوابات کا سلسلہ "سرفراز" کے صفحات پر شروع کیا تاآنکہ مستقل ایک کتاب مرتب ہو گئی، جس کا خلاصہ ماہنامۂ "نگار" (لکھنؤ) کی

تین قسطوں میں شائع ہوا اور اہل علم و خبر کے حلقوں میں خاصا مقبول ہوا ۔ مختصراً یہ ہے زیرِ تبصرہ کتاب کی سرگذشت ۔

کتاب کا موضوع ، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ، "لکھنؤ کی زبان" اور ان اہم ، دور رس اور بنیادی لسانی اصلاحات کا ذکر ہے ، جو لکھنؤ میں رو بہ عمل لائی گئیں ۔ فاضل مصنف نے بڑی لسانی سوجھ بوجھ اور ادبی بطور تاریخی شعور کے ساتھ زبان کی مرکزیت کے اصول پر بحث کی ہے ۔ عام لوگوں کو اس کا احساس نہیں کہ کسی زبان کے قیام و استحکام میں "مرکزیت" کا اصول کتنا اہم درجہ رکھتا ہے ۔ ہمیں بھارت سے بحث نہیں ، ذکر ہے پاکستان کا ۔ ظاہر ہے کہ علاقائی بولیوں کے تمام دعاوی کو تسلیم کرلینے کے باوجود پاکستان میں بین الصوبائی اور عمومی زبان (لنگوافرنیکا) کا درجہ لامحالہ اردو کو حاصل ہوگا ۔ بیشک مشرقی پاکستان کی حد تک بنگالی زبان "کوس لمن الملکی" بجا سکتی ہے ، لیکن جب بھی پوری مملکت کو سامنے رکھ کر اس مسئلہ پر غور کیا جائے گا ، اردو اپنی ضرورت منوا کر چھوڑے گی ۔ سوال یہ ہے کہ پاکستان میں اردو محاورہ اور روز مرہ کا کون سا معیار قابل قبول ہوگا ۔ مصنف نے زبانوں کی تہذیب و ترتیب کی کیفیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو کی عہد بعہد نشو و نما کی طرف جمالی اشارے کیے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے :

> "ہم کو چاہیے کہ حقائق سے چشم پوشی نہ کریں ۔ لکھنؤ کی زبان کو ٹکسالی سمجھیں ، اسے سیکھیں اور لکھنؤ والوں کے برابر ہو جائیں ۔ پھر اسے ترقی دے کر اپنا معیار الگ قائم کردیں اور بجائے لکھنؤ کے ، کراچی ، لاہور ، پشاور اور ڈھاکے کو مرکز بنا دیں ، جس کی تقلید لکھنؤ والوں کو کرنا پڑے اور اس کے امکانات موجود ہیں کہ لکھنؤ میں زبان کو ترقی نہ ہو اور ہم آگے بڑھ جائیں ۔"

مصنف کی کتاب کا یہ نقطۂ نظر بحد منصفانہ ہے ۔ اسی کے ساتھ انھوں نے پاکستان کے بہی خواہان اردو کو متنبہ کیا ہے :

- لیکن جب ہم سیکھیں گے ہی نہیں تو بڑھنا کیسا ، برابر ہی نہ ہوں گے ۔ لکھنؤ میں زبان رہ جائے گی اور ہم بے زبان رہ جائیں گے ۔"

ہمارے خیال میں مصنف کا یہ انتباہ مفید بھی ہے اور برمحل بھی ۔ اس تنبیہ کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟ اس لیے کہ پاکستان کے باشعور ، تعلیمیافتہ اور وسیع النظر حلقوں میں اردو کی لسانی اہمیت اور اس کی تہذیبی ضرورت کو تسلیم کیا جائے ۔ باوجود اب تک یہ احساس پیدا نہیں ہوسکا کہ پاکستان میں کون سی زبان کو ٹکسالی اور کس دبستان اردو کے روز مرہ کو معیاری تسلیم کیا جائے ۔ جب تک اردو محاورات اور روز مرہ کا کوئی متفقہ معیار قائم نہ کیا جائے گا ، پاکستان میں اس زبان کی متوازن اور ہم آہنگ ترقی دشوار (بلکہ نا ممکن) ہے ۔ یہ تو اصول غلط اور عملاً ناممکن ہے کہ پاکستان کے ہر علاقہ کے مقامی محاورات اور علاقائی روزمرہ کو بغیر کسی امتیاز کے اردو کا جزو بنا لیا جائے ۔ اس طرح سخت لسانی ابتری پیدا ہوجائے گی ۔ ہر زبان کی صحت اور فصاحت کی ایک ترازو ہوتی ہے اور جو زبان اس ترازو سے محروم ہے ، وہ کبھی ملکی اور قومی زبان نہیں بن سکتی ۔ کسی قوم کی زبان اور اس کے کلچر کے درمیان بڑے گہرے رشتے ہوتے ہیں ۔ زبان کسی قوم کی ثقافتی زندگی ، اس کی تہذیبی روایات ، اس کے تمدنی رجحانات اور اس کی معاشرتی خصوصیات کی آئینہ دار ہوتی ہے ۔ اگر کسی قوم کا صرف ادبی ذخیرہ ہمارے پیش نظر ہو تو معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اس کی فکری ، روحانی اور اجتماعی زندگی میں عہد بعہد کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں ۔ اردو بھی ہماری قوم کی اجتماعی اور ثقافتی زندگی کی آئینہ دار ہے ۔ ہماری ثقافت پچھلی چند صدیوں میں بڑا دور دراز سفر طے کرکے ہم تک پہنچی ہے ۔ سندھ ، ملتان ، شمالی ہند ، دکن ، الہ آباد ، دلی اور لکھنؤ اس سفر کی اہم اور قابل ذکر منزلیں ہیں ۔ بر کوچک پاک و ہند میں اسلامی تہذیب کا پہلا مرکز ، سندھ و ملتان کا علاقہ تھا ۔ سندھ و ملتان کے بعد غوریوں کے زمانہ میں یہ اعزاز لاہور کو نصیب ہوا ۔ جب

مسلمان فاتحین نے دلی فتح کرلی تو برصغیر میں اسلامی (اسلامی کے بجائے مسلم کہا جائے تو بہتر ہے) تہذیب و ثقافت کا مرکز یہی شہر قرار پایا ۔ دلی سے مسلمان لشکروں کے ساتھ ساتھ مسلم تہذیب و ثقافت کے قافلوں نے ایک طرف آسام و بنگال اور دوسری طرف معبر و ملیبار تک سفر کیا اور ہندوستان کے ہر گوشہ میں اپنی تہذیبی نو آبادیاں بسائیں ۔ اس سلسلہ میں بعض شہروں کی تہذیبی اہمیت آج بھی مسلم ہے اور ہمیشہ رہے گی ۔ مثلاً اکبر آباد ، دلی اور لکھنؤ ۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ، اردو اسی ترقی پذیر تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار و ترجمان ہے ۔ اردو کی ابتدائی نشوونما کہیں بھی ہوئی ہو ، یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ اس کی تہذیب و تطہیراور اصلاح و تدوین کے آخری مراحل لکھنؤ میں طے ہوئے ۔ شیخ ناسخ اور ان کی تلامذہ نے اس میدان میں جو کارنامے انجام دیے ہیں ، وہ تاریخ اردو میں یادگار اور بیمثل ہیں ۔ "لکھنؤ کی زبان" کے فاضل مصنف نے ان تمام حقائق کو بڑی خوبی اور عمدگی کے ساتھ اس کتاب میں پیش کیا ہے ۔ انھوں نے لکھنؤ کی تہذیبی اہمیت (اور کسی شہر کی تہذیبی اہمیت ہی اسے یہ اعزاز بخشتی ہے کہ وہاں کی زبان کو مستند و معیاری تسلیم کیا جائے) پر عجب دلکش انداز میں روشنی ڈالی ہے ۔ اس ضمن میں لکھنؤ کے آداب معاشرت ، ارباب کمال ، تہذیبی نفاست ، معاشرتی رسوم اور روز مرہ کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی گئیں ہیں اور اس سوسائٹی کی عکاسی کی گئی ہے ، جسے سلاطین اودھ کے حسن ذوق اور لطافت مزاج نے لکھنؤ کی سرزمین پر جنم دیا تھا ۔ لکھنوی تہذیب پر عموماً نسائیت ، تصنع ، غیر ضروری نزاکت اور زنانہ پن کی پھبتیاں چست کی جاتی ہیں ۔ اس کتاب کے مصنف نے متعدد حوالوں سے اس تہذیب کے مردانہ خد و خال ، سپاہیانہ کردار اور پسندیدہ پہلو پیش کیے ہیں ، جس کی پرورش لکھنؤ کی آغوش تربیت میں ہوئی اور جس نے اردو کی تعمیر نو کے اہم کارنامے انجام دیے ۔

کتاب کے مصنف جناب شمس لکھنوی نے نہایت حقیقت شناسی کے ساتھ

ناسخ کی عہد آفرین لسانی اصلاحات پر بحث و گفتگو کی ہے ۔ ناسخ کا نام اردو زبان و ادب کی دنیا میں ہمیشہ مینارۂ نور کی طرح چمکتا رہے گا ، کیونکہ یہ ناسخ ہی ہیں جنھوں نے اردو زبان کے چمن کو قدیم دکنی اثرات برج بھاشا کے نامانوس الفاظ اور فارسی کے نحوی قواعد کی خس و خاشاک سے پاک کرکے اسے نیا رنگ و روپ اور اردو کو مستقل زبان کی حیثیت بخشی ۔ اس موضوع پر شمس صاحب نے جو کچھ لکھا ہے ، وہ بار بار پڑھنے کی چیز ہے ۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر محسوس ہو رہا ہے کہ کتاب کا اجمالی تعارف ہی کافی طویل ہو گیا ہے ۔ اگر زیر نظر تصنیف کے تمام پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ، جیسا کہ جائزہ لینے کا حق ہے ، تو غالباً شیراز کے مجموعی صفحات اس مقصد کے لیے درکار ہوں گے :

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

بنا بریں مختصراً کتاب کے اہم مباحث کی تفصیل پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

لکھنؤ کی زبان کے دیباچہ میں مصنف نے زبان کی مرکزیت کے اصول پر بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ پاکستان میں صرف لکھنؤ کی زبان ہی کو معیار (اور ٹکسالی زبان) کے طور پر قبول کیا جاسکتا ہے ۔ دیباچہ کے بعد کتاب کے اصل ابواب شروع ہوتے ہیں ۔ پہلے باب میں لسانیات کے عام اور بنیادی فلسفہ اور زبان پر تہذیب و تمدن کے اثرات کو واضح کرنے کے بعد لکھنؤ کی تہذیبی مرکزیت پر گفتگو کی گئی ہے اور ان خدمات کو گنایا گیا ہے ، جو اس عظیم و جمیل شہر نے علم و ادب کے میدان میں انجام دی ہیں ۔ یہ باب در حقیقت لکھنؤ کی تہذیبی اور علمی سرگرمیوں کی ایک مختصر اور پسندیدہ روداد کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس ضمن میں مولانا سیماب اکبر آبادی اور ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب کی افسوسناک اغلاط کو گنایا گیا ہے ۔ دوسرا باب ایک پرانی (مگر دلچسپ) بحث سے شروع ہوتا ہے ، یعنی دلی اور لکھنؤ کی زبان (محاورات اور روز مرہ) کا فرق اور لکھنؤ کا لسانی امتیاز ، جس سے دلی محروم ہے ۔ اس

سلسلہ میں غالب اور مجروح کی اس یادگار خط و کتابت کے اقتباسات نقل کیے گئے ہیں، جو اسی مبحث سے تعلق رکھتے ہیں ۔ لکھنؤ کے لسانی امتیازات کے سلسلہ میں بجا طور پر ناسخ کے ان عظیم اور لافانی کارناموں کا (کسی قدر) تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے جو انھوں نے اردو کی تہذیب و اصلاح کے سلسلہ میں انجام دیے ۔ تیسرا باب دلی کے لیے وقف ہے ، یعنی دلی کی تباہی ، دلی سے اہل کمال کی ہجرت اور دلی کے باکمالوں کی لکھنؤ میں آمد ۔ چوتھا باب کتاب کا آخری باب اور اسی نسبت سے ساری کتاب کا نچوڑ ہے ۔ اس باب میں ان معترضین کی زباں بندی کی گئی ہے ، جنھیں لکھنؤ کی زبان اور وہاں کے اسلوبِ شعر سے للہیٰ بغض ہے ۔ یہاں مصنف مجبور تھا کہ لکھنؤ کی روایتی حریف (دلی) کی تہذیبی خامیوں اور شعری خرابیوں کی طرف واضح اشارے کرے ۔ مثلاً دلی کا سماجی انتشار ، دہلوی شاعری میں امرد پرستی کا رجحان ، دہلی کی تہذیبی جانکنی وغیرہ ۔ اس کے بعد مصنف نے بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ لکھنؤ کی تہذیبی اقدار اور اس معاشری پس منظر کو اجاگر کیا ہے ، جس نے لکھنؤ کی فصیح زبان اور اس کی رنگین شاعری کو جنم دیا ۔

کتاب کا خاتمہ ایک ضمیمہ پر ہوا ہے ۔ یہ ضمیمہ ان مضامین پر مشتمل ہے ، جو روزنامۂ " سرفراز " لکھنؤ میں تقریباً پندرہ سال قبل شائع ہوئے تھے ۔ اس ضمیمہ میں معترض کو جواب دیتے ہوئے لکھنؤ کی شعری خصوصیات پر دلچسپ روشنی ڈالی گئی ہے

یہ ہے لکھنؤ کی زبان کے مباحث کا خلاصہ ۔ اس کتاب کی ایک اور دلپذیر خصوصیت اس کے ضمنی مباحث ہیں ، جو لکھنوی تمدن و معاشرت کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ چونکہ اس کتاب میں وقت کے ایک اہم ترین لسانی مسئلہ سے بحث کی گئی ہے ، بنا بریں اس کا مطالعہ ہر اس شخص کے لیے ناگزیر ہے ، جو پاکستان کی قومی زبان کے مسئلہ سے دلچسپی رکھتا ہے ۔ ہم پاکستان کے اربابِ نظر سے درخواست کریں گے کہ وہ اس انتہائی اہم اور مفید کتاب کے مباحث پر سنجیدگی اور متانت سے غور کریں پاکستان میں معیاری اردو کے تعین کا مسئلہ کوئی جذباتی مسئلہ

نہیں ہے ، ایک اہم لسانی مسئلہ ہے ۔ اس مسئلہ کے مالہ اور ماعلیہ کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے ۔ اس غور و فکر کے سلسلہ میں یہ کتاب یقیناً مفید و معاون ثابت ہوگی ۔ (اخبار " شیراز ")

مدیر " الحمرا "

یہ دلچسپ ، پراز معلومات اور ہنگامہ خیز کتاب انھیں دنوں کراچی سے شائع ہوئی ہے ۔ اس کے فاضل مصنف محمد باقر صاحب شمس فی الواقع ایک وسیع النظر اہل زبان ہیں ۔ اہل زبان ہم اسی کو سمجھتے ہیں ، جو زباندان بھی ہو ۔ یہ کتاب نام کو تو صرف لکھنؤ کی زبان و شاعری پر تبصرہ ہے ، مگر اس سلسلہ میں تاریخ اردو کے متعلق بہت سی بیش قیمت معلومات اس میں جمع کردی گئی ہیں ۔ یہ سب جانتے ہیں کہ اردو دکن سے نکل کر دہلی پہنچی اور دہلی سے نکل کر لکھنؤ گئی ۔ علاوہ ازیں اور کہاں کہاں اس کی ابتدا ہوئی اور کہاں کہاں جاکر اس نے ترقی کی یا آئندہ کرے گی ، یہ ایک الگ داستان ہے ، جس کا موجودہ بحث سے کچھ تعلق نہیں ۔ حضرت شمس اردو کے لیے بہرحال ایک مرکز یا ایک معیار ضروری سمجھتے ہیں اور ان کی نظر میں بہترین معیار لکھنؤ کی زبان ہے ۔ لکھنؤ نے اردو زبان کی جو اصلاح کی (اور اب بھی کر رہا ہے) ، اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ، لیکن اہل پاکستان کے لیے آئندہ یہ بہت مشکل ہو جائے گا کہ وہ ایک دوسرے ملک کے تین شہروں میں سے کسی ایک کو (مثلاً لکھنؤ کو) اپنے لیے اصلاح زبان کا دائمی مرکز بنائے رکھیں ۔ ہاں ! دہلی و لکھنؤ کے اساتذہ کی قدیم بنیادی اور مسلمہ طور پر مستند تصانیف ضرور کم و بیش ایک دائمی معیار بنی رہیں گی ۔

زبان کو قائم رکھنے کے لیے ہمیں شمس صاحب کی آواز پر پوری توجہ کرنی چاہیے ۔ جن لوگوں کی مادری زبان اردو ہے ، انھیں جان بوجھ کر اپنی زبان بگاڑنی نہ چاہیے ، نہ انھیں کسی مصلحت سے اپنی زبان کو ترک کرکے کوئی دوسری زبان بولنی چاہیے ۔ یہ ایک بڑی قومی خدمت ہوگی ۔ " لکھنؤ کی زبان " واقعی پڑھنے کے قابل ہے ۔

اختتامیہ

ہو بہو دیدۂ بینا کو نظر آئے گی
شخصیت شمس کے تخداں کے اس آئینہ میں

میں نے اس کتاب کو ایک ایسا آئینہ بنانے کی کوشش کی ہے، جس میں مولانا کی شخصیت و فن کے خط و خال نمایاں نظر آئیں ۔ اس کے لیے جو سامان میں نے فراہم کیا ہے، وہ سب سے پہلے میرا مضمون ہے، جس میں ان کی شخصیت و فن کے ہر زاویے کو روشن کرنے کی سعی کی ہے ۔ اس کے بعد ان کے نو مضامین منتخب کر کے پیش کیے ہیں، جو موضوع کے لحاظ سے بھی مختلف ہیں اور طرزِ انشا کے اعتبار سے بھی ان کے مطالعہ سے ناظرین خود ان کے فن کو سمجھ سکیں گے ۔

اکابر کی آرا اور ان کی کتابوں پر کچھ تبصرے ہیں ۔ یہ بھی ان کے فن کو سمجھنے میں رہنمائی کریں گے ۔ اس آئینہ کے عکس کی دلآویزی کے متعلق قارئین کرام خود فیصلہ کریں گے ۔

السعی منی
والاتمام من اللہ

فقط
حسین انجم